اُردو لازمی
گیارھویں، بارھویں جماعتوں کے لیے
LIBRARY
بلوچستان ٹیکسٹ بُک بورڈ، کوئٹہ

اردو لازمی

(ترتیب نو)

گیارھویں، بارھویں جماعتوں کے لیے
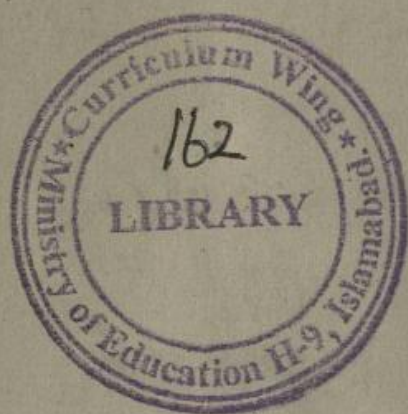
پبلشرز: نیشنل بک فاؤنڈیشن، کوئٹہ

برائے

بلوچستان ٹیکسٹ بک بورڈ، کوئٹہ

جملہ حقوق بحق بلوچستان ٹیکسٹ بک بورڈ کوئٹہ محفوظ ہیں

تیار کردہ : پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ لاہور۔

منظور کردہ : وفاقی وزارتِ تعلیم حکومتِ پاکستان اسلام آباد۔

بموجب مراسلہ نمبر 9-8/92 یو آر، مورخہ 29 نومبر 1993ء

مرتبین : ڈاکٹر عارفہ سیدہ زہرا
مسز نسیم حبیب صاحبزادہ
ڈاکٹر انور محمود خالد
ڈاکٹر علی محمد خاں
پروفیسر امجد اسلام امجد
نصیر احمد بھٹی۔

مدیران : ڈاکٹر عارفہ سیدہ زہرا
نصیر احمد بھٹی۔

نگرانِ طباعت : نصیر احمد بھٹی۔

پروسیسر، کمپوزرز : تعلیمی مرکز، اردو بازار لاہور۔

نگرانِ طباعت : مسز ذولیجہ بازئی

پرنٹر: یونائیٹڈ پرنٹرز، کوئٹہ فون: 822928

فہرست مندرجات

(حصہ نثر)

(حصہ نظم و غزلیات)

حصہ غزلیات

○☆○☆○☆○☆○☆○

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

زبان کیا ہے؟ اس کا عام فہم اور معمولی جواب تو یہ ہو سکتا ہے کہ زبان وہ وسیلہ ہے جس سے ہم ایک دوسرے کو جان سکتے ہیں' ایک دوسرے تک پہنچ سکتے ہیں۔ اس سے مراد کیا صرف روزمرہ کے کاروبار کے متعلق ایک دوسرے تک اطلاع پہنچا دینا ہے یا اپنے خیال' مشاہدے اور تجربے کے متعلق خبر پہنچانا ہے؟ بنیادی طور پر زبان کے دو ہی کام ہیں' ایک کاروباری وسیلہ اظہار اور دوسرا ادبی انداز بیان لیکن زبان جب قلم کی گرفت میں آجاتی ہے تب ہی اس کا وجود یقینی ہوتا ہے۔ اگر کوئی زبان تحریر کی زبان نہ بن سکے تو وہ ختم ہو جاتی ہے۔ یہاں ہم بولی اور زبان کا فرق متعین کر سکتے ہیں۔ زندگی کے بدلتے تجربوں' خیال کی ہر تازہ رو کے ساتھ ساتھ الفاظ کے معانی کے نئے نئے پرت کھلتے جاتے ہیں۔ زبانوں کی زندگی کا یہی راز ہے کہ وہ متحرک رہتی ہیں۔ اگر کوئی زبان ایک جگہ ٹھہر جائے تو زندگی اور اس کے رویے' وقت اور اس کے تقاضے اسے بھول کر آگے نکل جاتے ہیں۔

اردو ہماری قومی زبان ہے' ہماری تہذیبی زبان ہے۔ تحریک پاکستان کے اہم عوامل میں سے ایک ہے اور پھر یہ کہ ایک زندہ زبان ہے' تبدیلیوں کو اپنے اندر سمو لیتی ہے' ان سے جھجکتی نہیں' وقت کی ضرورتوں کے مطابق لب و لہجے اور الفاظ و معانی کے استعمال میں لچک رکھتی ہے۔ ان سب باتوں کی وجہ سے بھی ہمارے لیے اس زبان کا پڑھنا لازمی ہے لیکن اس سے بھی بڑھ کر اہم بات یہ ہے کہ یہ ہمارے رابطے کے تسلسل اور تجربے کی شراکت کا دوسرا نام ہے۔ اس زبان کا قلمی سرمایہ ہمارا مشترکہ سرمایہ ہے اور ہماری پہچان ہے۔ اس کتاب میں اردو زبان کے مزاج' ساخت اور وقت کے ساتھ ساتھ ہونے والی تبدیلیوں کو مدِنظر رکھ کر انتخاب کیا گیا ہے۔ عہد بہ عہد جس طرح زبان کی ترقی ہوتی گئی اور ہمارے لکھنے والوں نے ہمارے معاشی اور معاشرتی حالات کو جس طرح فکری ماحول میں شامل کیا اس کا شعور حاصل کرنا ہمارا مدعا

ہے۔

اس کتاب میں خود ادب کی تعلیم پیشِ نظر نہیں ہے بلکہ ادب کو زبان کی سمجھ اور زبان کے ارتقا کے مظہر کے طور پر منتخب کیا گیا ہے۔ ان تحریروں سے یہ گواہی ملتی ہے کہ زبان نے جہاں بدلتے حالات کی ترجمانی کی وہاں وہ ان حالات کی بدولت خود بھی الفاظ اور اسلوب کی تبدیلیوں سے دوچار ہوتی رہی۔ ہر عہد کا محاورہ اس عہد کے حالات سے متعین ہوتا ہے۔ زبان پڑھنے اور پڑھانے کے لیے ادب کو وسیلہ بنانے میں سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ دراصل جو خیال کارفرما ہوتا ہے اور جو فکر درپردہ موجود ہوتی ہے' وہ زبان کے لب و لہجے کو معانی کے پس منظر اور پھیلاؤ اور الفاظ کے استعمال کو اپنی گرفت میں رکھتی ہے۔ زبان کے طالب علم کے لیے مطالعہ کا زاویہ بالکل مختلف ہو جاتا ہے۔ وہ کسی تحریر کی ادبی حیثیت سے تو کسی صورت کنارہ کش نہیں ہوتا مگر خود زبان اس کے لیے اہم اور مرکزی ہو جاتی ہے۔

اردو کو لازمی مضمون کی حیثیت سے تعلیم دینے کے لیے ہمارے پیشِ نظر دلچسپی اور ذوق کا معاملہ بھی ہے۔ اس کتاب میں اردو کے نثری اور شعری ادب کا نمائندہ انتخاب کیا گیا ہے۔ یہ انتخاب تاریخی اعتبار سے اہم ہے کہ زبان کی تبدیلیوں کو اجاگر کرتا ہے اور یہ بھی پتا چلتا ہے کہ وقت کا ساتھ زبان نے کس طرح دیا۔ ہمارا طالب علم خود کو اجنبی محسوس نہیں کرے گا۔ اس لیے کہ یہاں زبان ہمارے فکری اور تہذیبی سرمائے کی ترجمانی کر رہی ہے۔ نئے اور پرانے لکھنے والوں کی تحریریں اسی تجربے اور احساس کی شراکت کی نمائندہ ہیں۔ زبان وہ واحد وسیلہ ہے جو اجنبیت اور بے گانگی کے فاصلے مٹا دیتا ہے۔ ہمیں ایک دوسرے کے قریب لانے اور صحیح طور پر سمجھنے کا ایک قوی اور مثبت ذریعہ ہے۔ ہماری توقع یہی ہے کہ یہ کتاب اردو زبان کے ان تمام تقاضوں کو ادا کر سکے گی جو پاکستانی ہونے کے ناتے ہماری ضرورت ہیں۔

مرتبین

○☆○☆○☆○☆○☆○

مولانا شبلی نعمانی

(۱۸۵۷ء۔ ۱۹۱۴ء)

اَخلاقِ نبویؐ

مُداوَمتِ عَمَل

اخلاق کا سب سے مقدم اور ضروری پہلو یہ ہے کہ انسان جس کام کو اختیار کرے اس پر اس قدر استقلال کے ساتھ قائم رہے کہ گویا وہ اس کی فطرت ثانیہ بن جائے، انسان کے سوا تمام دنیا کی مخلوقات صرف ایک ہی قسم کا کام کر سکتی ہے اور وہ فطرتاً اسی پر مجبور ہے لیکن اخلاق کا ایک دقیق نکتہ یہ ہے کہ انسان اپنے لیے اخلاق حسنہ کا جو پہلو پسند کرے اس کی شدت سے پابندی کرے اور اس طرح دائمی اور غیر متبدّل طریقے سے اس پر عمل کرے کہ گویا وہ اپنے اختیار کے باوجود اس کام کے کرنے پر مجبور ہے اور لوگ دیکھتے دیکھتے یہ یقین کر لیں کہ اس شخص سے اس کے علاوہ اور کوئی بات سرزد ہو ہی نہیں سکتی۔ گویا اس سے یہ افعال اس طرح صادر ہوتے ہیں جیسے آفتاب سے روشنی، درخت سے پھل اور پھول سے خوشبو، کہ یہ خصوصیات ان سے کسی حالت میں الگ نہیں ہو سکتیں۔ اسی کا نام استقامت حال اور مُداوَمتِ عَمَل ہے۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم اپنے تمام کاموں میں اسی اصول کی پابندی فرماتے تھے۔ جس کام کو جس طریقہ سے جس وقت آپؐ نے شروع فرمایا اس پر بڑی شدت کے ساتھ قائم رہتے تھے۔ سنّت کا لفظ ہماری شریعت میں اسی اصول سے پیدا ہوا ہے۔ سنّت وہ فعل ہے جس پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ مداومت فرمائی ہے اور بغیر کسی قوی مانع کے کبھی اس کو ترک نہیں فرمایا۔ اس بنا پر جس قدر سنن ہیں وہ در حقیقت آپ کی استقامتِ حال اور مداومتِ عمل کی ناقابلِ انکار مثالیں ہیں۔

حُسنِ خُلق

(حضرت علیؓ حضرت عائشہؓ، حضرت انسؓ، حضرت ہندؓ بن ابی ہالہ وغیرہ جو مدتوں آپ کی خدمت میں رہے تھے ان سب کا متفقا" بیان ہے کہ آپؐ نہایت نرم مزاج، خوش اخلاق اور نیک سیرت تھے۔ آپؐ کا چہرہ ہنستا تھا، وقار و متانت سے گفتگو فرماتے تھے، کسی کی خاطر شکنی نہیں کرتے تھے۔)

معمول یہ تھا کہ کسی سے ملنے کے وقت ہمیشہ پہلے خود سلام و مصافحہ فرماتے۔ کوئی شخص جھک کر آپؐ کے کان میں کچھ بات کہتا تو اس وقت تک اس کی طرف سے رخ نہ پھیرتے، جب تک وہ خود منہ نہ ہٹالے۔ مصافحہ میں بھی یہی معمول تھا۔ یعنی کسی سے ہاتھ ملاتے تو جب تک وہ خود نہ چھوڑ دے، اس کا ہاتھ نہ چھوڑتے۔ مجلس میں بیٹھتے تو آپ کے زانو کبھی ہم نشینوں سے آگے نکلے ہوئے نہ ہوتے۔ اکثر نوکر چاکر، لونڈی غلام، خدمت اقدسؐ میں پانی لے کر آتے کہ آپؐ اس میں ہاتھ ڈال دیں تاکہ متبرک ہو جائے۔ جاڑوں کا دن اور صبح کا وقت ہوتا، تاہم آپؐ کبھی انکار نہ فرماتے۔

مجالسِ صحبت میں لوگوں کی ناگوار باتوں کو برداشت فرماتے اور اس کا اظہار نہ کرتے۔ کسی شخص کی کوئی بات ناپسند آتی تو اکثر اس کے سامنے اس کا تذکرہ نہ فرماتے۔ ایک دفعہ ایک صاحب عرب کے دستور کے مطابق زعفران لگا کر خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؐ نے کچھ نہ فرمایا۔ جب وہ اٹھ کر چلے گئے تو لوگوں سے کہا کہ ان سے کہہ دینا کہ یہ رنگ دھو ڈالیں۔

مجلسِ نبویؐ میں جگہ بہت کم ہوتی تھی۔ جو لوگ پہلے سے آکر بیٹھ جاتے تھے ان کے بعد جگہ باقی نہیں رہتی تھی، ایسے موقع پر اگر کوئی آجاتا تو اس کے لیے آپؐ خود اپنی ردائے مبارک بچھا دیتے تھے۔ کسی کی کوئی بات بری معلوم ہوتی تو مجلس میں نام لے کر اس کا ذکر نہیں کرتے تھے بلکہ صیغہ تعمیم کے ساتھ فرماتے تھے کہ لوگ ایسا کرتے ہیں، لوگ ایسا کہتے ہیں، بعض لوگوں کی یہ عادت ہے۔ یہ طریقہ ابہام اس لیے فرماتے تھے کہ شخصِ مخصوص کی ذلت نہ ہو اور اس کے احساسِ غیرت میں کمی نہ

آجائے۔

ایثار

آپ کے اخلاق و عادات میں جو وصف سب سے زیادہ نمایاں اور جس کا اثر ہر موقع پر نظر آتا تھا وہ ایثار تھا۔ اولاد سے آپ ؐ کو بے انتہا محبت تھی اور ان میں حضرت فاطمہ زہرا ؓ اس قدر عزیز تھیں کہ جب آتیں تو فرطِ محبت سے کھڑے ہو جاتے' پیشانی کو بوسہ دیتے اور اپنی جگہ بٹھاتے۔ تاہم حضرت فاطمہ ؓ کی عُسرت اور تنگدستی کا یہ حال تھا کہ گھر میں کوئی خادمہ نہ تھی' خود چکّی پیستیں' خود ہی پانی کی مشک بھر لاتیں' چکی پیستے پیستے ہتھیلیاں گھس گئی تھیں اور مشک کے اثر سے سینہ پر نیل پڑ گئے تھے۔ ایک دن خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئیں' خود تو پاسِ حیا سے عرضِ حال نہ کر سکیں۔ جنابِ امیر ؓ نے ان کی طرف سے یہ حال عرض کیا اور درخواست کی کہ فلاں غزوہ میں جو کنیزیں آئی ہیں ان میں سے ایک کنیز مل جائے۔ آپ ؐ نے ارشاد فرمایا' ابھی اصحابِ صُفہ کا انتظام نہیں ہوا اور جب تک ان کا بندوبست نہ ہو لے میں اور طرف توجہ نہیں کر سکتا۔

تواضع

گھر کا کام کاج خود کرتے' کپڑوں میں پیوند لگاتے' گھر میں خود جھاڑو دیتے' دودھ دوہ لیتے' بازار سے سودا لاتے' جوتی پھٹ جاتی تو خود گانٹھ لیتے۔ گدھے کی سواری سے آپ ؐ کو عار نہ تھا۔ غلاموں اور مسکینوں کے ساتھ بیٹھتے اور ان کے ساتھ بیٹھنے اور ان کے ساتھ کھانا کھانے سے پرہیز نہ تھا۔ ایک دفعہ گھر سے باہر تشریف لائے۔ لوگ تعظیم کو اٹھ کھڑے ہوئے۔ فرمایا کہ اہلِ عجم کی طرح تعظیم کے لیے نہ اٹھو۔ غریب سے غریب بیمار ہوتا تو عیادت کو تشریف لے جاتے۔ مفلسوں اور فقیروں کے ہاں جا کر ان کے ساتھ بیٹھتے تو اس طرح بیٹھتے کہ امتیازی حیثیت کی بنا پر کوئی آپ ؐ کو پہچان نہ سکتا۔ کسی مجمع میں جاتے تو جہاں جگہ مل جاتی بیٹھ جاتے۔ ایک دفعہ ایک شخص ملنے آیا' لیکن نبوت کا رعب اس قدر طاری ہوا کہ کانپنے لگا۔ آپ ؐ نے فرمایا کہ گھبراؤ

نہیں میں بادشاہ نہیں ایک قریشی عورت کا بیٹا ہوں جو سوکھا گوشت پکا کر کھایا کرتی تھی۔

بچوں پر شفقت

بچوں پر نہایت شفقت فرماتے تھے۔ معمول تھا کہ سفر سے تشریف لاتے تو راہ میں جو بچے ملتے ان میں سے کسی کو اپنے ساتھ سواری پر آگے پیچھے بٹھاتے۔ راستے میں بچے ملتے تو ان کو خود سلام کرتے۔

ایک دن خالد بن سعید ؓ خدمتِ اقدس میں آئے۔ ان کی چھوٹی لڑکی بھی ساتھ تھی اور سرخ رنگ کا کُرتا بدن پر تھا۔ آپ نے فرمایا، سنہ سنہ۔ حبشی زبان میں حسنہ کو سنہ کہتے ہیں۔ چونکہ ان کی پیدائش حبش میں ہوئی تھی اس لیے آپ ؐ نے اس مناسبت سے حبشی تلفظ میں حسنہ کی بجائے سنہ کہا۔

یہ محبت اور شفقت مسلمان بچوں تک محدود نہ تھی بلکہ مشرکین کے بچوں پر بھی اسی طرح لطف فرماتے تھے۔ ایک دفعہ ایک غزوہ میں چند بچے جھپٹ میں آکر مارے گئے۔ آپ ؐ کو خبر ہوئی تو نہایت آزردہ ہوئے۔ ایک صاحب نے کہا: "یا رسول اللہ وہ مشرکین کے بچے تھے۔" آپ ؐ نے فرمایا: "مشرکین کے بچے بھی تم سے بہتر ہیں، خبردار! بچوں کو قتل نہ کرو، ہر جان خدا ہی کی فطرت پر پیدا ہوتی ہے۔"

معمول تھا کہ جب فصل کا نیا میوہ کوئی خدمتِ اقدس میں پیش کرتا تو حاضرین میں جو سب سے زیادہ کم عمر بچہ ہوتا اس کو عنایت فرماتے۔ بچوں کو چومتے اور ان کو پیار کرتے تھے۔ ایک دفعہ آپ ؐ اسی طرح بچوں کو پیار کر رہے تھے کہ ایک بدوی آیا، اس نے کہا: "تم لوگ بچوں کو پیار کرتے ہو، میرے دس بچے ہیں مگر اب تک میں نے کسی کو پیار نہیں کیا"۔ آپ ؐ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ اگر تمھارے دل سے محبت کو چھین لے تو میں کیا کروں؟"

حضرت عائشہ ؓ کم سنی میں بیاہ کر آئی تھیں، محلہ کی لڑکیوں کے ساتھ وہ کھیلا کرتی تھیں۔ آپ ؐ جب گھر میں تشریف لاتے تو لڑکیاں آپ ؐ کا لحاظ کر کے ادھر ادھر چھپ جاتیں، آپ ؐ انھیں تسکین دیتے اور کھیلنے کو کہتے۔

لُطفِ طبع

کبھی کبھی ظرافت کی باتیں فرماتے۔ ایک دفعہ حضرت انسؓ کو پکارا تو فرمایا: "او دو کان والے۔" اس میں ایک نکتہ یہ بھی تھا کہ حضرت انسؓ نہایت اطاعت شعار تھے اور ہر وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پر کان لگائے رکھتے تھے۔ حضرت انسؓ کے چھوٹے بھائی کا نام ابو عمر تھا وہ کم سن تھے اور ایک ممولا پال رکھا تھا کہ اتفاق سے وہ مر گیا۔ ابو عمر کو بہت رنج ہوا۔ آپؐ نے ان کو غمزدہ دیکھا تو فرمایا: "ابو عمر! تمھارے ممولے نے یہ کیا کیا۔"

ایک شخص نے خدمتِ اقدسؐ میں آکر عرض کی کہ مجھ کو کوئی سواری عنایت ہو۔ ارشاد ہوا کہ میں تم کو اونٹنی کا بچہ دوں گا، انھوں نے کہا، یا رسول اللہ! میں اونٹنی کا بچہ لے کر کیا کروں گا؟ آپؐ نے فرمایا کہ کوئی اونٹ ایسا بھی ہوتا ہے جو اونٹنی کا بچہ نہ ہو؟

ایک بُڑھیا خدمتِ اقدس میں آئی کہ حضورؐ میرے لیے دعا فرمائیں کہ مجھ کو بہشت نصیب ہو، آپؐ نے فرمایا کہ بوڑھیاں بہشت میں نہ جائیں گی۔ اس کو بہت صدمہ ہوا اور روتی ہوئی واپس چلی۔ آپ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ اسے کہ دو کہ بوڑھیاں جنت میں جائیں گی لیکن جوان ہو کر جائیں گی۔

ایک بدوی صحابی تھے جن کا نام زاہرؓ تھا۔ وہ دیہات کی چیزیں آپؐ کی خدمت میں ہدیہ بھیجا کرتے تھے۔ ایک دفعہ وہ شہر میں آئے، گاؤں سے جو چیزیں لائے تھے ان کو بازار میں فروخت کر رہے تھے۔ اتفاقاً آپؐ ادھر سے گزرے، زاہرؓ کے پیچھے جا کر ان کو گود میں دبا لیا۔ انھوں نے کہا: "کون ہے؟ چھوڑ دو۔" مڑ کر دیکھا تو سرورِ عالمؐ تھے۔ اپنی پیٹھ اور بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ سے لپٹا دی۔ آپؐ نے فرمایا: "کوئی اس غلام کو خریدتا ہے؟" بولے کہ یا رسول اللہ! مجھ جیسے غلام کو جو شخص خریدے گا نقصان اٹھائے گا۔ آپؐ نے فرمایا "لیکن خدا کے نزدیک تمھارے دام زیادہ ہیں۔"

ایک شخص نے آکر شکایت کی کہ میرے بھائی کے شکم میں گرانی ہے۔ فرمایا: "شہد پلاؤ۔" وہ دوبارہ آئے کہ شہد پلایا لیکن شکایت اب بھی باقی ہے۔ آپ ؐ نے پھر شہد پلانے کی ہدایت کی۔ سہ بارہ آئے پھر وہی جواب ملا۔ چوتھی بار آئے تو فرمایا: "خدا سچا ہے (کہ شہد میں شفا ہے) لیکن تمھارے بھائی کا پیٹ جھوٹا ہے۔ جاکر شہد پلاؤ۔" اب کی بار پلایا تو شفا ہو گئی۔ معدہ میں مادہ فاسد کثرت سے موجود تھا جب پورا تنقیہ ہو گیا تو گرانی جاتی رہی۔

اولاد سے مُحبّت

اولاد سے نہایت محبت تھی۔ معمول تھا کہ جب کبھی سفر فرماتے تو سب سے آخر میں حضرت فاطمہ ؓ کے پاس جاتے اور سفر سے واپس آتے تو جو شخص سب سے پہلے باریابِ خدمت ہوتا وہ بھی حضرت فاطمہ ؓ ہی ہوتیں۔ ایک دفعہ کسی غزوہ میں گئے، اسی اثناء میں حضرت فاطمہ ؓ نے دونوں صاجزادوں (حسنین ؓ) کے لیے چاندی کے کنگن بنوائے اور دروازے پر پردے لٹکائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لائے تو خلافِ معمول حضرت فاطمہ ؓ کے گھر نہیں گئے۔ وہ سمجھ گئیں، فوراً پردوں کو چاک کر ڈالا اور صاجزادوں کے ہاتھ سے کنگن اتار لیے۔ صاجزادے روتے ہوئے خدمت اقدس ؐ میں حاضر ہوئے۔ آپ ؐ نے کنگن لے کر بازار میں بھیج دیے کہ ان کے بدلے ہاتھی دانت کے کنگن لا دو۔

حضرت فاطمہ ؓ جب آپ کی خدمت میں تشریف لاتیں تو آپ ؐ کھڑے ہو جاتے، ان کی پیشانی کو چومتے اور اپنی نشست گاہ سے ہٹ کر اپنی جگہ بٹھاتے۔ حسنین ؓ سے بے انتہا مُحبّت تھی، فرماتے تھے کہ میرے گلدستے ہیں۔ حضرت فاطمہ ؓ کے گھر تشریف لے جاتے تو فرماتے کہ میرے بچوں کو لانا۔ وہ صاجزادوں کو لاتیں، آپ ؐ ان کو چومتے اور سینہ سے لپٹاتے۔ ایک دفعہ مسجد میں خطبہ فرما رہے تھے، اتفاق سے حسنین ؓ سرخ کپڑے پہنے ہوئے آئے، کم سنی کی وجہ سے ہر قدم پر لڑکھڑاتے جاتے تھے، آپ ؐ ضبط نہ کر سکے۔ منبر سے اتر کر گود میں اٹھا لیا اور اپنے سامنے بٹھا لیا۔ پھر فرمایا خدا

نے سچ کہا ہے: اِنَّمَآ اَمۡوَالُکُمۡ وَ اَوۡلَادُکُمۡ فِتۡنَۃٌ[1]۔ فرمایا کرتے تھے، حسینؓ میرا ہے اور میں اس کا ہوں۔ خدا اس سے محبت رکھے جو حسینؓ سے محبت رکھتا ہے۔ ایک دفعہ امام حسنؓ یا امام حسینؓ دوش مبارک پر سوار تھے۔ کسی نے کہا: "کیا سواری ہاتھ آئی ہے۔" آپ نے فرمایا: "سوار بھی کیسا ہے؟" ایک دفعہ آپؐ کہیں دعوت میں جارہے تھے، امام حسینؓ راہ میں کھیل رہے تھے، آپؐ نے آگے بڑھ کر ہاتھ پھیلائے۔ وہ ہنستے ہوئے پاس آ آکر نکل جاتے تھے۔ بالآخر آپؐ نے ان کو پکڑ لیا۔ ایک ہاتھ ان کی ٹھوڑی پر اور ایک سر پر رکھ کر سینہ سے لپٹا لیا، پھر فرمایا: "حسینؓ میرا ہے، میں اس کا ہوں۔" اکثر امام حسینؓ کو گود میں لیتے اور ان کے منہ میں منہ ڈالتے اور فرماتے کہ خدایا میں اس کو چاہتا ہوں اور اس کو بھی چاہتا ہوں جو اس کو چاہے۔

آپ کے داماد، حضرت زینبؓ کے شوہر، جب بدر سے قید ہو کر آئے تو فدیہ کی رقم ادا نہ کر سکے تو گھر کہلا بھیجا۔ حضرت زینبؓ نے اپنے گلے کا ہار بھیج دیا۔ یہ وہ ہار تھا کہ حضرت زینبؓ کے جہیز میں حضرت خدیجہؓ نے ان کو دیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہار دیکھا تو بے تاب ہو گئے اور آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ پھر صحابہؓ سے فرمایا کہ اگر تمھاری مرضی ہو تو ہار زینبؓ کو بھیج دوں۔ سب نے بسروچشم منظور کیا۔

آپ کی ایک نواسی حالتِ نزع میں تھیں، صاحبزادی نے بلا بھیجا، آپؐ تشریف لے گئے، تو لڑکی اسی حالت میں آغوش مبارک میں رکھ دی گئی۔ آپؐ نے اس کی حالت دیکھی تو آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ حضرت سعدؓ نے کہا: "یا رسول اللہ! آپؐ یہ کیا کر رہے ہیں؟" آپ نے فرمایا: "یہ رحم ہے جس کو خدا نے اپنے بندوں کے دلوں میں ڈال دیا ہے۔" حضرت ابراہیمؓ کی وفات میں بھی آپؐ نے آبدیدہ ہو کر فرمایا تھا: "آنکھیں آنسو بہا رہی ہیں، دل غم زدہ ہو رہا ہے، لیکن منہ سے ہم وہی باتیں کہیں گے جس کو خدا پسند کرتا ہے۔"

(سیرۃ النبی۔ جلد دوم)

---

[1] تمھارے مال اور تمھاری اولاد آزمائش ہے۔

سوالات

۱۔ مُداوَمَتِ عمل سے کیا مراد ہے؟

۲۔ رسولِ اکرمؐ بچوں پر نہایت شفقت فرماتے اور اولاد سے بے انتہا محبت کرتے۔ اس حوالے سے مختلف روایتوں کا خلاصہ لکھیے۔

۳۔ "اللہ تعالیٰ اگر تمہارے دل سے محبت کو چھین لے تو میں کیا کروں؟" آپؐ نے یہ الفاظ کس موقع پر ارشاد فرمائے؟ رسولِ اکرمؐ کو حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ سے کس قدر محبت تھی؟

۴۔ جملے مکمل کیجیے:

(الف) انسان جس کام کو اختیار کرے اس پر اس قدَر استقلال کے ساتھ قائم رہے کہ وہ اس کی ---------- بن جائے۔

(ب) گویا اس سے یہ افعال اس طرح صادر ہوتے ہیں جیسے آفتاب سے ---------- درخت سے ---------- اور پھول سے ----------

(ج) غریب سے غریب بیمار ہوتا تو ---------- کو تشریف لے جاتے۔

(د) ہر جان خدا ہی کی ---------- پر پیدا ہوتی ہے۔

(ہ) خدا کے نزدیک تمہارے ---------- زیادہ ہیں۔

(و) صاحبزادوں کے ہاتھ سے ---------- اتار لیے۔

(ز) حسنینؓ سے بے انتہا محبت تھی، فرماتے تھے کہ میرے ---------- ہیں۔

(ح) سب نے بسرو چشم ---------- کیا۔

۵۔ مندرجہ ذیل عبارات کی سیاق و سباق کے حوالے سے تشریح کیجیے۔

(الف) اخلاق کا سب سے مقدم ---------- مداومتِ عمل ہے۔

(ب) یہ محبت اور شفقت ---------- تو میں کیا کروں؟"

۶۔ "سیرتِ طیبہؐ رشد و ہدایت کا سرچشمہ ہے"۔ سبق "اخلاقِ نبویؐ" کی روشنی میں اس موضوع پر ایک جامع مضمون لکھیے۔

○☆○☆○☆○☆○☆○

سرسید احمد خاں

(۱۸۱۷ء-۱۸۹۸ء)

خوشامد

دل کی جس قدر بیماریاں ہیں ان میں سب سے زیادہ مہلک خوشامد کا اچھا لگنا ہے۔ جس وقت کہ انسان کے بدن میں ایسا مادہ پیدا ہو جاتا ہے جو وبائی ہوا کے اثر کو جلد قبول کر لیتا ہے تو اسی وقت انسان مرضِ مہلک میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جبکہ خوشامد کے اچھا لگنے کی بیماری انسان کو لگ جاتی ہے تو اس کے دل میں ایسا مادہ پیدا ہو جاتا ہے جو ہمیشہ زہریلی باتوں کے زہر کو چوس لینے کی خواہش رکھتا ہے۔ جس طرح کہ خوش گلو گانے والے کا راگ اور خوش آیند باجے کی آواز انسان کے دل کو نرم کر دیتی ہے۔ اسی طرح خوشامد بھی انسان کے دل کو ایسا پگھلا دیتی ہے کہ ہر ایک کانٹے کے چبھنے کی جگہ اس میں ہو جاتی ہے۔

اول اول یہ ہوتا ہے کہ ہم آپ اپنی خوشامد کرتے ہیں اور اپنی ہر ایک چیز کو اچھا سمجھتے ہیں اور آپ ہی آپ اپنی خوشامد کر کر اپنے دل کو خوش کرتے ہیں۔ پھر رفتہ رفتہ اوروں کی خوشامد ہم میں اثر کرنے لگتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اول تو خود ہم کو اپنی محبت پیدا ہوتی ہے، پھر یہی محبت ہم سے باغی ہو جاتی ہے اور ہمارے بیرونی دشمنوں سے جا ملتی ہے اور جو محبت و مہربانی ہم خود اپنے ساتھ کرتے ہیں وہ ہم خوشامدیوں کے ساتھ کرنے لگتے ہیں اور وہی ہماری محبت کو یہ بتلاتی ہے کہ ان خوشامدیوں پر مہربانی کرنا نہایت حق اور انصاف ہے۔ جو ہماری باتوں کو ایسا سمجھتے ہیں اور ان کی اس قدر قدر کرتے ہیں۔ جبکہ ہمارا دل ایسا نرم ہو جاتا ہے اور اس قسم کے پھسلاوے اور فریب میں آجاتا ہے تو ہماری عقل خوشامدیوں کے مکر و فریب سے اندھی ہو جاتی ہے اور وہ مکر و فریب ہماری طبیعت پر غالب آجاتا ہے۔

لیکن اگر ہر شخص کو یہ معلوم ہو جاوے کہ 'خوشامد' کا شوق کیسے نالائق اور کمینہ سببوں سے پیدا ہوتا ہے تو یقینی خوشامد کی خواہش کرنے والا شخص بھی ویسا ہی نالائق

اور کمینہ متصور ہونے لگے گا۔ جبکہ ہم کو کسی ایسے وصف کا شوق پیدا ہوتا ہے جو ہم میں نہیں ہے۔ یا ہم ایسے بننا چاہتے ہیں جیسے کہ در حقیقت ہم نہیں ہیں۔ تب ہم اپنے تیئں خوشامدیوں کے حوالے کرتے ہیں جو اوروں کے اوصاف اور اوروں کی خوبیاں ہم میں لگانے لگتے ہیں۔ گو بہ سبب اس کمینہ شوق کے اس خوشامدی کی باتیں ہم کو اچھی لگتی ہیں مگر در حقیقت وہ ہم کو ایسی ہی بدزیب ہیں جیسے کہ دوسروں کے کپڑے جو ہمارے بدن پر کسی طرح ٹھیک نہیں۔ اس بات سے کہ ہم اپنی حقیقت کو چھوڑ کر دوسروں کے اوصاف اپنے میں سمجھنے لگیں۔ یہ بات نہایت عمدہ ہے کہ ہم خود اپنی حقیقت کو درست کریں اور سچ مچ وہ اوصاف خود اپنے میں پیدا کریں اور بعوض جھوٹی نقل بننے کے خود ایک اچھی اصل ہو جاویں۔ کیوں کہ ہر قسم کی طبیعتیں جو انسان رکھتے ہیں اپنے اپنے موقع پر مفید ہو سکتی ہیں۔ ایک تیز مزاج اور چست وچالاک آدمی اپنے موقع پر ایسا ہی مفید ہوتا ہے جیسے کہ ایک روحانی صورت کا چپ چاپ آدمی اپنے موقع پر۔

خودی جو انسان کو برباد کرنے والی چیز ہے' چپ چاپ سوئی ہوتی ہے تو خوشامد اس کو جگاتی اور ابھارتی ہے اور جسکی خوشامد کی جاتی ہے' اس میں چھچھورے پن کی کافی لیاقت پیدا کر دیتی ہے۔ مگر یہ بات بخوبی یاد رکھنی چاہیے کہ جس طرح خوشامد ایک بدتر چیز ہے اسی طرح مناسب اور سچی تعریف کرنا نہایت عمدہ اور بہت ہی خوب چیز ہے۔ جس طرح کہ لائق شاعر دوسروں کی تعریف کرتے ہیں اور شاعری کی خوبی سے خود ان شاعروں کا نام بھی دنیا میں باقی رہتا ہے۔ دونوں شخص خوش رہتے ہیں' ایک اپنی لیاقت کے سبب سے' دوسرا اس لیاقت کو تمیز کرنے کے سبب سے۔ مگر لیاقت شاعر کی یہ ہے کہ وہ نہایت بڑے استاد مُصوِّر کی مانند ہو کہ وہ اصل صورت اور رنگ اور خال وخط کو بھی قائم رکھتا ہے اور پھر بھی تصویر ایسی بناتا ہے کہ خوشنما معلوم ہو۔

ایشیا کے شاعروں میں ایک بڑا نقص یہی ہے کہ وہ اس بات کا خیال نہیں رکھتے بلکہ جس کی تعریف کرتے ہیں اس کے اوصاف ایسے جھوٹے اور ناممکن بیان کرتے ہیں' جن کے سبب سے وہ تعریف تعریف نہیں رہتی بلکہ فرضی خیالات ہو جاتے

ہیں۔

ناموری کی مثال نہایت عمدہ خوشبو کی ہے۔ جب ہوشیاری اور سچائی سے ہماری واجب تعریف ہوتی ہے تو اس کا ویسا ہی اثر ہوتا ہے جیسے عمدہ خوشبو کا۔ مگر جب سی کمزور دماغ میں زبردستی سے وہ خوشبو ٹھونس دی جاتی ہے تو ایک تیزبو کی مانند دماغ کو پریشان کرتی ہے۔ فیاض آدمی کو بدنامی اور نیک نامی کا زیادہ خیال ہوتا ہے اور عالی ہمت طبیعت کو مناسب عزت اور تعریف سے ایسی ہی تقویت ہوتی ہے جیسے کہ غفلت اور حقارت سے پست ہمتی ہوتی ہے۔ جو لوگ کہ عوام کے درجہ سے اوپر ہیں ان ہی لوگوں پر اس کا زیادہ اثر ہوتا ہے۔ جیسے کہ تھرمامیٹر میں وہی حصہ موسم کا زیادہ اثر قبول کرتا ہے جو صاف اور سب سے اوپر ہوتا ہے۔

(مقالاتِ سرسید)

سوالات

۱۔ خوشامد کی بیماری دل و دماغ میں کس حد تک سرایت کر جاتی ہے؟

۲۔ سرسید احمد خاں کے خیال کے مطابق ایشیا کے شاعروں میں سب سے بڑا نقص کیا ہے؟

۳۔ جب کسی نااہل آدمی کو ناموری میسر آتی ہے تو اس کی کیا حالت ہوتی ہے؟

۴۔ ”خوشامد انسان کو برباد کرنے والی چیز ہے“۔ اس موضوع پر اپنے خیالات کا مختصر اظہار کیجیے۔

۵۔ دو یا دو سے زیادہ بامعنی لفظوں کے مجموعے کو جو کسی حرفِ عطف سے ترکیب پائے، مرکبِ عطفی کہتے ہیں جیسے شب و روز، رات اور دن وغیرہ اس سبق میں سے تمام مرکبِ عطفی تلاش کر کے ایک فہرست مرتب کیجیے۔

۶۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زبان میں کچھ نہ کچھ تغیر ضرور آتا ہے، نئے نئے الفاظ شامل ہوتے رہتے ہیں جبکہ کچھ الفاظ متروک ہو جاتے ہیں۔ اس سبق

میں چند الفاظ ایسے آئے ہیں جو آج متروک ہیں۔ ایسے الفاظ تلاش کر کے لکھیے۔

۷۔ مندرجہ ذیل اقتباس کی تشریح کیجیے۔

خودی جو انسان کو ------------------ خوشنما معلوم ہو۔

○☆○☆○☆○☆○☆○

مولوی عبدالحق

(۱۸۷۰ء-۱۹۶۱ء)
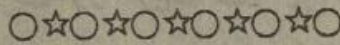
مولانا حالی

غالباً ۱۸۹۲ء یا ۱۸۹۳ء کا ذکر ہے جب میں مدرستہ العلوم مسلمانانِ علی گڑھ میں طالب علم تھا۔ مولانا حالی اس زمانے میں یونین کے پاس کی بنگلیا میں مقیم تھے۔ میں اس تعطیلوں کے زمانے میں وطن نہیں گیا اور بورڈنگ ہاؤس ہی میں رہا۔ اکثر مغرب کے بعد کچھ دیر کے لیے مولانا کی خدمت میں حاضر ہو جاتا تھا۔ مولوی صاحب اس زمانے میں حیاتِ جاوید کی تالیف میں مصروف تھے اور ساتھ ہی ساتھ یادگارِ غالب کو بھی ترتیب دے رہے تھے۔ انھیں دنوں میں میرے ایک عزیز میرے ہاں مہمان تھے۔ میں جو ایک دن مولانا کے ہاں جانے لگا تو وہ بھی میرے ساتھ ہو لیے۔ کچھ دیر مولانا سے بات چیت ہوتی رہی۔ لوٹتے وقت رستے میں مہمانِ عزیز فرمانے لگے کہ ملنے سے اور باتوں سے تو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ وہی مولوی حالی ہیں جنھوں نے مسدس لکھا ہے۔ یہ مولانا کی فطرتی سادگی تھی جو اس خیال کا باعث ہوئی۔

ایک دوسرا واقعہ جو میری آنکھوں کے سامنے پیش آیا اور جس کا ذکر میں نے کسی دوسرے موقع پر کیا ہے۔ یہ ۱۹۰۵ء کا ذکر ہے جب کہ غفران مآب اعلیٰ حضرت مرحوم کی جوبلی بلدہ حیدر آباد اور تمام ریاست میں جو بڑے جوش اور شوق سے منائی جارہی تھی۔ مولانا حالی بھی اس جوبلی میں سرکار کی طرف سے مدعو کیے گئے تھے۔ زمانہ قیام میں اکثر لوگ صبح سے شام تک ان سے ملنے کے لیے آتے رہتے تھے۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ ایک صاحب، جو علی گڑھ کالج کے گریجویٹ اور حیدر آباد میں ایک معزز عہدے پر فائز تھے، مولانا سے ملنے آئے۔ ٹم ٹم پر سوار تھے، زینے کے قریب اترنا چاہتے تھے۔ سائیس کی جو شامت آئی تو اس نے گاڑی دو قدم آگے جا کھڑی کی۔ یہ حضرت اس ذرا سی چُوک پر آپے سے باہر ہو گئے اور ساڑ ساڑ کئی ہنٹر اس غریب کے رسید کر دیے۔ مولانا یہ نظارہ اوپر برآمدے میں کھڑے دیکھ رہے تھے۔ اس کے بعد

وہ کھٹ کھٹ سیڑھیوں پر سے چڑھ کر اوپر آئے، مولانا سے ملے، مزاج پرسی کی اور کچھ دیر باتیں کر کے رخصت ہو گئے۔ میں دیکھ رہا تھا مولانا کا چہرہ بالکل متغیر تھا۔ وہ برآمدے میں ٹہلتے جاتے تھے اور کہتے تھے: "ہائے ظالم نے کیا کیا!"۔ اس روز کھانا بھی اچھی طرح نہ کھا سکے۔ کھانے کے بعد قیلولے کی عادت تھی، وہ بھی نصیب نہ ہوا۔ فرماتے تھے: "یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ ہنٹر کسی نے میری پیٹھ پر مارے ہیں۔" اس کیفیت سے جو کرب اور درد مولانا کو تھا وہ شاید اس بدنصیب سائیس کو بھی نہ ہوا ہو گا۔

مولانا کی سیرت میں دو ممتاز خصوصیتیں تھیں: ایک سادگی دوسری درد دل۔ اور یہی شان ان کے کلام میں ہے۔ ان کی سیرت اور ان کا کلام ایک ہے یا یوں سمجھیے کہ ایک دوسرے کا عکس ہیں۔

مجھے اپنے زمانے کے بعض نامور اصحاب سے اور اپنی قوم کے اکثر بڑے بڑے شخصوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے لیکن مولانا حالی جیسے پاک سیرت اور خصائل کا بزرگ مجھے ابھی تک کوئی نہیں ملا۔ نواب عمادالملک فرمایا کرتے تھے کہ "سرسید کی جماعت میں بحیثیت انسان کے مولانا حالی کا پایہ بہت بلند تھا، اس بات میں سرسید بھی نہیں پہنچتے تھے"۔

خاکساری اور فروتنی خِلقی تھی۔ اس قدر بڑے ہونے پر بھی چھوٹے بڑے سب سے جھک کر اور خلوص سے ملتے تھے۔ جو کوئی ان سے ملنے آتا، خوش ہو کر جاتا اور عمر بھر ان کے حُسنِ اخلاق کا مدّاح رہتا تھا۔ ان کا رتبہ بہت بڑا تھا مگر انھوں نے کبھی اپنے آپ کو بڑا نہ سمجھا۔ بڑوں کا ادب اور چھوٹوں پر شفقت تو وہ کرتے ہی تھے لیکن بعض اوقات وہ اپنے سے چھوٹوں کا بھی ادب کرتے تھے۔ طالب علمی کے زمانے میں ایک بار جب وہ علی گڑھ میں مقیم تھے، میں اور مولوی حمیدالدین مرحوم ان سے ملنے گئے تو سروقد تعظیم کے لیے کھڑے ہو گئے۔ ہم اپنے دل میں بہت شرمندہ ہوئے۔ مولوی حمیدالدین نے کہا بھی کہ آپ ہمیں تعظیم دے کر محجوب کرتے ہیں۔ فرمانے لگے: "آپ لوگوں کی تعظیم نہ کروں تو کس کی کروں، آئندہ آپ ہی تو قوم کے ناخدا ہونے والے ہیں"۔

مولانا بہت ہی رَقیقُ القَلبُ تھے۔ دوسرے کی تکلیف کو دیکھ کر بے چین ہو جاتے تھے اور جہاں تک اختیار میں ہوتا اس کے رفع کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ حاجت مندوں کی حاجت روا کرنے میں بڑی فراخ دلی سے کام لیتے تھے۔ باوجودیکہ ان کی آمدنی قلیل تھی لیکن اپنے پرائے خصوصاً مصیبت زدہ لوگوں کے ساتھ سلوک کرتے رہتے تھے۔ اس میں چھوٹے بڑے کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ بامروت ایسے تھے کہ انکار نہیں کر سکتے تھے۔ اس قلیل آمدنی پر بھی حاجت مند ان کے ہاں سے محروم نہیں جاتے تھے۔

تَعَصُّبُ ان میں نام کو نہ تھا۔ ہر قوم و ملت کے آدمی سے یکساں خلوص اور محبت سے پیش آتے تھے۔ جب کبھی ہندو مسلم نزاع کا کوئی واقعہ سنتے تھے تو انھیں بہت رنج اور افسوس ہوتا تھا۔ تحریر و تقریر میں تو کیا، نجی اور بے تکلفی کی گفتگو میں بھی ان کی زبان سے کبھی کوئی کلمہ ایسا سننے میں نہیں آیا جو کسی فرقے کی دل آزاری کا باعث ہو بلکہ اگر کوئی ایسی بات کہتا تو برا مانتے اور نصیحت کرتے تھے۔ بے تعصبی کا وصف انھیں لوگوں میں پایا جاتا ہے جن کی طبیعت میں انصاف ہوتا ہے۔

نام و نمود چھو کر نہیں گیا تھا۔ ورنہ شہرت وہ بد بلا ہے کہ جہاں یہ آتی ہے کچھ نہ کچھ شیخی آ ہی جاتی ہے۔ ہمارے شاعروں میں تو تعلّی عیب ہی نہیں رہی بلکہ شیوہ ہو گئی ہے۔ وہ سیدھی سادی باتیں کرتے تھے اور جیسا کہ عام طور پر دستور ہے باتوں باتوں میں شعر پڑھنا، بحث کر کے اپنی فضیلت جتانا یا اشارے کنائے میں دوسروں کی تحقیر اور درپردہ اپنی بڑائی دکھانا، ان میں بالکل نہ تھا۔ ہاں شعر میں البتہ کہیں کہیں تعلّی آ گئی ہے مگر وہ بھی ایسے لطیف پیرائے میں کہ خاکساری کا پہلو وہاں بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

ان کا ذوقِ شعر اعلیٰ درجے کا تھا۔ جیسا کہ حیاتِ سعدی، یادگارِ غالب اور مقدمہ شعر و شاعری سے ظاہر ہے اور حقیقت یہ ہے کہ صحیح ذوق پیدا کرنے میں انھوں نے بڑا کام کیا ہے۔ لیکن وہ خوامخواہ اس کی نمائش نہیں کرنا چاہتے تھے، ہاں جب کوئی پوچھتا یا اتفاق سے بات آ پڑتی تو وہ کھل کر اس کے نکات بیان کرتے تھے۔

ہمارے ہاں یہ دستور سا ہو گیا ہے کہ جب کبھی کوئی کسی شاعر سے ملتا ہے تو اس سے اپنا کلام سنانے کی فرمائش کرتا ہے۔ شاعر تو شاعر سے اس لیے فرمائش کرتا ہے کہ اسے بھی اپنا کلام سنانے کا شوق گدگداتا ہے اور جانتا ہے کہ اس کا مخاطب بھی اس سے یہی فرمائش کرے گا اور بعض اوقات تو اس کی بھی ضرورت نہیں پڑتی، بغیر فرمائش ہی اپنے کلام سے محظوظ فرمانے لگتے ہیں۔ دوسرے لوگ اس لیے فرمائش کرتے ہیں کہ وہ جانتے ہیں کہ شاعر ان سے اس کی توقع رکھتا ہے لیکن بعض لوگ سچے دل سے اس بات کے آرزومند ہوتے ہیں کہ کسی بڑے شاعر کا کلام اس کی زبان سے سنیں۔ لوگ مولانا حالی سے بھی فرمائش کرتے تھے۔ وہ کسی نہ کسی طرح ٹال جاتے تھے اور اکثر یہ عذر کر دیتے تھے کہ میرا حافظہ بہت کمزور ہے، اپنا لکھا بھی یاد نہیں رہتا۔ یہ محض عذر لنگ ہی نہ تھا، اس میں کچھ حقیقت بھی تھی۔ لیکن اصل بات یہ تھی کہ وہ خودنمائی سے بہت بچتے تھے۔

جن دنوں مولانا حالی کا قیام حیدر آباد میں تھا، ایک دن گرامی مرحوم نے چائے کی دعوت کی۔ چند اور احباب کو بھی بلایا۔ چائے وغیرہ کے بعد جیسا کہ معمول ہے فرمائش ہوئی کہ کچھ اپنا کلام سنایئے۔ مولانا نے وہی حافظے کا عُذر کیا۔ ہرچند لوگوں نے کہا کہ کچھ بھی جو یاد ہو فرمایئے مگر مولانا عذر ہی کرتے رہے۔ اتنے میں ایک صاحب کو خوب سوجھی وہ چپکے سے اٹھے اور کہیں سے "دیوان حالی" لے آئے اور لا کے سامنے رکھ دیا۔ اب مجبور ہوئے کوئی عذر نہیں چل سکتا تھا۔ آخر انھوں نے یہ غزل سنائی جس کا مطلع ہے:

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھہرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں

آج کل تو ہمارے اکثر شاعر لَے سے یا خاص طور پر گا کر پڑھتے ہیں، ان کا ذکر نہیں، لیکن جو تحت اللفظ پڑھتے ہیں، ان میں بعض طرح طرح سے چشم و ابرو، ہاتھ، گردن اور دوسرے اعضاء سے کام لیتے اور بعض اوقات ایسی صورتیں بناتے ہیں کہ بے اختیار ہنسی آجاتی ہے۔ مولانا سیدھے سادے طور سے پڑھتے تھے۔ البتہ موقع کے

لحاظ سے اس طرح ادا کرتے تھے کہ اس سے اثر پیدا ہوتا تھا۔ ایک بار علی گڑھ کالج میں محمڈن ایجوکیشن کانفرنس کا سالانہ جلسہ تھا۔ مولانا کا مزاج کچھ علیل تھا۔ انھوں نے اپنی نظم پڑھنے کے لیے مولوی وحیدالدین سلیم صاحب کو دی، جو بلند آواز مقرّر اور پڑھنے میں کمال رکھتے تھے۔ سلیم صاحب ایک بند ہی پڑھنے پائے تھے کہ مولانا سے نہ رہا گیا، نظم ان کے ہاتھ سے لے لی اور خود پڑھنی شروع کی، ذرا سی دیر میں ساری مجلس میں کہرام مچ گیا۔

سرسید تو خیر اس زمانے میں مورد لعن وطعن تھے ہی اور ہر کس وناکس ان کے منہ آتا تھا لیکن اس کے بعد جس پر سب سے زیادہ اعتراضات کی بوچھاڑ پڑی وہ حالی تھے۔ ایک تو وہ ہر شخص جس کا تعلق سرسید احمد خاں سے تھا، یوں بھی مردود سمجھا جاتا تھا، اس پر ان کی شاعری جو عام رنگ سے جدا تھی اور نشانۂ ملامت بن گئی تھی اور مقدمہ شعروشاعری نے تو خاصی آگ لگا دی۔ اہلِ لکھنؤ اس معاملے میں چھوئی موئی سے کم نہیں۔ وہ معمولی سی تنقید کے بھی روادار نہیں ہوتے۔ انھیں یہ وہم ہو گیا تھا کہ یہ ساری کارروائی انھیں کی مخالفت میں کی گئی ہے۔ پھر کیا تھا ہر طرف سے نکتہ چینی اور طعن وتعریض کی صدا آنے لگی۔ "اودھ پنچ" میں ایک طویل سلسلہ مضامین "مقدمہ" کے خلاف مدت تک نکلتا رہا جو ادبی تنقید کا عجیب وغریب نمونہ تھا۔ وہ صرف بے تکے اور مہمل اعتراضات ہی کا مجموعہ نہ تھا بلکہ پھکڑ اور پھبتیوں تک نوبت پہنچ گئی تھی، جن مضامین کا عنوان :

ابتر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے
میدان پانی پت کی طرح پائمال ہے

ہو تو اس سے سمجھ لیجے کہ اس عنوان کے تحت کیا کچھ خرافات نہ بکی گئی ہوں گی۔ مولانا یہ سب کچھ سہتے رہے لیکن کبھی ایک لفظ زبان سے نہ نکالا :

کیا پوچھتے ہو کیوں کر سب نکتہ چیں ہوئے چپ
سب کچھ کہا انھوں نے پر ہم نے دم نہ مارا

لیکن آخر ایک وقت آیا کہ نکتہ چینوں کی زبانیں بند ہو گئیں اور وہی لوگ جو انھیں

شاعر تک نہیں سمجھتے تھے ان کی تقلید کرنے لگے :

غُل تو بہت یاروں نے مچایا پر گئے اکثر مان ہمیں

مخالفت سہنے کا ان میں عجیب و غریب مادہ تھا۔ کیسا ہی اختلاف ہو وہ صبر کے ساتھ سہتے رہتے تھے۔ جواب دیتے تھے لیکن حجت نہیں کرتے تھے۔ بعض اوقات نامعقول بات اور کٹ حجتی پر غصہ آتا تھا لیکن ضبط سے کام لیتے تھے۔ ضبط اور اعتدال ان کے بہت بڑے اُوصاف تھے اور یہ دو خوبیاں ان کے کلام میں بھی کامل طور پر پائی جاتی ہیں۔ یہ ادیب کا بڑا کمال ہے۔ یہ بات صرف اساتذہ کے کلام میں پائی جاتی ہے ورنہ جوش میں آکر آدمی سر رشتۂ اعتدال کھو دیتا ہے اور بہک کر کہیں کا کہیں نکل جاتا ہے اور بجائے کچھ کہنے کے چیخنے چلّانے لگتا ہے۔

ان کا ایک نواسہ تھا۔ ماں اس کی بیوہ تھی اور اس کا یہ ایک ہی لڑکا تھا۔ اکلوتا لڑکا بڑا لاڈلا ہوتا ہے۔ اس پر ایک آفت یہ تھی کہ صَرَع[1] کی بیماری میں مبتلا تھا اس لیے ہر طرح اس کی خاطر اور رضا جوئی منظور تھی۔ وہ مولانا کو بہت دق کرتا مگر وہ اف تک نہ کرتے۔ وہ اینڈے بینڈے سوال کرتا' یہ بڑے تحمل سے جواب دیتے۔ وہ فضول فرمائشیں کرتا' یہ اس کی تعمیل کرتے۔ وہ خفا ہوتا اور بگڑتا' یہ اس کی دل دہی کرتے۔ وہ روٹھ جاتا' یہ اسے مناتے۔ وہ لڑ کر گھر سے بھاگ جاتا' یہ اسے ڈھونڈتے پھرتے۔ پانی پت سے کہیں باہر جاتے تو وہ انھیں دھمکی کے خط لکھتا' یہ شفقت آمیز خط لکھتے اور سمجھاتے بجھاتے۔ کچھ اس کی بیماری کا خیال اور کچھ اس کی دکھیا ماں کا پاس' وہ سب سے زیادہ اس پر شفقت فرماتے اور اس کی ہٹ' خفگی' روٹھنے مچلنے کو سہتے اور کبھی آزردگی یا بیزاری کا اظہار نہ کرتے۔ اگرچہ جوان ہو گیا تھا مگر مزاج اس کا بچوں کا سا تھا۔ سلیم مرحوم فرماتے تھے کہ ایک بار اس نے مولانا کو ایسا دھکا دیا کہ وہ گر پڑے۔ کہیں خواجہ سجاد حسین صاحب نے دیکھ لیا۔ وہ بہت برہم ہوئے اور شاید اس کے ایک تھپڑ مار دیا۔ مولوی صاحب اس پر سخت ناراض ہوئے اور خواجہ صاحب سے بات چیت کرنی

۱۔ ایک بیماری۔ مرگی

موقوف کر دی اور جب تک انھوں نے اس لڑکے سے معافی نہیں مانگی، ان سے صاف نہ ہوئے۔

مولانا نے دنیاوی جاہ ومال کی کبھی ہوس نہیں کی۔ جس حالت میں تھے اس پر قانع تھے اور خوشی خوشی زندگی بسر کرتے تھے اور اس میں اوروں کی بھی مدد کرتے رہتے تھے۔ ان کی قناعت کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہو گا کہ انھیں عربک اسکول میں ساٹھ روپے ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔ جب حیدر آباد میں ان کے وظیفے کی کارروائی ہوئی تو انھوں نے ساٹھ سے زیادہ طلب نہ کیے جس کے تخمیناً "پچھتر حالی[1] ہوتے ہیں۔ ایک مدت تک پچھتر ہی ملتے رہے، بعد میں پچیس کا اضافہ ہوا۔ ۔ ریاست حیدر آباد سے معمولی معمولی آدمیوں کو بیش قرار وظیفے ملتے ہیں۔ وہ چاہتے تو کچھ مشکل نہ تھا، مگر انھوں نے کبھی زیادہ کی ہوس نہ کی اور جو ملتا تھا اس کے لیے وہ بہت شکر گزار تھے۔

غالباً سوا ایک آدھ کے انھوں نے کبھی اپنی کسی کتاب کی رجسٹری نہ کرائی۔ جس نے چاہا چھاپ لی۔ ان کی تصانیف مالِ فتمیا تھیں۔ مسدس تو اتنا چھپا کہ شاید ہی کوئی کتاب چھپی ہو۔ یہ کیسی سیر چشمی اور عالی ظرفی کی بات ہے خصوصاً ایسے شخص کے لیے جس کی آمدنی محدود اور بڑھتی ہوئی ضرورتوں سے کم ہو۔

مروت کے پتلے تھے۔ جب تک خاص مجبوری نہ ہوتی کسی کی درخواست رد نہیں کرتے تھے۔ وقت بے وقت لوگ آجاتے اور فضول باتوں میں وقت ضائع کرتے، وہ بیٹھے سنا کرتے لیکن محض دل آزاری کے خیال سے یہ نہ ہوتا کہ خود اٹھ کر چلے جاتے یا کنایتہ "اشارۃ" کوئی ایسی بات کہتے کہ لوگ اٹھ جاتے۔ حیدر آباد کے قیام میں، میں نے اس کا خوب تماشا دیکھا۔

اسی طرح طبیعت میں حیا بھی تھی۔ جس سال حیدر آباد تشریف لائے، سرسید کی برسی کا جلسہ بھی انھیں کی موجودگی میں ہوا۔ ان سے خاص طور سے درخواست کی گئی کہ اس جلسے کے لیے سرسید کی زندگی پر کوئی مضمون پڑھیں۔ نواب عمادالملک بہادر صدر تھے۔ مولانا نے اس موقع کے لیے بہت اچھا مضمون لکھا تھا۔ مضمون ذرا طویل

۱۔ موجودہ

تھا، پڑھتے پڑھتے شام ہو گئی، اس لیے آخری حصہ چھوڑ دیا۔ قیام گاہ پر واپس آکر فرمانے لگے کہ میرا گلا بالکل خشک ہو گیا تھا اور حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے، اچھا ہوا اندھیرا ہو گیا ورنہ اس سے آگے ایک لفظ نہ پڑھا جاتا۔ میں نے کہا وہاں پانی شربت وغیرہ کا سب انتظام تھا، آپ نے کیوں نہ فرمایا، اسی وقت پانی یا شربت حاضر کر دیا جاتا۔ کہنے لگے اتنے بڑے مجمع میں پانی مانگتے ہوئے شرم معلوم ہوئی۔

جب کسی ہونہار تعلیم یافتہ نوجوان کو دیکھتے تو بہت خوش ہوتے تھے اور حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ قدردانی کا یہ حال تھا کہ جہاں کوئی اچھی تحریر نظر سے گزرتی تو فوراً داد دیتے اور خط لکھ کر لکھنے والے کی ہمت بڑھاتے تھے۔ "پیسہ اخبار" جب روزانہ ہوا تو سب سے پہلے مولانا نے مبارک باد کا تار دیا۔ مولوی ظفر علی خاں کی کارگزاریوں سے خوش ہو کر ان کی تعریف میں نظم لکھی۔ ہمدرد اور مولانا محمد علی کی مدح سرائی کی۔ اور جب کبھی کوئی ایسی بات دیکھتے جو قابلِ اعتراض ہوتی تو بڑی ہمدردی اور شفقت سے سمجھاتے اور اس کا دوسرا پہلو بجھاتے۔ ان کے خطوں میں ایسے بہت سے اشارے پائے جاتے ہیں۔ ان کے بعض ہم عصر اس بات سے بہت ناراض ہوتے تھے کہ مولانا داد دینے اور تعریف کرنے میں بہت فیاضی برتتے ہیں جس سے لوگوں کا دماغ پھر جاتا ہے۔ ممکن ہے یہ صحیح ہو لیکن اس کا دوسرا پہلو بھی تو ہے۔ ان کی ذرا سی داد سے دل کتنا بڑھ جاتا تھا اور آئندہ کام کرنے کا حوصلہ ہوتا تھا۔

ہم عصروں اور ہم چشموں[1] کی رقابت پرانی چیز ہے اور ہمیشہ سے چلی آرہی ہے۔ جہاں تک مجھے ان سے گفتگو کرنے کا موقع ملا اور بعض اوقات چھیڑ چھیڑ کر اور کرید کرید کر دیکھا اور ان کی تحریروں کے پڑھنے کا اتفاق ہوا مولانا اس عیب سے بری معلوم ہوتے ہیں۔ محمد حسین آزاد، مولانا شبلی نعمانی کی کتابوں پر کیسے اچھے تبصرے لکھے ہیں اور جو باتیں قابلِ تعریف تھیں، ان کی دل کھول کر داد دی ہے مگر ان بزرگوں میں سے کسی نے مولانا کی کسی کتاب کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔

قیامِ حیدر آباد میں ایک روز مولوی خضر علی خاں مولانا سے ملنے آئے۔ اس

1۔ ایک حلقے کے لوگ

زمانے میں وہ "دکن ریویو" نکالتے تھے۔ کچھ عرصہ پہلے اس رسالے میں ایک دو مضمون مولانا شبلی کی کسی کتاب یا رسالے پر شائع ہوئے تھے۔ ان میں کسی قدر بے جا شوخی سے کام لیا گیا تھا۔ مولانا نے اس کے متعلق ظفر علی خاں صاحب سے ایسے شفقت آمیز پیرائے میں نصیحت کرنی شروع کی کہ ان سے کوئی جواب نہ بن پڑا اور سر جھکائے، آنکھیں نیچی کیے چپ چاپ سنا کیے۔ مولانا نے یہ بھی فرمایا کہ میں تنقید سے منع نہیں کرتا، تنقید بہت اچھی چیز ہے اور اگر آپ لوگ تنقید نہ کریں گے تو ہماری اصلاح کیوں کر ہوگی، لیکن تنقید میں ذاتیات سے بحث کرنا یا ہنسی اڑانا منصبِ تنقید کے خلاف ہے۔

مولانا انگریزی مطلق نہیں جانتے تھے۔ ایک آدھ بار سیکھنے کا ارادہ کیا، نہ ہو سکا لیکن حیرت یہ ہے کہ مغربی تعلیم و تہذیب کے منشا کو جیسا وہ سمجھتے تھے اس وقت بہت سے انگریزی تعلیم یافتہ بھی نہیں سمجھتے تھے۔ ان کا کلام اور ان کی تصانیف اس کی شاہد ہیں اور جو سمجھتے تھے وہ کر کے دکھا دیا۔ آج سیکڑوں تعلیم یافتہ موجود ہیں لیکن ان میں سے کتنے ہیں جنھوں نے اس کا عشرِ عشیر بھی کیا ہو۔ پھر یہی نہیں کہ ہمارے شاعروں اور مصنفوں کی طرح وہ بالکل خیالی شخص تھے بلکہ جو کہتے اور سمجھتے تھے اس پر عامل بھی تھے۔ آدمی مفکر بھی ہو اور عملی بھی، ایسا شاذ ہوتا ہے۔

مولانا کمزوروں اور بے کسوں کے بڑے حامی تھے۔ خاص کر عورتوں کی جو ہمارے ہاں سب سے بے کس فرقہ ہے انھوں نے ہمیشہ حمایت کی۔ "مناجاتِ بیوہ" اور "چپ کی داد" دو ایسی نظمیں ہیں جن کی نظیر ہماری زبان میں کیا ہندوستان کی کسی زبان میں نہیں۔ ان نظموں کے ایک ایک مصرعے سے خلوص، جوش، ہمدردی اور اثر ٹپکتا ہے۔ یہ نظمیں نہیں دل و جگر کے ٹکڑے ہیں۔ لکھنا تو بڑی بات ہے، کوئی انھیں بے چشمِ نم پڑھ بھی نہیں سکتا۔

جن لوگوں نے صرف ان کا کلام پڑھا ہے شاید وہ سمجھتے ہوں کہ مولانا ہر وقت روتے اور بسورتے رہتے ہوں گے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کا دل درد سے لبریز تھا اور ذرا سی ٹھیس سے چھلک اٹھتا تھا، مگر ویسے وہ بڑے شگفتہ مزاج اور خوش

طبع تھے، خصوصاً اپنے ہم صحبت یاروں میں بڑی ظرافت اور شوخی کی باتیں کرتے تھے۔ ان کے کلام میں بھی کہیں کہیں ظرافت اور زیادہ تر طنز کی جھلک نظر آتی ہے۔

مرحوم ہماری قدیم تہذیب کا بے مثال نمونہ تھے۔ شرافت اور نیک نفسی ان پر ختم تھی۔ چہرے سے شرافت، ہمدردی اور شفقت ٹپکتی تھی اور دل کو ان کی طرف کشش ہوتی تھی۔ ان کے پاس بیٹھنے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی چیز ہم پر اثر کر رہی ہے۔ درگزر کا یہ عالم تھا کہ ان سے کیسی ہی بدمعاملگی اور بدسلوکی کیوں نہ کرے، ان کے تعلقات میں کبھی فرق نہ آتا تھا۔ جب ملتے تو اسی شفقت و عنایت سے پیش آتے اور کیا مجال کہ اس بدسلوکی یا بدمعاملگی کا ذکر زبان پر آنے پائے۔ اسی سے نہیں کسی دوسرے سے بھی کبھی ذکر نہ آتا۔ اس سے بڑھ کر کیا تعلیم ہوگی۔ ایسے لوگ جن سے ہر شخص حذر کرتا جب ان سے ملتے تو ان کے حسنِ سلوک اور محبت کا کلمہ پڑھتے ہوئے جاتے تھے۔ وہ پرلے درجے کے نکتہ چیں، جو دوسروں کی عیب گیری کیے بغیر مانتے ہی نہیں، ان کے ڈنک یہاں آکر گر جاتے تھے۔ اخلاق اگر سیکھنے کی چیز ہے تو وہ ایسے ہی پاک نفس بزرگوں کی صحبت میں آسکتے ہیں، ورنہ یوں دنیا میں پند و نصائح کی کوئی کمی نہیں، دفتر کے دفتر بھرے پڑے ہیں۔ کیسا ہی برا زمانہ کیوں نہ ہو، دنیا کبھی اچھوں سے خالی نہیں ہوتی۔ اب بھی بہت سے صاحبِ علم و فضل، باکمال، ذی وجاہت، نیک سیرت اور نیک دل لوگ موجود ہیں مگر افسوس کہ کوئی حالی نہیں!!

(چند ہم عصر)

سوالات

۱۔ "اس کیفیت سے جو کرب اور درد مولانا کو تھا وہ شاید اس بدنصیب سائیس کو بھی نہ ہوگا"۔ اس جملے کی وضاحت کیجیے۔

۲۔ مولانا حالی کی طبیعت میں خاکساری کا وصف کس حد تک تھا؟

۳۔ مولوی عبدالحق کے بیان کے مطابق مولانا حالی احباب کی شعر سنانے کی فرمائش کہاں تک پورا کرتے تھے؟

۴۔ مولوی حالی اپنے معترضین کو اپنے اوپر اعتراضات کا کیا جواب دیتے تھے؟

۵۔ خواجہ الطاف حسین حالی کا اپنے نواسے کے ساتھ کیسا سلوک تھا؟

۶۔ مولانا حالی تعلیم یافتہ نوجوانوں کی کس طرح حوصلہ افزائی کرتے تھے؟

۷۔ مولانا حالی کی سیرت کا کوئی ایک ایسا واقعہ بیان کیجیے جس سے آپ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے ہوں۔

۸۔ مجمل حیثیت سے مولانا حالی کے کردار کی چیدہ چیدہ خصوصیات بیان کیجیے۔

۹۔ مطابقت کے معنی ہیں مطابق یا موافق کرنا۔ قواعدِ زبان کی رُو سے فعل کی اپنے فاعل کے ساتھ، صفت کی اپنے موصوف کے ساتھ اور علامت اضافت کی اپنے مضاف کے ساتھ نسبت کے بدلتے ہوئے اصولوں کو مطابقت کہتے ہیں۔ جیسے :

اس کے بیوی بچے آگئے۔ علم اور نیک چلنی انسان کا درجہ بڑھا دیتے ہیں۔ فوج جا رہی ہے۔ زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے۔ قلم اور دوات یہاں رکھی ہے۔ بانس جھک کر کمان بن گیا وغیرہ۔

اس سبق میں سے چند جملے لے کر فعل کی اپنے فاعل کے ساتھ، صفت کی اپنے موصوف کے ساتھ اور حرفِ اضافت کی اپنے مضاف کے ساتھ مطابقت کی نشاندہی کیجیے۔

۱۰۔ درجِ ذیل اقتباسات کی سیاق و سباق کے حوالے سے تشریح کیجیے :

(الف) ہمارے ہاں یہ دستور ---------- خود نمائی سے بہت بچتے تھے۔

(ب) درگزر کا یہ عالم تھا---------- مگر افسوس کہ کوئی حالی نہیں!!

○☆○☆○☆○☆○☆○

مولوی نذیر احمد

(۱۸۳۱ء۔ ۱۹۱۲ء)

حُسنُ آرا کی تعلیم

(حکیم روح اللہ خاں مہاراجا پٹیالہ کی سرکار میں دیوان اور ان کے چھوٹے بھائی حکیم فتح اللہ خاں والئی اندور کی سرکار میں ایک دراز عرصہ تک مختار کل رہے تھے' اس لیے اس گھرانے کا شمار شہر کے اونچے گھرانوں میں ہوتا تھا۔ روپے پیسے کی خوب ریل پیل تھی اور کام کاج کو حویلی کے اندر اور باہر تیس چالیس نوکر موجود تھے۔ فتح اللہ خاں کی دو بیٹیاں تھیں' جمال آرا اور حسن آرا۔ دونوں لڑکیاں بے جا لاڈ پیار کی وجہ سے بگڑی ہوئی تھیں۔ جمال آرا کی شادی نواب اسفند یار خاں کے بیٹے سے ہوئی تھی لیکن ناموافقت کی بنا پر وہ سسرال والوں سے لڑ جھگڑ کر اپنے والدین کے گھر آن بیٹھی تھی۔ حسن آرا کی نسبت ایک دوسرے نواب گھرانے میں طے ہو چکی تھی۔ اصغری (تمیزدار بہو) اس گھرانے کے نواح میں بیاہی ہوئی آئی تھی۔ لڑکیوں کی ماں سلطانہ بیگم کی بڑی بہن شاہ زمانی بیگم اصغری کے میکے کے ہمسائے میں رہتی تھیں اور اصغری کی لیاقت اور سگھڑپن سے خوب واقف تھیں۔ ایک دن وہ اپنی چھوٹی بہن سلطانہ بیگم کو ملنے آئیں۔)

شاہ زمانی کی چھوٹی بہن' سلطانہ بیگم کو دنیا کے سب عیش میسر تھے۔ لیکن لڑکیوں کی طرف سے رنجیدہ خاطر رہا کرتی تھیں ادھر جمال آرا بیاہ برات ہو ہوا کر گھر بیٹھی تھی۔ ادھر حسن آرا کے مزاج کی افتاد ایسی بری پڑی تھی کہ اپنے ہی گھر میں سب سے بگاڑ تھا' نہ ماں کا لحاظ' نہ آپا کا ادب' نہ باپ کا ڈر۔ نوکر ہیں کہ آپ سے نالاں ہیں' لونڈیاں ہیں کہ الگ پناہ مانگتی ہیں۔ غرض حسن آرا سارے گھر کو سر پر اٹھائے رہتی تھی۔

شاہ زمانی بیگم کے آنے سے چاہیے تھا کہ بڑی خالہ سمجھ کر حسن آرا گھڑی

دو گھڑی کو چپ ہو کر بیٹھ جاتی' کیا ذکر ! شاہ زمانی بیگم کو پالکی سے اترے دیر نہ ہوئی تھی کہ لگاتار دو تین فریادیں آئیں۔ نرگس روتی ہوئی آئی کہ بیگم صاحب! دیکھیے چھوٹی صاحبزادی نے میرا نیا دوپٹا' جھر جھر کر ڈالا۔

سوسن نے فریاد مچائی کہ بیگم صاحب چھوٹی صاحب نے میرے کلّے میں چُٹکا بھرلیا۔ مجھ سے کہا دیکھوں سوسن! تیری زبان' جونہی میں نے دکھانے کو زبان نکالی' نیچے سے ٹھوڑی میں ایسا ٹمکہ مارا کہ سارے دانت زبان میں بیٹھ گئے۔

گلاب بلبلا اٹھی' کہ میرا کان خونا خون ہو گیا۔

دائی چلائی کہ دیکھیے! میری لڑکی کم بخت کے ایسے زور سے لکڑی ماری کہ بازو میں بدّھی پڑ گئی۔

باورچی خانے سے ماما نے دہائی دی کہ دیکھیے۔ سالن کی پتیلیوں میں مُٹھیاں بھر بھر کر راکھ جھونک رہی ہیں۔

شاہ زمانی بیگم نے آواز دی : "حسنا! یہاں آؤ۔

خالہ کی آواز پہچان کر بارے حسن آرا چلی تو آئی' نہ سلام نہ دعا۔ ہاتھوں میں راکھ' پاؤں میں کیچڑ' اسی حالت میں دوڑ خالہ سے لپٹ گئی۔

خالہ نے کہا : "حسنا! تم بہت شوخی کرنے لگی ہو؟"

حسن آرا نے کہا : "اس نرگس چڑیل نے فریاد کی ہوگی؟"

یہ کہہ کر خالہ کی گود سے نکل' لپک کر نرگس کا سر کھسوٹ لیا' بہتیرا خالہ ایں ایں کرتی رہیں' ایک نہ سنی۔

شاہ زمانی بیگم اپنی بہن کی طرف مخاطب ہو کر بولی : "بوا سلطانہ ! اس لڑکی کے لیے تو' خدا کے لیے کوئی استانی رکھو۔"

سلطانہ بیگم نے کہا : "باجی اماں! کیا کروں' مہینوں سے استانی کی تلاش میں ہوں' کہیں نہیں ملتی۔"

شاہ زمانی بیگم بولی: "اوئی بوا! تمھاری بھی وہ کہاوت ہوئی: "ڈھنڈورا شہر میں لڑکا بغل میں۔" خود تمھارے محلے میں مولوی محمد فاضل کی چھوٹی بہو، لاکھ استانیوں کی ایک استانی ہے۔"

سلطانہ نے کہا: "مجھ کو آج تک اطلاع نہیں۔ دیکھو میں ابھی آدمی بھیجتی ہوں"۔

یہ کہہ کر اپنے گھر کی داروغہ کو بلایا، کہ مانی جی![1] "کوئی مولوی صاحب اس محلے میں رہتے ہیں، باجی اماں کہتی ہیں، ان کی چھوٹی بہو بہت پڑھی لکھی ہیں دیکھو اگر استانی گری کی نوکری کریں تو ان کو بلوا لاؤ۔ کھانا، کپڑا اور دس روپے مہینا، پان زردے کا خرچ ہم دینے کو حاضر ہیں، اور جب لڑکی پہلا سپارہ ختم کرے گی اور ادب قاعدہ سیکھ جائے گی، تو تنخواہ کے علاوہ استانی جی کو ہم یوں بھی خوش کر دیں گے۔"

مانی جی، مولوی صاحب کے گھر آئیں، محمد کامل کی ماں سے صاحب سلامت ہوئی اور پوچھا: "اچھی بی! مولوی صاحب کی --- بی بی تمھیں ہو؟"

دیانت النساء نے کہا: "ہاں یہی ہیں۔ آؤ بیٹھو۔ کہاں سے آئیں؟"

مانی جی نے کہا: "تمھاری چھوٹی بہو کہاں ہیں؟"

محمد کامل کی ماں نے کہا: "کوٹھے پر ہیں۔"

مانی جی نے پوچھا: "میں ان کے پاس اوپر جاؤں۔"

دیانت نے کہا: "آپ اپنا پتا نشان بتائیے، بہو صاحب یہیں آجائیں گی۔"

مانی جی نے کہا: "میں حکیم صاحب کے گھر سے آئی ہوں۔"

محمد کامل کی ماں نے نام بنام سب چھوٹے بڑوں کی خیروعافیت پوچھی اور مانی سے کہا: "تمیز دار بہو سے کیا کام ہے؟"

مانی جی نے کہا: "وہی آئیں تو کہوں"

---

[1] دایہ

تمیز دار بہو کے نیچے اترنے کا وقت بھی آگیا تھا' کیونکہ عصر کی نماز پڑھ کر اصغری نیچے اتر آتی تھی اور مغرب اور عشاء دونوں نمازیں نیچے پڑھا کرتی تھی۔

اصغری کو مانی جی نے دیکھا تو استانی گیری کی نوکری کے واسطے کہتے ہوئے تامل کیا۔ باتوں ہی باتوں میں اتنا کہا: "کہ بیگم صاحب کو اپنی چھوٹی لڑکی کا تعلیم کرانا منظور ہے۔ بڑی بیگم صاحب نے آپ کا ذکر کیا تو بیگم صاحب نے مجھ کو بھیجا۔"

اصغری نے کہا: "دونوں بیگم صاحب کو میری طرف سے بہت بہت سلام کہنا اور یہ کہنا کہ جو کچھ برا بھلا مجھ کو آتا ہے مجھ کو کسی سے عذر نہیں' اسی واسطے انسان پڑھتا لکھتا ہے کہ دوسرے کو فائدہ پہنچائے اور بڑی بیگم صاحب کو معلوم ہو گا کہ میں اپنے میکے میں کتنی لڑکیوں کو پڑھاتی تھی اور میرا جی بہت چاہتا ہے کہ بیگم صاحب کی لڑکی کو پڑھاؤں' لیکن کیا کروں نہ تو بیگم صاحب لڑکی کو یہاں بھیجیں گی اور نہ ان کے گھر میرا جانا ہو سکتا ہے۔"

مانی جی نے تنخواہ کا نام صاف تو نہ لیا لیکن دبی زبان سے کہا: "کہ بیگم صاحب ہر طرح سے خرچ پات کی ذمہ داری بھی کرنے کو موجود ہیں۔"

اصغری نے کہا: "یہ سب ان کی مہربانی ہے۔ ان کی ریاست کو یہی بات زیبا ہے' لیکن ان کے زیر سایہ ہم غریب بھی پڑے ہیں تو خدا ننگا بھوکا نہیں رکھتا۔ بے داموں کی لونڈی بن کر تو خدمت کرنے کو میں حاضر ہوں اور اگر تنخواہ دار استانی درکار ہو تو شہر میں بہت ملیں گی۔"

اس کے بعد مانی جی نے اصغری کا حال پوچھا اور جب یہ سنا کہ یہ تحصیل دار کی بیٹی ہے اور مولوی محمد فاضل صاحب بھی پچاس روپے ماہوار کے نوکر ہیں تو مانی کو ندامت ہوئی کہ نوکری کا اشارہ ناحق کیا۔ لیکن اصغری کی گفتگو سن کر مانی لٹو ہو گئی۔ ہر چند نوابی کارخانے دیکھے ہوئے تھی لیکن اصغری کی شستہ تقریر سن کر دنگ ہو گئی اور معذرت کی کہ بی! مجھ کو معاف کرنا۔

اصغری نے کہا: "کیوں تم مجھ کو کانٹوں میں گھسیٹتی ہو۔ اول تو نوکری کچھ گالی

نہیں اور پھر ناواقفیت کے سبب اگر تم نے پوچھا تو کیا مضائقہ؟"

غرض مانی جی رخصت ہوئی اور وہاں جاکر کہا: "بیگم صاحب! استانی تو واقع میں لاکھوں استانیوں کی ایک استانی ہے۔ جس کی صورت دیکھے سے آدمی بن جائے۔ پاس بیٹھے سے انسانیت حاصل کرے۔ سایہ پڑ جانے سے سلیقہ سیکھے۔ ہوا لگ جانے سے ادب پکڑے۔ لیکن نوکری کرنے والی نہیں، تحصیل دار کی بیٹی ہے، رئیس لاہور کے مختار کی بہو، گھر میں ماما نوکر ہے۔ دالان میں چاندنی بچھی ہے۔ سوزنی[1] گاؤ تکیہ لگا ہے۔ اچھی خوش گزران زندگی، بھلا ان کو نوکری کی کیا پروا ہے؟"

شاہ زمانی بیگم بولیں: "سچ ہے بوا سلطانہ! تم نے مانی جی کو بھیجا تو تھا لیکن مجھ کو یقین نہ تھا کہ وہ نوکری کریں گی۔"

مانی جی نے کہا: "لیکن وہ تو ایسی اچھی آدمی ہیں کہ مفت پڑھانے کو خوشی سے راضی ہیں۔"

سلطانہ نے پوچھا: "کیا یہاں آکر؟"

مانی جی نے کہا: "بھلا بیگم صاحب! جو نوکری کی پروا نہیں رکھتا۔ وہ یہاں کیوں آنے لگا؟"

سلطانہ نے کہا: "کیا پھر لڑکی وہاں جایا کرے گی؟"

شاہ زمانی نے کہا: "اس میں کیا قباحت ہے؟ دو قدم پر تو گھر ہے، اور مولوی صاحب کو تم نے ایسا کیا سمجھا، بھائی علی نقی خاں کی سگی پھوپھی زاد بہن کے بیٹے ہیں۔"

سلطانہ نے کہا: "آہا! تو ایک حساب سے ہماری برادری ہیں۔ خیر حسن آرا وہیں چلی جایا کرے گی۔"

اگلے دن شاہ زمانی بیگم اور سلطانہ بیگم دونوں بہنیں، حسن آرا کو لے کر اصغری کے گھر آئیں۔ باوجودیکہ اصغری کے یہاں غریبی سامان تھا لیکن اس کے انتظام

---

[1] ایک قسم کا دوہرا یا روئی بھرا کپڑا جس پر سوئی کا کام کیا گیا ہو۔ ایسے کپڑے کا فرش یا لباس۔

اور سلیقے کے سبب بیگموں کی وہ مدارات ہوئی کہ ہر طرح کی چیز وہیں بیٹھے بیٹھے موجود ہوگئی۔ دو چار طرح کا عطر، چوگھڑا[1]، الائچی، چکنی ڈلی، چائے، بات کی بات میں سب موجود ہو گیا۔ خوب خوب مزے مزے کی گلوریاں تیار ہو گئیں۔ دونوں بہنوں نے اصغری سے کہا: مہربانی کر کے اس کو دل سے پڑھا دیجیے۔"

اصغری نے کہا: "اول تو خود مجھ کو کیا آتا ہے۔ مگر جو دو چار حرف بزرگوں کی عنایت سے آتے ہیں، ان شاء اللہ ان کے بتانے میں اپنے مقدور بھر دریغ نہ کروں گی۔"

چلتے ہوئے سلطانہ بیگم ایک اشرفی اصغری کو دینے لگیں۔

اصغری نے کہا۔ "اس کی کچھ ضرورت نہیں، بھلا یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ میں پڑھوائی آپ سے لوں۔"

سلطانہ نے کہا: استغفراللہ! پڑھوائی دینے کے واسطے ہمارا کیا منہ ہے بسم اللہ کی مٹھائی ہے۔"

اصغری نے کہا: " شروع میں تبرک کے واسطے مٹھائی بانٹ دیا کرتے ہیں۔ سو اشرفی کیا ہوگی، بچوں کا منہ میٹھا کرنے کو سیر آدھ سیر مٹھائی کافی ہے۔"

یہ کہ کر دیانت کی طرف اشارہ کیا، وہ کوٹھڑی میں سے ایک قاب بھر کر نکتیاں نکال لائی۔

اصغری نے خود فاتحہ پڑھ کر پہلے حسن آرا کو دی اور بھری قاب دیانت کو اٹھا دی کہ سب بچوں کو بانٹ دو۔

سلطانہ نے کہا: "آپ نے مجھ کو شرمندہ کیا؟"

اصغری نے کہا: " ہم بے چارے غریب کس لائق ہیں لیکن یہاں جو کچھ ہے وہ آپ ہی کا ہے، البتہ میرا دینا یہی ہے کہ حسن آرا بیگم کو پڑھا دوں، سو خدا وہ دن لائے کہ میں آپ سے سرخ رو ہوں۔"

1۔ چار خانے والا۔ وہ طشتری جس میں عام طور پر خشک میوے رکھے جاتے ہیں۔

غرض دنیا سازی کی باتیں ہو ہوا کر شاہ زمانی بیگم اور سلطانہ بیگم چلی گئیں اور حسن آرا کو اصغری کے حوالے کر گئیں۔

اصغری نے جس طرز پر حسن آرا کو تعلیم کیا' اس کی ایک جدا کتاب بنائی جائے گی اگر یہاں وہ سب حال لکھا جاتا تو یہ کتاب بہت بڑھ جاتی۔ اس مقام پر اتنا ہی مطلب ہے کہ حسن آرا کے بیٹھتے ہی محلے کا محلہ ٹوٹ پڑا' جس کو دیکھو اپنی لڑکی کو لیے چلا آتا ہے لیکن اصغری نے شریف زادیوں کو چن لیا اور باقی کو حکمت عملی سے ٹال دیا کہ میں آئے دن اپنی ماں کے گھر جاتی رہتی ہوں' پڑھنا پڑھانا جب تک جم کر نہ ہو' بے فائدہ ہے۔ پھر بھی بیس لڑکیاں بیٹھتی تھیں۔ لیکن اصغری کو کسی لڑکی سے لینے لوانے کی قسم تھی' بلکہ ایک دو روپیہ اس کا اپنا لڑکیوں پر خرچ ہو جاتا تھا۔

صبح سے دوپہر تک پڑھنا ہوتا تھا اور پھر کھانے کے واسطے چار گھڑی کی چھٹی' اس کے بعد لکھنا اور پہر دن رہے سے سینا۔ سینے کا کام گنجائش تھا' اس واسطے کہ نہ صرف سینا سکھایا جاتا تھا بلکہ ہر طرح کی جالی کاڑھنا' ہر ایک طرح کی سلائی' ہر ایک طرح کی قطع' مصالح[1] بنانا اور ٹانکنا۔

اول اول تو اس کا سامان جمع کرنے میں اصغری کے دس روپے خرچ ہوئے لیکن پھر تو اسی کام سے بچت ہونے لگی۔ جو کام لڑکیاں بناتیں' دیانت اس کو چپکے سے بازار میں لگا آتی اور اس طور پر رفتہ رفتہ مکتب کی ایک بڑی رقم جمع ہو گئی۔ جو لڑکی غریب ہوتی' اسی رقم سے اس کے کپڑے بنائے جاتے' کتاب مول لے دی جاتی۔ لڑکیوں کے پانی پلانے اور پنکھا جھلنے کے واسطے خاص ایک عورت نوکر تھی اور مکتب کی رقم سے اس کو تنخواہ ملتی تھی۔

لڑکیوں کا یہ حال تھا کہ اور استانیوں کے پاس جاتے ہوئے ان کا دم فنا ہوتا لیکن اصغری کی شاگردیں اس پر عاشق تھیں۔ ابھی سو کر نہیں اٹھی کہ لڑکیاں خود بخود آنی شروع ہوئیں اور پہر رات گئے تک جمع رہتی تھیں اور مشکل سے جاتی تھیں۔ اس واسطے کہ اصغری سب کے ساتھ دل سے محبت کرتی تھی اور پڑھانے کا طریقہ ایسا اچھا

1۔ گوٹا کناری

رکھا تھا کہ باتوں باتوں میں تعلیم ہوتی تھی۔ نہ یہ کہ صبح سے ریں ریں کا چرخہ جو ہلا تو دن چھپے تک بند نہیں ہوتا۔

(مِرآۃ العُروس)

سوالات

۱۔ مختصر جواب دیجیے۔

(الف) پڑھنے بیٹھنے سے پہلے حسن آرا اپنے گھر والوں کے ساتھ کس قسم کا سلوک روا رکھتی تھی؟

(ب) مانی جی، اصغری (تمیزدار بہو) کے گھر کس غرض سے آئی تھی،

(ج) اصغری نے کن شرائط کے تحت حسن آرا کو پڑھانے کی ہامی بھری؟

(د) اصغری نے سلطانہ بیگم سے اشرفی لینے سے انکار کرتے ہوئے کس رویے کا اظہار کیا؟

(ہ) اصغری کے گھر مین مکتب کا آغاز کس طرح ہوا؟

(و) اصغری اپنی شاگردوں کو کس انداز سے تعلیم دیتی تھی؟

(ز) اصغری کی شاگرد اپنی استانی پر فریفتہ کیوں رہتی تھیں؟

۲۔ سبق پڑھنے کے بعد اصغری کے کردار کی جو تصویر آپ کے ذہن میں آتی ہے اسے اختصار کے ساتھ اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

۳۔ اس سبق کا خلاصہ لکھیے۔

۴۔ جب کوئی کلام دو یا دو سے زیادہ الفاظ سے مرکب ہو اور اپنے مجازی معنوں میں استعمال ہوا ہو تو وہ کلام محاورہ کہلاتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی کلام ایک اسم اور ایک فعل سے مرکب ہو اور فعل اپنے مجازی معنوں میں مستعمل ہو تو وہ بھی محاورہ کہلاتا ہے جیسے: غم کھانا، قسم کھانا، دھوکا کھانا، ٹھوکر کھانا، بل کھانا وغیرہ۔ تحریر و تقریر میں محاورات کا استعمال ضروری نہیں ہوتا البتہ سلیقے کے

ساتھ جَستہ جَستہ مُحاوَرات کا استعمال کلام کو دل آویز بنا دیتا ہے۔ اس سبق میں بھی چند ایک محاورات استعمال ہوئے ہیں آپ ان کی ایک فہرست مرتب کر کے انھیں اپنے جملوں میں اس طرح استعمال کیجیے کہ ان کا مطلب واضح ہو جائے۔

○☆○☆○☆○☆○☆○

ابنِ انشا
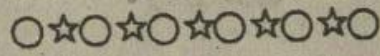
(۱۹۲۷ء۔ ۱۹۷۸ء)

ابتدائی حساب

حساب کے چار بڑے قاعدے ہیں :

جمع، تفریق، ضرب، تقسیم۔

پہلا قاعدہ :

جمع

جمع کے قاعدے پر عمل کرنا آسان نہیں،

خصوصاً مہنگائی کے دنوں میں۔

سب کچھ خرچ ہو جاتا ہے،

کچھ جمع نہیں ہو پاتا۔

جمع کا قاعدہ مختلف لوگوں کے لیے مختلف ہے۔

عام لوگوں کے لیے ۱+۱ = ۱½

تجارت کے قاعدے سے جمع کریں تو ۱+۱ کا مطلب ہے گیارہ۔

رشوت کے قاعدے سے حاصل جمع اور زیادہ ہو جاتا ہے۔

قاعدہ وہی اچھا جس میں حاصل جمع زیادہ سے زیادہ آئے بشرطیکہ پولیس مانع نہ ہو۔

ایک قاعدہ زبانی جمع خرچ کا ہوتا ہے۔

یہ ملک کے مسائل حل کرنے کے کام آتا ہے۔

آزمودہ ہے۔

تفریق

میں سندھی ہوں، تُو سندھی نہیں ہے۔
میں بنگالی ہوں، تُو بنگالی نہیں ہے۔
میں مسلمان ہوں، تُو مسلمان نہیں ہے۔
اس کو تفریق پیدا کرنا کہتے ہیں۔
حساب کا یہ قاعدہ بھی قدیم زمانے سے چلا آرہا ہے۔
تفریق کا ایک مطلب ہے، منہا کرنا،
یعنی نکالنا ایک عدد میں سے دوسرے عدد کو۔
بعض عدد از خود نکل جاتے ہیں۔
بعضوں کو زبردستی نکالنا پڑتا ہے۔
ڈنڈے مار کر نکالنا پڑتا ہے۔
فتوے دے کر نکالنا پڑتا ہے۔
ایک بات یاد رکھیے۔
جو لوگ زیادہ جمع کر لیتے ہیں،
وہی زیادہ تفریق بھی کرتے ہیں۔
انسانوں اور انسانوں میں،
مسلمانوں اور مسلمانوں میں۔
عام لوگ تفریق کے قاعدے کو پسند نہیں کرتے،
کیونکہ حاصل تفریق کچھ نہیں آتا،
آدمی ہاتھ ملتا رہ جاتا ہے۔

ضرب

تیسرا قاعدہ ضرب کا ہے۔ضرب کی کئی قسمیں ہیں۔ مثلاً ضربِ خفیف ' ضربِ شدید ' ضربِ کاری وغیرہ۔

ضرب کی ایک اور تقسیم بھی ہے۔

پتھر کی ضرب 'لاٹھی کی ضرب' بندوق کی ضرب۔

علامہ اقبال رہ کی ضربِ کلیم ان کے علاوہ ہے۔

حاصلِ ضرب کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ ضرب کس چیز سے دی گئی ہے یا لگائی گئی ہے۔

آدمی کو آدمی سے ضرب دیں تو حاصل ضرب بھی آدمی ہی ہوتا ہے۔

لیکن ضروری نہیں کہ وہ زندہ ہو۔

ضرب کے قاعدے سے کوئی سوال حل کرنے سے پہلے تعزیراتِ پاکستان پڑھ لینی چاہیے۔

تقسیم

یہ حساب کا بڑا ضروری قاعدہ ہے۔ سب سے زیادہ جھگڑے اسی پر ہوتے ہیں۔

تقسیم کا مطلب ہے بانٹنا۔

اندھوں کا آپس میں ریوڑیاں بانٹنا۔

بندر کا بلیوں میں روٹی بانٹنا۔

چوروں کا آپس میں مال بانٹنا۔

اہلکاروں کا آپس میں رشوت بانٹنا۔

مل بانٹ کر کھانا اچھا ہوتا ہے۔

دال تک جوتوں میں بانٹ کر کھانی چاہیے '

ورنہ قبض کرتی ہے۔

تقسیم کا طریقہ کچھ مشکل نہیں ہے۔

حقوق اپنے پاس رکھیے'

فرائض دوسروں میں بانٹ دیجیے۔

روپیہ پیسہ اپنے کھیسے میں ڈالیے'

قناعت کی تلقین دوسروں کو کیجیے۔

آپ کو مکمل پہاڑا مع جاری گر یاد ہو تو کسی کو تقسیم کی کانوں کان خبر نہیں ہو سکتی۔ آخر کو ۱۲ کروڑ کی دولت کو ۲۲ خاندانوں نے آپس میں تقسیم کیا ہی ہے۔

کسی کو پتا چلا؟

ابتدائی الجبرا

یہ بھی ایک قسم کا حساب ہے چونکہ طالب علم اس سے گھبراتے ہیں اور یہ جبراً" پڑھایا جاتا ہے اس لیے الجبرا کہلاتا ہے۔

حساب اعداد کا کھیل ہے۔ الجبرا حرفوں کا۔ ان میں سب سے مشہور حرف "لا" ہے۔ جسے لا لکھتے ہیں۔ اس کے معنی کچھ نہیں بلکہ یہ ایسا ہے۔۔۔ کہ کسی اور لفظ کے ساتھ لگ جائے تو اس کے معنی بھی سلب کر لیتا ہے۔ جس طرح لامکاں' لادوا' لاولد وغیرہ۔ بعض مستثنیات بھی ہیں۔ مثلاً : لاہور' لاڑکانہ ' لالٹین' لالوکھیت وغیرہ۔ اگر ان لفظوں کے ساتھ لا نہ ہو تو ہور' ڑکانہ 'لُوکھیت کے کچھ معنی نہ نکلیں۔

آزمائے کو آزمانا جہل کہتے ہیں۔ لیکن الجبرا میں آزمائے کو ہی آزماتے ہیں۔ اچھے خاصے پڑھے لکھوں کو نئے سرے سے اب ج سکھاتے ہیں بلکہ ان کے مربعے بھی نکلواتے ہیں۔

الجبرا کا ہماری طالب علمی کے زمانے میں کوئی خاص مصرف نہ تھا۔

اس سے صرف اسکولوں کے طلبہ کو فیل کرنے کا کام لیا جاتا تھا۔ لیکن آج

کل یہ عملی زندگی میں خاصا استعمال ہوتا ہے۔ دکاندار اور گداگر اس قاعدے کو زیادہ استعمال کرتے ہیں۔

پیسہ لا' اور لا اور لا۔

بعض رشتوں میں الجبرا یعنی جبر کا شائبہ ہوتا ہے' جیسے: مدر اِن لا[1] فادر اِن لا[2] وغیرہ۔ مارشل لاء کو بھی الجبرے ہی کا ایک قاعدہ سمجھنا چاہیے۔

ابتدائی جیومیٹری

جیومیٹری لکیروں کا کھیل ہے۔ علمائے جیومیٹری کو ہم لکیر کے فقیر کہہ سکتے ہیں۔ دنیا نے اتنی ترقی کر لی۔ ہر چیز بشمول سائنس اور مہنگائی کہاں سے کہاں پہنچ گئی' لیکن جیومیٹری والوں کے ہاں اب تک زاویہ قائمہ ۹۰ درجہ کا ہوتا ہے اور مثلث کے اندرونی زاویوں کا مجموعہ ۱۸۰ درجے سے تجاوز نہیں کر پایا۔ امریکہ اور روس اور ہر معاملہ میں لڑتے ہیں' اس معاملے میں ملی بھگت ہے۔ ہم اپنے ملک میں اپنی پسند کا نظام لائیں گے تو اپنی اسمبلی میں ایک قانون بنوائیں گے' چند درجے ضرور بڑھائیں گے۔ مستطیل بھی پرانے زمانے میں جیسی چورس ہوتی تھی ویسی آج کل ہے۔ کسی کو یہ توفیق تک نہ ہوئی کہ اس کے چار سے پانچ یا چھ ضلعے کر دے۔ ایک آدھ فالتو رہے تو اچھا ہے۔ مغربی پاکستان کے ضلعوں میں ہم ردّوبدل کرتے ہیں تو مستطیل وغیرہ کے ضلعوں میں کیوں نہیں کر سکے۔

جیومیٹری میں بنیادی چیزیں ہیں: خط' نقطہ' دائرہ' مثلث وغیرہ۔ اب ہم تھوڑا تھوڑا حال ان کا لکھتے ہیں :

خط

خط کی کئی قسمیں ہیں : خطِ مستقیم' بالکل سیدھا ہوتا ہے' اس لیے اکثر نقصان اٹھاتا ہے۔ سیدھے آدمی بھی نقصان اٹھاتے ہیں۔

۱۔ Mother in law

۲۔ Father in law

خطِ منحنی : یہ ٹیڑھا ہوتا ہے بالکل کھیر کی طرح، لیکن اس میں میٹھا نہیں ڈالا جاتا۔

خطِ تقدیر : اسے فرشتے پکی سیاہی سے کھینچتے ہیں۔ یہ مستقیم بھی ہوتا ہے منحنی بھی۔ اس کا مٹانا مشکل ہوتا ہے۔

خطِ شکستہ : یہ وہ خط ہے جس میں ڈاکٹر لوگ نسخے لکھتے ہیں۔ تبھی تو آج کل اتنے لوگ بیماریوں سے نہیں مرتے جتنے غلط دواؤں کے استعمال سے مرتے ہیں۔

خطِ استوا : یہ اس لیے ہوتا ہے کہ کہیں تو دنیا میں دن رات برابر ہوں کہیں تو مساوات نظر آئے۔

خط کی دو اور قسمیں مشہور ہیں

ا۔ حسینوں کے خطوط : یہ دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن میں دور، بہت دور افق کے پار جانے کا ذکر ہوتا ہے، جہاں ظالم سماج نہ پہنچ سکے۔ یہ تصویرِ بتاں کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں۔ دوسرے وہ جو حسینوں کے چہروں پر ہوتے ہیں اور جن کو چھپانے کے لیے ہر سال کروڑوں روپے کی کریمیں، لوشن، پوڈر، وغیرہ صرف کیے جاتے ہیں۔

متوازی خطوط : یہ ویسے تو آمنے سامنے ہوتے ہیں لیکن تعلقات نہایت کشیدہ۔ ان کو کتنا بھی لمبا کھینچ کے لے جایئے یہ کبھی آپس میں نہیں ملتے۔ کتابوں میں یہی لکھا ہے۔ لیکن ہمارے خیال میں ان کو ملانے کی کوئی سنجیدہ کوشش بھی نہیں کی گئی۔ آج کل بڑے بڑے ناممکنات کو ممکن بنا دیا گیا ہے تو یہ کس شمار قطار میں ہیں۔

نقطہ (.)

نقطہ یعنی بندی یعنی پوائنٹ۔ یہ محض کسی جگہ کی نشاندہی کے لیے ہوتا ہے۔ جیومیٹری کی کتابوں میں آیا ہے کہ نقطہ جگہ نہیں گھیرتا۔ ایک آدھ نقطہ کی حد تک یہ بات صحیح ہوگی لیکن چھ نقطوں سے تو آپ سارا پاکستان گھیر سکتے ہیں۔

دائرہ

دائرے چھوٹے بڑے ہر قسم کے ہوتے ہیں۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ

قریب قریب بھی گول ہوتے ہیں۔ ایک اور عجیب بات ہے کہ ان میں قطر کی لمبائی ہمیشہ نصف قطر سے دگنی ہوتی ہے۔ جیومیٹری میں اس کی کوئی وجہ نہیں لکھی گئی۔ جو کسی نے پرانے زمانے میں فیصلہ کر دیا، اب تک چلا آرہا ہے۔

ایک دائرہ اسلام کا دائرہ کہلاتا ہے۔ پہلے اس میں لوگوں کو داخل کیا کرتے تھے، آج کل داخلہ منع ہے، صرف خارج کرتے ہیں۔

مُثَلَّث

تکون کے تین کونے ہوتے ہیں۔ چار کونوں والی بھی ہوتی ہوں گی۔ لیکن ہمارے ملک میں نہیں پائی جاتیں۔ کم از کم ہماری نظر سے نہیں گزریں۔

مثلثیں کئی طرح کی ہوتی ہیں مثلاً: عشق کی مثلث: عاشق، معشوق اور رقیب۔ فلم میں بھی یہی مثلث ہوتی ہے۔ لیکن وہاں ان تینوں کو پیسے ملتے ہیں۔ رقابت سے شادی تک فلم ساز کے خرچ پر ہوتی ہے۔

(اردو کی آخری کتاب)

سوالات

۱۔ مختصر جواب دیجیے۔

۱۔ ابنِ انشا کے خیال کے مطابق جمع کے قاعدے پر عمل کرنا آسان نہیں، کیوں؟

۲۔ زبانی جمع خرچ کا قاعدہ کس کام آتا ہے؟

۳۔ عام لوگ تفریق کے قاعدے کو کیوں پسند نہیں کرتے؟

۴۔ ضرب کی کتنی قسمیں ہیں؟

۵۔ تقسیم کا مطلب واضح کیجیے۔

۶۔ الجبرے کو الجبرا کیوں کہا جاتا ہے؟

۷۔ خطِ شکستہ سے کیا مراد ہے؟

۲۔ خالی جگہ پُر کیجیے:۔

(الف) جو لوگ زیادہ ـــــــ کرتے ہیں وہی زیادہ ـــــــ بھی کرتے ہیں۔

(ب) ـــــــ کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ ضرب کس چیز سے دی گئی ہے۔

(ج) ضرب کے قاعدے سے کوئی سوال حل کرنے سے پہلے ـــــــ پڑھ لینی چاہیے۔

(د) حساب ـــــــ کا کھیل ہے، الجبرا ـــــــ کا۔

(ہ) ـــــــ کو بھی الجبرے ہی کا ایک قاعدہ سمجھنا چاہیے۔

(و) جیومیٹری ـــــــ کا کھیل ہے۔

۳۔ "ابنِ انشا بات سے بات پیدا کرتے اور زبان کے استعمال کے بدلتے رنگوں سے نئے نئے پہلو تراشتے ہیں"۔ سبق پڑھ کر چند مثالیں دیجیے۔

۴۔ ظرافت اور طنز میں کیا فرق ہے؟ مختصر طور پر لکھیے۔

○☆○☆○☆○☆○☆○

سید امتیاز علی تاج

(۱۹۰۰ء - ۱۹۷۰ء)
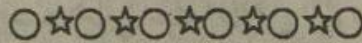
قلعہ لاہور کا ایک ایوان

(تحقیق سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ تاریخی اعتبار سے "انار کلی" کی داستان اور سید امتیاز علی تاج کے ڈرامے "انار کلی" کا تعلق محض روایت سے ہے تاہم اس ڈرامے میں انھوں نے مغل شہنشاہ اور مغلیہ حرم کی شان و شوکت کا جس پیرائے میں اظہار کیا ہے وہ بہت دل آویز ہے۔ حرمِ شاہی میں انار کلی سے پہلے اکبرِ اعظم کی منظورِ نظر کنیز اور رقاصہ دِلارام ہے۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی جگہ انار کلی لے لیتی ہے۔ اس امر کا دلارام کو بہت دکھ ہے اور وہ حسد کے مارے انار کلی کو اپنی راہ کا کانٹا سمجھتی ہے اور اس کانٹے کو نکالنے کے لیے ہر آن کوشاں نظر آتی ہے۔ ولی عہد سلطنت شہزادہ سلیم (جہانگیر) انار کلی میں دلچسپی لیتا ہے تو دلارام اس راز کو طشت از بام کر دیتی ہے۔)

منظر سوم

قلعہ لاہور میں سفید پتھر سے بنا ہوا ایک بلند مگر نہایت سادہ اور دلکش ایوان جسے دیکھنے سے دماغ پر ایک فرحت افزا خاموشی اور خنکی کا سا اثر ہوتا ہے۔ اکبر ایک مسند پر آنکھیں بند کیے اور پیشانی پر ہاتھ الٹا رکھے چپ چاپ لیٹا ہے۔ معلوم ہوتا ہے سخت ذہنی محنت کے بعد اس کا دماغ تھک گیا ہے اور وہ اب بالکل خالی الذہن ہو کر اپنے مضمحل اعصاب کو آرام پہنچانا چاہتا ہے۔ مہارانی پاس بیٹھی ہے۔ سامنے کنیزیں رقص کر رہی ہیں۔ مہارانی ٹھوڑی پر ہاتھ رکھے کچھ سوچ رہی ہے۔ اکبر ایک دو مرتبہ آنکھیں کھول کر یوں کنیزوں کی طرف دیکھتا ہے۔ گویا ان کا رقص اسے تکلیف پہنچا رہا ہے۔ آخر ہاتھ اٹھاتا ہے اور کنیزیں جہاں ہیں وہیں ساکت ہو جاتی ہیں۔

مہارانی: (خاموشی سے چونک کر اکبر کو دیکھتی ہے) مہاراج؟

اکبر: (منہ موڑتے ہوئے، کنیزوں سے) جاؤ۔

(کنیزیں رخصت ہو جاتی ہیں)

مہارانی : کیوں مہابلی[1]؟

اکبر: (آنکھیں بند کیے ہوئے) راحت نہیں۔ ان کے رقص کے قدم میرے تھکے ہوئے دماغ کو صدمہ پہنچاتے ہیں۔

مہارانی : پھر اتنی محنت کیوں کیا کرتے ہیں؟

اکبر: (آنکھیں کھول کر چپ چاپ پڑا کچھ دیر سامنے تکتا رہتا ہے۔ اور پھر سکون سے) شہنشاہ ہُوں رانی!

مہارانی : ــــــــاور پھر بھی؟

اکبر: (پُر معنی انداز میں) کس کا قیاس جرأت کر سکتا ہے۔ کیا چاہتا ہوں۔

مہارانی : سیوک جو موجود ہیں۔

اکبر: (طنز کے خفیف تبسم سے) سیوکوں نے کتنے بادشاہوں کو اکبرِ اعظم بنا دیا۔

مہارانی : نورتن اتنے بے حقیقت ہیں؟

اکبر: (سکون سے) اگر ان کو اکبر کے خواب ہدایت نہ دیں۔

مہارانی : خواب!

اکبر: (خواب ناک نظروں سے سامنے کہیں دُور تکتے ہوئے)

میری فوجیں، میری سیاست، میرے نورتن، سب میرے خوابوں کے پیچھے آوارہ ہیں۔ کون میری طرح ناممکن کے خواب دیکھ سکتا ہے؟

کون میری طرح اپنے خوابوں کو حقیقت سمجھ سکتا ہے.....

میری عظمت میرے خواب ہیں رانی!

مہارانی : آپ کی عظمت؟

اکبر: اور ابھی تک ــــــہندوستان ایک مسکین کتے کی طرح میرے تلوے چاٹ

---

[1] بڑا طاقتور۔ شہ زور۔ زبردست۔ یہاں مراد اکبرِ اعظم ہے۔

رہا ہے۔ مگر ابھی تک میری زندگی کا سب سے بڑا خواب ان دیکھا پڑا ہے۔ اور میں اسے جنم دینے کا عزم اپنے میں نہیں پاتا۔

مہارانی : خواب کا جنم ؟ کیا کہہ رہے ہیں مہابلی ؟

اکبر: انسان کے جنم سے بہت زیادہ عزم چاہتا ہے رانی ۔۔۔۔۔ اور میں بہت تھک گیا ہوں اور اکیلا ہوں۔۔۔۔۔ شیخو۔ کاش۔۔۔۔ شیخو

مہارانی : (اکبر کا منہ تکتے ہوئے) شیخو ؟

اکبر: (آہستہ سے) لیکن ابھی کون جانتا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے۔ (کسی قدر بے تاب ہو کر) مغلوں میں کوئی خواب دیکھنے والا نہ تھا۔ انھیں اکبر مل گیا اگر اکبر کے جانشینوں میں تیمور کی طوفانی روح، بابر کی حیرت انگیز معلومات اور ہمایوں کا آہنی استقلال ہوا (آہستہ سے) لیکن ابھی کون جانتا ہے شیخو ۔۔۔۔ (کڑک کر) بلا سے زمین سر پٹخ پٹخ کر رہ جائے۔ اور قرن اور صدیاں اس کے سینے سے مغلِ اعظم کو نہ اکھاڑ سکیں۔

مہارانی : (مناسب جواب کی کوشش میں) شیخو آپ کا موزوں جانشین ہو گا۔

اکبر (گرم ہو کر) اگر اس کا یقین ہو جاتا تو میں اپنے دماغ کا آخری ذرہ تک خواب میں تبدیل کر دیتا۔ لیکن میری تمام امیدوں سے وہ اتنا بے اعتنا ہے، اتنا بے نیاز ہے کہ میں ۔۔۔۔ لیکن میرا سب کچھ وہی ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا مجھے کتنا عزیز ہے۔ کاش وہ میرے خوابوں کو سمجھے۔ ان پر ایمان لے آئے۔ اسے معلوم ہو جائے، اس کے فکر مند باپ نے اس کی ذات سے کیا کیا ارمان وابستہ کر رکھے ہیں۔ وہ اپنی موت کے بعد اس میں زندہ رہنے کا کتنا مشاق ہے۔۔۔۔ (سوچتے ہوئے) لیکن ابھی کیا معلوم !

مہارانی : ابھی بچہ ہی تو ہے۔

اکبر: (فہمائش آمیز متانت سے) ہماری محبت دیوانی نہیں کہ اس کا سن و سال بھول جائے اور ہم چاہتے ہیں تم بھی اسے یقین دلاؤ کہ فی الحال وہ ایک بے

پروا نوجوان کے سوا اور کچھ نہیں۔

مہارانی : مگر وہ اپنے ہم عمروں سے کچھ بہت مختلف تو نہیں ہے۔

اکبر: (کسی قدر برافروختہ ہو کر) یہ تم مجھ سے کہہ رہی ہو؟ اکبر سے؟ جو اس عمر میں ایک سلطنت کا بوجھ اپنے کم سن کندھوں پر اٹھا چکا تھا' جس نے دنیا کی بے باک نظروں کو جھکنا سکھا دیا تھا' جو اس عمر میں مفتوح ہند کو متحد کرنے کے دشوار مسائل میں منہمک تھا۔ ہاں جو اس عمر میں خواب تک دیکھتا تھا (اٹھ کھڑا ہوتا ہے) تم ماں ہو۔ صرف ماں (جانا چاہتا ہوں)

مہارانی : آپ بہت تھک چکے ہیں۔ ابھی آرام فرمایئے۔

اکبر: کوئی رقص لاؤ۔ کوئی موسیقی۔ نرم و نازک خوش آیند (بیٹھ جاتا ہے) انار کلی کہاں ہے؟ اس کو بلاؤ' وہ تھکے ہوئے دماغ کو ٹھنڈک پہنچانا جانتی ہے۔

مہارانی : انار کلی بیمار ہے مہاراج اور اس کی ماں چاہتی ہے۔ آپ کی اجازت ہو۔ تو اسے تھوڑے عرصے کو تبدل آب و ہوا کے لیے کسی دوسرے شہر بھیج دیا جائے۔

اکبر: (نیم دراز ہوتے ہوئے) حکیم نے اسے دیکھا؟

مہارانی : کچھ تشخیص نہ کر سکا۔ لیکن خود انار کلی سمجھتی ہے آب و ہوا کی تبدیلی اس کے لیے مفید ہوگی۔

اکبر: (بے پروائی سے) تم کو اعتراض نہیں تو اس کو اجازت ہے۔

مہارانی : لیکن حرم سرا کے جشن میں تھوڑے سے دن رہ گئے ہیں اور انار کلی کے بنا جشن سُونا رہ جائے گا۔

اکبر: (کروٹ لیتے ہوئے) پھر مت جانے دو۔

مہارانی : دباؤ ڈالنا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔

اکبر: زبردستی کیوں ظاہر ہو' جشن تک اس کو علاج کے بہانے سے ٹھہرا لیا جائے

اور جشن میں شامل کرنے کے بعد رخصت دے دی جائے۔

مہارانی : لیکن وہ جشن کا اہتمام کیسے کر سکے گی؟

اکبر: صرف رقص و سرود ۔۔۔۔انتظام کسی دوسرے کے سپرد ہو۔

مہارانی : دلارام!

اکبر: ہاں کہاں ہے وہ اس کو بلاؤ۔ اس کا گیت میرے دماغ کو تازگی بخشے گا (رانی تالی بجاتی ہے)

(ایک خواجہ سرا حاضر ہو کر دست بستہ کھڑا ہو جاتا ہے)

مہارانی : دلارام!

(خواجہ سرا رخصت ہو جاتا ہے)

جشن کے متعلق کوئی ہدایت ہے؟

اکبر: (کسی قدر چڑ کر) میرا نورتن کو ہدایت دینا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

مہارانی : جشن میں شطرنج کھیلیں گے آپ؟

اکبر: کون کھیلے گا ہم سے؟

مہارانی : میں سلیم سے کہوں گی۔

(دلارام حاضر ہو کر مجرا بجا لاتی ہے)

مہارانی : دلارام! حرم سرا کے جشن کا اہتمام انارکلی کے بجائے تجھے کرنا ہو گا۔

دلارام : بسروچشم۔

مہارانی : اور انارکلی صرف رقص و سرود ہی کے لیے شریک ہوگی۔

دلارام : بہت بہتر۔

مہارانی : تو جانتی ہے جشن کے لیے کیا کچھ کرنا ہو گا۔

دلارام : حضور میں پہلے کئی جشنوں کا اہتمام کر چکی ہوں۔

مہارانی : اور دیکھ مہابلی سلیم سے شطرنج کھیلیں گے۔

دلارام : (کسی قدر چونک کر) صاحبِ عالَم سے؟

مہارانی : ہاں!

(دلارام کے دماغ میں سلیم اور انار کلی کے خیالات اس قدَر گھومتے رہے ہیں کہ وہ سن کر کھو سی جاتی ہے)

جشن شیش محل میں ہو گا ـــــ اور روشنی ـــــ تُو سن رہی ہے؟

دلارام : (چونک کر) صاحبِ عالَم!

مہارانی : پگلی! کیا صاحبِ عالَم؟

(اکبر آنکھ کھول کر دلارام کی طرف دیکھتا ہے)

دلارام : صاحبِ عالَم علیل تھے مہارانی۔

اکبر: نہیں وہ شریک ہو گا۔

مہارانی : سنا، جشن شیش محل میں ہو گا۔ اور روشنی ـــــ

اکبر: اب بس پہلے کوئی گیت ـــــ سیدھا سادا اور میٹھا۔ مگر آواز دھیمی اور نرم۔ گرم اور زخمی دماغ کو ایک ٹھنڈا مرہم چاہیے۔ رقص ہلکا پھلکا۔ گھنگروؤں کا شور نہ ہو۔ بہت چکر نہ ہو۔ پاؤں آہستہ آہستہ زمین پر پڑیں جیسے پھول برس رہے ہوں، برف کے گالے زمین پر اتر رہے ہوں۔ لیکن خمار نہ ہو، نیند نہ آئے۔ ہمیں پھر مصروف ہونا ہے۔

(دلارام رقص شروع کرتی ہے۔ مگر رقص کے دوران میں بھی وہ سوچ میں ہے اور ذہنی مصروفیت کے باعث اس کے رقص میں نقص نظر آرہے ہیں)

اکبر: (اٹھ کھڑا ہوتا ہے) کچھ نہیں کسی کو نہیں آتا۔ کوئی نہیں جانتا ـــــ اور انار کلی علیل ہے۔

(اکبر اور پیچھے پیچھے مہارانی جاتی ہے)

دلارام: (جیسے سوچ میں سُن کھڑی رہ جاتی ہے) انارکلی ہوگی ---- سلیم ہوگا، اور اکبر بھی ---- کاش اگر اکبر دیکھ سکتا ---- کاش اگر میں اکبر کو اس کی آنکھوں سے دکھا سکتی ---- آہ! پر یہ ضرور ہوگا اور جشن ہی کے روز ---- دو تارے ---- وہی دو تارے ---- مگر ایک دہکتا اور جگمگاتا ہوا ---- اور دوسرا ٹوٹ کر بجھا ہوا ---- اور کون جانے!

آہستہ سے زمین پر بیٹھ جاتی ہے۔ اور سر جھکا کر ایک گہری سوچ میں کھو سی جاتی ہے۔

(انارکلی)

سوالات

۱۔ مختصر جواب دیجیے۔

(الف) اکبرِ اعظم کی زندگی کا سب سے بڑا خواب کیا تھا؟

(ب) "مگر وہ اپنے ہم عصروں سے کچھ مختلف تو نہیں ہے"۔ یہ جملہ مہارانی نے کس کے بارے میں کہا اور اکبر نے کیا جواب دیا؟

(ج) اکبرِ اعظم نے حرم سرا کے جشن کا اہتمام کس کے سپرد کیا اور کیوں؟

(د) اکبرِ اعظم اور مہارانی نے حرم سرا کے جشن میں انارکلی کی شرکت کو کیسے یقینی بنایا؟

(ہ) اکبرِ اعظم کو دلارام کا رقص کیوں ناگوار خاطر ہوا؟

۲ ڈراما نگار نے ڈرامے کے اس منظر میں مختلف کرداروں کی ذہنی کشمکش سے ایک عجیب فضا پیدا کی ہے۔ مختصر بحث کیجیے۔

۳۔ ڈراما "انارکلی" سے شامل نصاب اقتباس پڑھنے کے بعد مغل شہنشاہ اکبرِ اعظم کے کردار کی جو تصویر آپ کے ذہن میں ابھرتی ہے، اسے اختصار سے بیان کیجیے۔

○☆○☆○☆○☆○☆○

سعادت حسن منٹو

(۱۹۱۳ء - ۱۹۵۵ء)

تماشا

دو تین روز سے طیارے سیاہ عقابوں کی طرح پر پھیلائے خاموش فضا میں منڈلا رہے تھے جیسے وہ کسی شکار کی جستجو میں ہوں۔ سرخ آندھیاں وقتاً فوقتاً کسی آنے والے خونی حادثے کا پیغام لا رہی تھیں۔ سنسان بازاروں میں مسلح پولیس کی گشت ایک عجیب ہیبت ناک سماں پیش کر رہی تھی۔ وہ بازار جو صبح سے کچھ عرصہ پہلے لوگوں کے ہجوم سے پُر ہوا کرتے تھے، اب کسی نامعلوم خوف کی وجہ سے سُونے پڑے تھے۔ شہر کی فضا پر پُراسرار خاموشی مسلط تھی۔ بھیانک خوف راج کر رہا تھا۔

خالد گھر کی خاموشی و پر سکون فضا سے سہا ہوا اپنے والد کے قریب بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔

"ابا آپ مجھے سکول کیوں نہیں جانے دیتے؟"

"بیٹا آج سکول میں ----چھُٹی ہے"۔

"ماسٹر صاحب نے ہمیں بتایا ہی نہیں۔ وہ تو کل کہہ رہے تھے کہ جو لڑکا آج سکول کا کام ختم کر کے اپنی کاپی نہ دکھائے گا اسے سخت سزا دی جائے گی!۔"

"وہ اطلاع دینی بھول گئے ہوں گے۔"

"آپ کے دفتر میں بھی چھٹی ہوگی؟"

"ہاں ہمارا بھی آج دفتر بند ہے۔"

"چلو اچھا ہوا۔ آج میں آپ سے کوئی اچھی سی کہانی سنوں گا۔"

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ تین طیارے چیختے ہوئے ان کے سر پر سے گزر گئے۔ خالد ان کو دیکھ کر بہت خوف زدہ ہوا۔ وہ تین چار روز سے ان طیاروں کی پرواز

کو بغور دیکھ رہا تھا۔ مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا تھا۔ وہ حیران تھا کہ یہ جہاز سارا دن دھوپ میں کیوں چکر لگاتے رہتے ہیں۔ وہ ان کی روزانہ نقل و حرکت سے تنگ آکر بولا:

"ابا مجھے ان جہازوں سے سخت خوف معلوم ہو رہا ہے۔ آپ ان کے چلانے والوں سے کہہ دیں کہ وہ ہمارے گھر پر سے نہ گزرا کریں۔"

"خوف! ـــــ کہیں پاگل تو نہیں ہو گئے خالد۔"

"ابا یہ جہاز بہت خوفناک ہیں۔ آپ نہیں جانتے یہ کسی نہ کسی روز ہمارے گھر پر گولہ پھینک دیں گے ـــــ کل صبح ماما امی جان سے کہہ رہی تھی کہ ان جہاز والوں کے پاس بہت سے گولے ہیں۔ اگر انھوں نے اس قسم کی کوئی شرارت کی تو یاد رکھیں میرے پاس بھی ایک بندوق ہے ـــــ وہی جو آپ نے پچھلی عید پر مجھے دی تھی۔"

خالد کا باپ اپنے لڑکے کی غیر معمولی جسارت پر ہنسا: "ماما تو پاگل ہے میں اس سے دریافت کروں گا کہ وہ گھر میں ایسی باتیں کیوں کرتی ہے ـــــ اطمینان رکھو وہ ایسی بات ہرگز نہیں کریں گے۔"

اپنے والد سے رخصت ہو کر خالد اپنے کمرے میں چلا گیا اور ہوائی بندوق نکال کر نشانہ لگانے کی مشق کرنے لگا۔ تاکہ اس روز جب ہوائی جہاز والے گولے پھینکیں تو اس کا نشانہ خطا نہ جائے اور وہ پوری طرح انتقام لے سکے ـــــ کاش! انتقام کا یہی ننھا جذبہ ہر شخص میں تقسیم ہو جائے۔

اسی عرصے میں جب کہ ایک ننھا بچہ اپنے انتقام لینے کی فکر میں ڈوبا ہوا طرح طرح کے منصوبے باندھ رہا تھا۔ گھر کے دوسرے حصے میں خالد کا باپ اپنی بیوی کے پاس بیٹھا ہوا ماما کو ہدایت کر رہا تھا کہ وہ آئندہ گھر میں اس قسم کی کوئی بات نہ کرے جس سے خالد کو دہشت ہو۔

ماما اور بیوی کو اسی قسم کی مزید ہدایات دے کر وہ ابھی بڑے دروازے سے باہر جا رہا تھا کہ خادم ایک دہشت ناک خبر لایا کہ شہر کے لوگ بادشاہ کے منع کرنے پر

بھی شام کے قریب ایک عام جلسہ کرنے والے ہیں اور یہ توقع کی جاتی ہے کہ کوئی نہ کوئی واقعہ ضرور پیش آکر رہے گا۔

خالد کا باپ یہ خبر سن کر بہت خوف زدہ ہوا۔ اب اسے یقین ہو گیا کہ فضا میں غیر معمولی سکون' طیاروں کی پرواز' بازاروں میں مسلح پولیس کی گشت' لوگوں کے چہروں پر اداسی کا عالم اور خونی آندھیوں کی آمد کسی خوفناک حادثہ کے پیش خیمہ تھے۔

وہ حادثہ کس نوعیت کا ہو گا؟ ----یہ خالد کے باپ کی طرح کسی کو بھی معلوم نہ تھا۔ مگر پھر بھی سارا شہر کسی نامعلوم خوف میں لپٹا ہوا تھا۔

باہر جانے کے خیال کو ملتوی کر کے خالد کا باپ ابھی کپڑے تبدیل کرنے بھی نہ پایا تھا کہ طیاروں کا شور بلند ہوا۔ وہ سہم گیا----اسے ایسا معلوم ہوا۔ جیسے سیکڑوں انسان ہم آہنگ آواز میں درد کی شدت سے کراہ رہے ہیں۔

خالد طیاروں کا شور غل سن کر اپنی ہوائی بندوق سنبھالتا ہوا کمرے سے باہر دوڑا آیا اور انھیں غور سے دیکھنے لگا تاکہ وہ جس وقت گولہ پھینکنے لگیں تو وہ اپنی ہوائی بندوق کی مدد سے انھیں نیچے گرا دے----اس وقت چھ سال کے بچے کے چہرے پر آہنی ارادہ واستقلال کے آثار نمایاں تھے۔ جو کم حقیقت بندوق کا کھلونا ہاتھ میں تھامے ایک جری سپاہی کو شرمندہ کر رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ آج اس چیز کو جو اسے عرصے سے خوف زدہ کر رہی تھی مٹانے پر تُلا ہوا ہے۔

خالد کے دیکھتے دیکھتے ایک جہاز سے کچھ چیز گری' جو کاغذ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کے مشابہ تھی۔ گرتے ہی یہ ٹکڑے ہوا میں پتنگوں کی طرح اڑنے لگے۔ ان میں سے چند خالد کے مکان کی بالائی چھت پر بھی گرے۔

خالد بھاگا ہوا اوپر گیا اور کاغذ اٹھا لایا۔

"اباجی ---- ماما سچ مچ جھوٹ بک رہی تھی۔ جہاز والوں نے تو گولوں کی بجائے یہ کاغذ پھینکے ہیں۔"

خالد کے باپ نے وہ کاغذ لیکر پڑھنا شروع کیا تو رنگ زرد ہو گیا۔ ہونے

والے حادثے کی تصویر اب اسے عیاں طور پر نظر آنے لگی۔ اس اشتہار میں صاف لکھا تھا کہ بادشاہ کسی جلسہ کرنے کی اجازت نہیں دیتا اور اگر اس کی مرضی کے خلاف کوئی جلسہ کیا گیا تو نتائج کی ذمے دار خود رعایا ہوگی۔

اپنے والد کو اشتہار پڑھنے کے بعد اس قدر حیران و پریشان دیکھ کر خالد نے گھبراتے ہوئے کہا: "اس کاغذ میں یہ تو نہیں لکھا کہ وہ ہمارے گھر پر گولے پھینکیں گے؟"

"خالد اس وقت تم جاؤ!۔ جاؤ اپنی بندوق کے ساتھ کھیلو!"

"مگر اس پر لکھا کیا ہے؟"

"لکھا ہے آج شام کو ایک تماشا ہوگا۔"

خالد کے باپ نے گفتگو کو مزید طول دینے کے خوف سے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔

"تماشا ہوگا! ـــــ پھر تو ہم بھی چلیں گے نا!۔"

"کیا کہا؟"

"کیا اس تماشے میں آپ مجھے نہ لے چلیں گے؟"

"لے چلیں گے! ـــــ اب جاؤ جاکر کھیلو۔"

"کہاں کھیلوں؟ ـــــ بازار میں آپ جانے نہیں دیتے" ماما مجھ سے کھیلتی نہیں، میرا ہم جماعت طفیل بھی تو آج کل یہاں نہیں آتا۔ اب میں کھیلوں تو کس سے کھیلوں؟ ـــــ شام کے وقت تماشا دیکھنے تو ضرور چلیں گے نا؟"

خالد کسی جواب کا انتظار کیے بغیر کمرے سے باہر چلا گیا اور مختلف کمروں میں آوارہ پھرتا ہوا اپنے والد کی نشست گاہ میں پہنچا۔ جس کی کھڑکیاں بازار کی طرف کھلتی تھیں۔ کھڑکی کے قریب بیٹھ کر وہ بازار کی طرف جھانکنے لگا۔

کیا دیکھتا ہے کہ بازار میں دکانیں تو بند ہیں مگر آمدورفت جاری ہے ـــــ

لوگ جلسے میں شریک ہونے کے لیے جا رہے تھے۔ وہ سخت حیران تھا کہ دو تین روز سے دکانیں کیوں بند رہتی ہیں۔ اس مسئلہ کے حل کے لیے اس نے اپنے ننھے دماغ پر بہتیرا زور دیا مگر کوئی نتیجہ بر آمد نہ کر سکا۔

بہت غور و فکر کے بعد اس نے یہ سوچا کہ لوگوں نے وہ تماشا دیکھنے کی خاطر جس کے اشتہار جہاز بانٹ رہے تھے' دکانیں بند کر رکھی ہیں۔ اب اس نے خیال کیا کہ وہ کوئی نہایت ہی دلچسپ تماشا ہو گا۔ جس کے لیے تمام بازار بند ہیں۔ اس خیال نے خالد کو سخت بے چین کر دیا اور وہ اس وقت کا نہایت بے قراری سے انتظار کرنے لگا جب اس کا ابا اسے تماشا دکھلانے کو لے چلے۔

وقت گزرتا گیا ـــــــ وہ خونی گھڑی قریب تر آتی گئی۔

سہ پہر کا وقت تھا۔ خالد' اس کا باپ اور والدہ صحن میں خاموش بیٹھے ایک دوسرے کی طرف خاموش نگاہوں سے تک رہے تھے۔ ہوا سسکیاں بھرتی ہوئی چل رہی تھی۔

تڑ۔ تڑ۔ تڑ۔ تڑ ---------

یہ آواز سنتے ہی خالد کے باپ کے چہرے کا رنگ کاغذ کی طرح سفید ہو گیا۔ زبان سے بمشکل اس قدر کہہ سکا "ـــــ گولی ــــ"

خالد کی ماں فرط خوف سے ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکال سکی۔ گولی کا نام سنتے ہی اسے ایسے معلوم ہوا' جیسے خود اس کی چھاتی سے گولی اتر رہی ہے۔

خالد اس آواز کو سنتے ہی اپنے والد کی انگلی پکڑ کر کہنے لگا:

"ابا جی چلو چلیں! تماشا تو شروع ہو گیا ہے!"

"کونسا تماشا؟" خالد کے باپ نے اپنے خوف کو چھپاتے ہوئے کہا۔

"وہی تماشا جس کے اشتہار آج صبح جہاز بانٹ رہے تھے۔ کھیل شروع ہو گیا ہے تبھی تو اتنے پٹاخوں کی آواز سنائی دے رہی ہے۔"

"ابھی بہت وقت باقی ہے، تم شور مت کرو ---- خدا کے لیے اب جاؤ، ماما کے پاس جاکر کھیلو!"

خالد یہ سنتے ہی باورچی خانے کی طرف گیا مگر وہاں ماما کو نہ پاکر اپنے والد کی نشست گاہ میں چلا گیا اور کھڑکی سے بازار کی طرف دیکھنے لگا۔

بازار آمدورفت بند ہو جانے کی وجہ سے سائیں سائیں کر رہا تھا۔ دور فاصلے سے کتوں کی دردناک چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ چند لمحات کے بعد ان چیخوں میں انسان کی دردناک آواز بھی شامل ہو گئی۔

خالد کسی کو کراہتے سن کر بہت حیران ہوا۔ ابھی وہ اس آواز کی جستجو کے لیے کوشش ہی کر رہا تھا کہ چوک میں اسے ایک لڑکا دکھائی دیا جو چیختا چلاتا بھاگتا چلا آ رہا تھا۔

خالد کے گھر کے عین مقابل وہ لڑکا لڑکھڑا کر گرا اور گرتے ہی بے ہوش ہو گیا ---- اس کی پنڈلی پر ایک زخم تھا، جس سے فوارہ خون نکل رہا تھا۔

یہ سماں دیکھ کر خالد بہت خوف زدہ ہوا۔ بھاگ کر اپنے والد کے پاس آیا اور کہنے لگا: "ابا! بازار میں ایک لڑکا گرا پڑا ہے ---- اس کی ٹانگ سے بہت خون نکل رہا ہے"۔

یہ سنتے ہی خالد کا باپ کھڑکی کی طرف گیا اور دیکھا کہ واقعی ایک نوجوان لڑکا بازار میں اوندھے منہ پڑا ہے۔

بادشاہ کے خوف سے اسے جرأت نہ ہوئی کہ اس لڑکے کو سڑک پر سے اٹھا کر سامنے والی دکان کے پٹڑے پر لٹا دے ---- بے ساز و برگ افراد کو اٹھانے کے لیے حکومت کے ارباب حل وعقد نے آہنی گاڑیاں مہیا کر رکھی ہیں۔ مگر اس معصوم بچے کی نعش جو ان ہی کی تیغِ ستم کا شکار تھی، وہ ننھا پودا جو انہی کے ہاتھوں مسلا گیا تھا، وہ کونپل جو کھلنے سے پہلے انہی کی عطا کردہ بادِ سموم سے جھلس گئی تھی۔ کسی کے دل کی راحت جو انہی کے جَور و اِستبداد نے چھین لی تھی۔ اب انہی کی تیار کردہ سڑک پر ---- آہ! موت بھیانک ہے، مگر ظلم اس سے کہیں زیادہ خوفناک اور بھیانک ہے۔

"ابّا اس لڑکے کو کسی نے پیٹا ہے؟"

خالد کا باپ اثبات میں سر ہلاتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔

جب خالد اکیلا کمرے میں رہ گیا تو سوچنے لگا کہ اس لڑکے کو اتنے بڑے زخم سے کتنی تکلیف ہوئی ہوگی۔ جبکہ ایک دفعہ اسے قلم تراش کی نوک چبھنے سے تمام رات نیند نہ آئی تھی اور اس کا باپ اور ماں تمام رات اس کے سرہانے بیٹھے رہے تھے۔ اس خیال کے آتے ہی اسے ایسا معلوم ہونے لگا کہ وہ زخم خود اس کی پنڈلی میں ہے اور اس میں شدت کا درد ہے ـــــ تب وہ رونے لگ گیا۔

اس کے رونے کی آواز سن کر اس کی والدہ دوڑی آئی اور اسے گود میں لے کر پوچھنے لگی: "میرے بچے رو کیوں رہے ہو؟"

"امی اس لڑکے کو کسی نے مارا ہے؟"

"شرارت کی ہوگی اس نے؟"

خالد کی والدہ اپنے خاوند کی زبانی زخمی لڑکے کی داستان سن چکی تھی۔

"مگر سکول میں تو شرارت کرنے پر چھڑی سے سزا دیتے ہیں۔ لہو تو نہیں نکالتے۔"

خالد نے روتے ہوئے اپنی والدہ سے کہا۔

"چھڑی زور سے لگ گئی ہوگی؟"

"تو پھر کیا اس لڑکے کا والد سکول میں جاکر استاد پر خفا نہ ہوگا، جس نے اس کے لڑکے کو اس قدر مارا ہے۔ ایک روز جب ماسٹر صاحب نے میرے کان کھینچ کر سرخ کر دیے تھے تو ابا جی نے ہیڈ ماسٹر کے پاس جاکر شکایت کی تھی نا؟"

"اس لڑکے کا ماسٹر بہت بڑا آدمی ہے۔"

"اللہ میاں سے بھی بڑا؟"

"نہیں ان سے چھوٹا ہے۔"

"تو پھر وہ اللہ میاں کے پاس شکایت کرے گا۔"

"خالد اب دیر ہو گئی ہے۔ چلو سوئیں"۔

"اللہ میاں! میں دعا کرتا ہوں کہ تو اس ماسٹر کو جس نے اس لڑکے کو پیٹا ہے، اچھی طرح سزا دے اور اس چھڑی کو چھین لے، جس کے استعمال سے خون نکل آتا ہے ---- میں نے پہاڑے یاد نہیں کیے اس لیے مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہی چھڑی میرے استاد کے ہاتھ نہ آجائے ---- اگر تم نے میری باتیں نہ مانیں تو پھر میں بھی تم سے نہ بولوں گا۔"

سوتے وقت خالد دل میں دعا مانگ رہا تھا۔

(آتش پارے)

سوالات

۱۔ شہر کی فضا پر کئی روز سے پُراَسرار خاموشی کیوں مُسلّط تھی؟

۲۔ ہوائی جہاز سے پھینکے گئے اشتہاروں میں کیا درج تھا جسے پڑھ کر خالد کے باپ کا رنگ زرد پڑ گیا؟

۳۔ خالد تماشا دیکھنے سے کیوں محروم رہا؟

۴۔ ننھے خالد کے دل میں انتقام کا جذبہ کیسے پیدا ہوا؟

۵۔ ننھے خالد نے سڑک پر پڑے زخمی لڑکے کو دیکھ کر کیوں رونا شروع کر دیا؟

۶۔ معصوم خالد سوتے وقت اللہ میاں سے کیا دعا مانگ رہا تھا؟

۷۔ اس افسانے کا خلاصہ اپنے لفظوں میں تحریر کیجیے۔

۸۔ حُبِ وَطن کے موضوع پر ایک جامع مضمون لکھیے۔

○☆○☆○☆○☆○☆○

خواجہ حسن نظامی

(۱۸۷۳ء - ۱۹۵۵ء)

یہ بھنبھناتا ہوا ننھا سا پرندہ آپ کو بہت ستاتا ہے۔ رات کی نیند حرام کر دی ہے۔ ہندو، مسلمان، عیسائی، یہودی سب بالاتفاق اس سے ناراض ہیں۔ ہر روز اس کے مقابلے کے لیے مہمیں تیار ہوتی ہیں، جنگ کے نقشے بنائے جاتے ہیں مگر مچھروں کے جنرل کے سامنے کسی کی نہیں چلتی۔ شکست پر شکست ہوئی چلی جاتی ہے اور مچھروں کا لشکر بڑھا چلا آتا ہے۔

اتنے بڑے ڈیل ڈول کا انسان ذرا سے بُھنگے پر قابو نہیں پا سکتا۔ طرح طرح کے مسالے بھی بناتا ہے کہ ان کی بُو سے مچھر بھاگ جائیں لیکن مچھر اپنی یُورش سے باز نہیں آتے۔ آتے ہیں اور نعرے لگاتے ہوئے آتے ہیں۔ بے چارہ آدم زاد حیران رہ جاتا ہے اور کسی طرح ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

امیر، غریب، ادنیٰ، اعلیٰ، بچے، بوڑھے، عورت، مرد کوئی اس کے وار سے محفوظ نہیں۔ یہاں تک کہ آدمی کے پاس رہنے والے جانوروں کو بھی ان کے ہاتھ سے ایذا ہے۔ مچھر جانتا ہے کہ دشمن کے دوست بھی دشمن ہوتے ہیں۔ ان جانوروں نے میرے دشمن کی اطاعت کی ہے تو میں ان کو بھی مزا چکھاؤں گا۔

آدمیوں نے مچھروں کے خلاف ایجی ٹیشن کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ ہر شخص اپنی سمجھ اور عقل کے موافق مچھروں پر الزام رکھ کر لوگوں میں ان کے خلاف جوش پیدا کرنا چاہتا ہے مگر مچھر اس کی کچھ پروا نہیں کرتا۔

طاعون نے گڑبڑ مچائی تو انسان نے کہا کہ طاعون مچھر اور پسّو کے ذریعے سے پھیلتا ہے۔ ان کو فنا کر دیا جائے تو یہ ہولناک وبا دور ہو جائے گی۔ ملیریا پھیلا تو اس کا الزام بھی مچھر پر عائد ہوا۔ اس سرے سے اس سرے تک کالے گورے آدمی غل

مچانے لگے کہ مچھروں کو مٹا دو، مچھروں کو کچل ڈالو، مچھروں کو تہس نہس کر دو اور ایسی تدبیریں نکالیں جن سے مچھروں کی نسل ہی منقطع ہو جائے۔

مچھر بھی یہ سب باتیں دیکھ رہا تھا اور سن رہا تھا اور رات کو ڈاکٹر صاحب کی میز پر رکھے ہوئے "پانیئر" کو آکر دیکھتا اور اپنی برائی کے حروف پر بیٹھ کر اس میں خون کی ننھی ننھی بوندیں ڈال جاتا جو انسان کے جسم سے یا خود ڈاکٹر صاحب کے جسم سے چوس کر لایا تھا۔ گویا اپنے فائدے کی تحریر سے انسان کی ان تحریروں پر شوخیانہ ریمارک لکھ جاتا کہ میاں تم میرا کچھ بھی نہیں کر سکتے۔

انسان کہتا ہے کہ مچھر بڑا کم ذات ہے۔ کوڑے کرکٹ، میل کچیل سے پیدا ہوتا ہے اور گندی موریوں میں زندگی بسر کرتا ہے۔ اور بزدلی تو دیکھو اس وقت حملہ کرتا ہے جب کہ ہم سو جاتے ہیں۔ سوتے پر وار کرنا، بے خبر کے چرکے لگانا مردانگی نہیں، انتہا درجے کی کمینگی ہے۔ صورت تو دیکھو کالا بُھتنا، لمبے لمبے پاؤں، بے ڈول چہرہ، اس شان و شوکت کا وجود اور آدمی جیسے گورے چٹے، خوش وضع، پیاری ادا کی دشمنی۔ بے عقلی اور جہالت اسی کو کہتے ہیں۔

مچھر کی سنو تو وہ آدمی کو کھری کھری سناتا ہے اور کہتا ہے کہ جناب ہمت ہے تو مقابلہ کیجئے۔ ذات صفات نہ دیکھئے۔ میں کالا سہی، بدرونق سہی، نیچ ذات اور کمینہ سہی مگر یہ تو کہیے کہ کس دلیری سے آپ کا مُقابَلہ کرتا ہوں اور کیونکر آپ کی ناک میں دَم کرتا ہوں۔

یہ الزام سراسر غلط ہے کہ بے خبری میں آتا ہوں اور سوتے میں ستاتا ہوں۔ یہ تو تم اپنی عادت کے موافق سراسر ناانصافی کرتے ہو۔ حضرت میں تو کان میں آکر اُلٹی میٹم دے دیتا ہوں کہ ہوشیار ہو جاؤ، اب حملہ ہوتا ہے۔ تم ہی غافل رہو تو میرا کیا قصور۔ زمانہ خود فیصلہ کر دے گا کہ میدان جنگ میں کالا بُھتنا لمبے لمبے پاؤں والا بے ڈول فتح یاب ہوتا ہے یا گورا چٹا آن بان والا۔

میرے کارناموں کی شاید تم کو خبر نہیں کہ میں نے اس پردۂ دنیا پر کیا کیا جوہر دکھائے ہیں۔ اپنے بھائی نمرود کا قصہ بھول گئے جو خدائی کا دعوٰی کرتا تھا اور اپنے

سامنے کسی کی حقیقت نہ سمجھتا تھا۔ کس نے اس کا غرور توڑا؟ کون اس پر غالب آیا؟ کس کے سبب اس کی خدائی خاک میں ملی؟ اگر آپ نہ جانتے ہوں تو اپنے ہی کسی بھائی سے دریافت کیجیے یا مجھ سے سُنیے کہ میرے ہی ایک بھائی مچھر نے اس سرکش کا خاتمہ کیا تھا۔

اور تم تو ناحق بگڑتے ہو اور خواہ مخواہ اپنا دشمن تصور کیے لیتے ہو۔ میں تمھارا مخالف نہیں ہوں۔ اگر تم کو یقین نہ آئے تو اپنے کسی شب بیدار صوفی بھائی سے دریافت کر لو، دیکھو وہ میری شان میں کیا کہے گا۔ کل ایک شاہ صاحب عالمِ ذوق میں اپنے ایک مرید سے فرما رہے تھے کہ میں مچھر کی زندگی کو دل سے پسند کرتا ہوں۔ دن بھر بے چارہ خلوت خانہ میں رہتا ہے۔ رات کو جو خدا کی یاد کا وقت ہے باہر نکلتا ہے اور پھر تمام شب تسبیح و تقدیس کے ترانے گایا کرتا ہے۔ آدمی غفلت میں پڑے سوتے ہیں تو اس کو ان پر غصہ آتا ہے۔ چاہتا ہے کہ یہ بھی بیدار ہو کر اپنے مالک کے دیے ہوئے اس سہانے خاموش وقت کی قدر کریں اور حمد و شکر کے گیت گائیں۔ اس لیے پہلے ان کے کان میں جا کر کہتا ہے اٹھو میاں اٹھو، جاگو جاگنے کا وقت ہے۔ سونے کا اور ہمیشہ سونے کا وقت ابھی نہیں آیا۔ جب آئے گا تو بے فکر ہو کر سونا۔ اب تو ہوشیار رہنے اور کچھ کام کرنے کا موقع ہے۔ مگر انسان اس سریلی نصیحت کی پروا نہیں کرتا اور سوتا رہتا ہے تو مجبور ہو کر غصہ میں آجاتا ہے اور اس کے چہرے اور ہاتھ پاؤں پر ڈنک مارتا ہے۔ پر واہ رے انسان آنکھیں بند کیے ہوئے ہاتھ پاؤں مارتا ہے اور بے ہوشی میں بدن کو کھجا کر پھر سو جاتا ہے۔ اور جب دن کو بیدار ہوتا ہے تو بے چارہ مچھر کو صلواتیں سناتا ہے کہ رات بھر سونے نہیں دیا۔ کوئی اس دروغ گو سے پوچھے کہ جنابِ عالی! کئے سیکنڈ جاگے تھے جو ساری رات جاگتے رہنے کا شکوہ ہو رہا ہے۔

شاہ صاحب کی زبان سے یہ عارفانہ کلمات سن کر میرے دل کو بھی تسلی ہوئی کہ غنیمت ہے ان آدمیوں میں بھی انصاف والے موجود ہیں بلکہ میں دل میں شرمایا کہ کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے کہ شاہ صاحب مصلے پر بیٹھے وظیفہ پڑھا کرتے ہیں اور میں ان کے پیروں کا خون پیا کرتا ہوں۔ یہ تو میری نسبت ایسی اچھی اور نیک رائے دیں اور میں ان کو تکلیف دوں۔ اگرچہ دل نے یہ سمجھایا کہ تو کاٹتا تھوڑی ہے قدم چومتا ہے

اور ان بزرگوں کے قدم چومنے ہی کے قابل ہوتے ہیں۔ لیکن اصل یہ ہے کہ اس سے میری ندامت دور نہیں ہوتی اور اب تک میرے دل میں اس کا افسوس باقی ہے۔

(سیپارۂ دل)

سوالات

۱۔ ”حضرت، میں تو کان میں آکر اُلٹی میٹم دے دیتا ہوں“۔ خواجہ حسن نظامی کے مضمون ”مچھر“ کی روشنی میں اس جملے کی وضاحت کیجیے۔

۲۔ نمرود کا، جس نے خدائی کا دعوٰی کیا تھا، مچھر نے کیسے خاتمہ کیا؟

۳۔ ایک شب بیدار صوفی نے عالمِ ذوق میں اپنے مرید سے مچھر کے بارے میں کیا ارشاد فرمایا؟

۴۔ مچھر کے دل میں حضرتِ انسان کے بارے میں کس قسم کا افسوس باقی ہے؟

۵۔ حضرتِ انسان مچھر سے بیزار کیوں رہتا ہے اور اس سے نفرت کیوں کرتا ہے؟

۶۔ اس مضمون کا خلاصہ اپنے لفظوں میں تحریر کیجیے۔

۷۔ درج ذیل اقتباس کی سیاق و سباق کے حوالے سے تشریح کیجیے۔

شاہ صاحب کی زبان سے ------------ اس کا افسوس باقی ہے۔

○☆○☆○☆○☆○☆○

شفیع عقیل

(ولادت: ۱۹۳۰ء)

چُغل خور

اگلے وقتوں کی بات ہے کسی گاؤں میں ایک چغل خور رہتا تھا۔ دوسروں کی چغلی کھانا اور ایک کی بات دوسرے سے کرنا اس کی عادت تھی اور لاکھ کوشش کے باوجود وہ اپنی عادت کو نہ چھوڑ سکا تھا۔ اس نے بارہا اس بات کا ارادہ کیا کہ اب کسی سے کسی کی چغلی نہیں کھائے گا، ایک کی بات دوسرے سے نہیں کہے گا لیکن ہر بار وہ اپنے اس ارادے میں ناکام ہو جاتا۔ دراصل وہ اپنی عادت سے مجبور تھا اور اسی عادت کی وجہ سے اسے اپنی ملازمت سے بھی ہاتھ دھونا پڑے تھے، چنانچہ وہ بیکار تھا۔ اس نے دوسری ملازمت کی بہتیری کوشش کی مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ کچھ دن تک تو وہ اپنی جمع پونجی پر گزر بسر کرتا رہا لیکن جب تھوڑا تھوڑا کر کے اس کا سارا سرمایہ ختم ہو گیا تو بہت پریشان ہوا۔ اس نے نوکری اور مزدوری کے لیے سرتوڑ کوشش شروع کر دی کہ کہیں فاقوں کی نوبت نہ آجائے۔ مختلف لوگوں سے کہا، در در کی خاک چھانی، ایک ایک کے پاس گیا مگر مصیبت یہ تھی کہ چغل خور ہونے کی وجہ سے اسے کوئی بھی اپنے پاس ملازم رکھنے پر تیار نہ ہوتا تھا۔ گاؤں کے تمام لوگ اس سے اچھی طرح واقف تھے اور اس کی چغلی کھانے کی عادت کے بارے میں جانتے تھے، اس لیے اسے کوئی بھی منہ نہ لگاتا تھا۔ آخر جب وہ مسلسل ناکامیوں سے تنگ آگیا اور نوبت واقعی فاقوں تک آپہنچی تو اس نے دل میں سوچا: "اس گاؤں کو چھوڑ دینا چاہیے اور کہیں اور چل کر قسمت آزمائی کرنی چاہیے۔"

چنانچہ اس نے تھوڑا بہت ضروری سامان لیا اور گاؤں چھوڑ کر سفر پر روانہ ہو گیا تاکہ کسی دوسرے گاؤں یا شہر میں جا کر محنت مزدوری کرے۔

چلتے چلاتے وہ ایک اور گاؤں میں جا پہنچا۔ یہ گاؤں اس کے لیے نیا تھا اور اسے وہاں کوئی نہیں جانتا تھا، اس لیے اسے امید تھی کہ یہاں نوکری مل جائے گی، لہٰذا

وہ ایک کسان کے پاس گیا اور اس سے کہا: "مجھے آپ اپنی ملازمت میں رکھ لیں"۔

کسان نے اس سے دریافت کیا: "تم کیا کام کر سکتے ہو؟"

چغل خور نے جواب دیا: "مجھے کھیتی باڑی کا سارا کام آتا ہے۔ یہ کام میں اچھی طرح کر سکتا ہوں۔"

اتفاق کی بات یہ کہ وہ کسان اکیلا تھا اور کھیتوں کے کام کاج میں اس کا ہاتھ بٹانے والا کوئی نہ تھا۔ اسے ایک ملازم کی ضرورت بھی تھی اس لیے اس نے سوچا' چلو اسے ہی ملازم رکھ لیتا ہوں۔ یہ بھی ضرورت مند ہے اور میرا بھی کام ہلکا ہو جائے گا۔ یہی سوچ کر اس نے چغل خور سے پوچھا: "اگر میں تمھیں اپنے پاس ملازم رکھ لوں تو تم کیا تنخواہ لو گے؟"

اس پر چغل خور نے بڑے اطمینان سے جواب دیا: "کچھ نہیں! میری کوئی تنخواہ نہیں ہے۔"

کسان کو اس کی بات سن کر بڑا تعجب ہوا کہ کام کرے گا اور تنخواہ نہیں لے گا۔ بھلا یہ کیوں کر ہو سکتا ہے۔ اس نے حیرانی سے کہا: "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

جواب میں چغل خور کہنے لگا: "آپ مجھے صرف روٹی کپڑا دے دیں اور اس کے ساتھ ایک بات کی اجازت! بس یہی میری تنخواہ ہے۔"

کسان پوچھنے لگا: "کس بات کی اجازت؟"

چغل خور بولا: "آپ مجھے صرف اتنی اجازت دے دیں کہ میں چھے ماہ کے بعد آپ کی صرف ایک چغلی کھالیا کروں۔"

چغل خور کی یہ بات تو اپنی جگہ بڑی عجیب تھی لیکن کسان نے اپنے دل میں سوچا: "مفت کا نوکر مل رہا ہے' خالی روٹی کپڑے میں کیا برا ہے؟" پھر اس نے اپنے آپ کو آمادہ کرنے کے لیے کہا: "چھے ماہ بعد ایک چغلی کھاتا ہے تو کھالے' میرا کیا جاتا ہے؟ یہ کسی سے میری چغلی کھا کر میرا کیا بگاڑ لے گا؟ میرے پاس کون سے راز ہیں جو ظاہر ہو جائیں گے"؟

"مجھے تمھاری یہ شرط منظور ہے۔"

چنانچہ چغل خور کسان کے پاس ملازم ہو گیا۔ وہ کام بھی اسی کا کرتا تھا اور اسی کے گھر میں رہتا بھی تھا۔ روزانہ صبح سویرے کسان کے ساتھ کھیتوں میں چلا جاتا، بیلوں کے لیے چارا کاٹتا، ہل چلاتا، گاہی کرتا اور اس طرح کام میں کسان کا برابر کا ہاتھ بٹاتا تھا۔

دن گزرتے گئے اور کسان کو یہ بات بھی بھول گئی کہ چھے ماہ بعد چغل خور نے ایک چغلی کھانے کی اجازت مانگی تھی اور اس نے چغلی کھانے کی اجازت دے دی تھی۔ کسان اس عرصہ میں یہ تمام باتیں بھول چکا تھا۔

ادھر چغل خور کو کسان کے ہاں ملازم ہوئے چھے ماہ بیت چکے تھے اور اب اس کا دل چاہ رہا تھا کہ کسی سے کسان کی کوئی چغلی کھائے۔ وہ چھے ماہ سے اب تک اپنی اس عادت پر جبر کیے ہوئے تھا مگر اب معاہدے کی مدت ختم ہونے پر اپنے آپ پر قابو پانا اس کے بس میں نہ تھا۔ چنانچہ جب وہ اپنی عادت سے بالکل مجبور ہو گیا تو اس نے سوچا، اب چاہے کچھ ہو میں کسان کی چغلی ضرور کھاؤں گا اور اب تو معاہدے کے مطابق میرا حق بھی ہے۔

ایک روز کسان حسبِ معمول اپنے کھیتوں میں گیا ہوا تھا اور گھر میں اس کی بیوی اکیلی تھی۔ یہ دیکھ کر چغل خور کسان کی بیوی کے پاس گیا اور بڑا ہمدرد بنتے ہوئے کہنے لگا: "اگر تم برا نہ مانو تو میں تم سے ایک بات کہوں؟"

کسان کی بیوی بولی: "ضرور کہو! اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے؟"

چغل خور اور بھی زیادہ ہمدردی جتاتے ہوئے بولا: "اس میں تمھارا ہی بھلا ہے۔"

یہ سن کر کسان کی بیوی کو کچھ شک سا ہو گیا۔ اس نے دل میں سوچا، ہو نہ ہو کوئی خاص بات ضرور ہے۔ یہی خیال کر کے وہ کہنے لگی: "پھر تو ضرور کہو! وہ کیا بات ہے؟"

جواب میں چغل خور بڑے راز دارانہ انداز میں بولا: "دراصل کسان کوڑھی ہو گیا ہے۔ اس نے اپنی یہ بیماری اب تک تم سے چھپائے رکھی ہے۔"

"کوڑھی ہو گیا ہے؟" کسان کی بیوی نے چونک کر پوچھا۔

اسے بڑا تعجب ہوا۔ یہ بات اس کے لیے جس قدر نئی تھی اس سے کہیں زیادہ حیران کن بھی تھی۔

چغل خور نے جب اپنا تیر نشانے پر بیٹھتا دیکھا تو بولا: "اگر تمہیں یقین نہ آئے تو آزما کے دیکھ لو۔"

اب تو کسان کی بیوی بھی سوچ میں پڑ گئی۔ اس نے دل میں سوچا' ہو سکتا ہے ملازم ٹھیک ہی کہ رہا ہو۔ بھلا اس کو مجھ سے ایسا جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟ لٰہذا اس نے جلدی سے پوچھا: "مگر میں کیسے آزماؤں؟"

چغل خور جھٹ سے کہنے لگا: "اس میں کیا مشکل ہے۔"

پھر اس نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا: "جو آدمی کوڑھی ہو جائے اس کا جسم نمکین ہو جاتا ہے اگر تم یہ جاننا چاہتی ہو کہ کسان کوڑھی ہو گیا ہے یا نہیں تو کسان کے جسم کو زبان سے چاٹ کر دیکھ سکتی ہو۔"

کسان کی بیوی کو چغل خور کی یہ تجویز پسند آئی۔ اس نے سوچا' اس سے نوکر کے جھوٹ سچ کا پتا چل جائے گا۔ اس نے کہا: "اچھا! کل جب میں کسان کا کھانا لے کر کھیتوں میں جاؤں گی تو کسان کے جسم کو چاٹ کر ضرور دیکھوں گی۔"

چغل خور کسان کی بیوی سے یہ باتیں کر کے سیدھا کھیتوں کی طرف چل دیا۔ جہاں کسان پہلے ہی سے کھیتی باڑی کے کاموں میں لگا ہوا تھا۔ دراصل ان دنوں فصل پک چکی تھی جس کی وجہ سے کسان دو روز سے اپنے گھر نہیں گیا تھا۔ اسے رات کو بھی کھیتوں ہی میں رہنا پڑتا تھا۔ چغل خور کسان کے پاس پہنچا اور اس سے بڑی رازداری سے کہنے لگا: "تم ادھر کھیتوں میں کام کرتے پھر رہے ہو اور ادھر تمھاری بیوی پاگل ہو گئی ہے۔"

کسان بڑا خیران ہوا۔ اس نے تعجّب سے پوچھا: "یہ تم کیا کہ رہے ہو؟"

چغل خور نے اسے یقین دلاتے ہوئے کہا: "میں سچ کہ رہا ہوں۔ وہ تو پاگل پن میں آدمیوں کو کاٹنے دوڑتی ہے"۔

کسان سارا کام کاج چھوڑ کر سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے اپنے دل میں سوچا' نوکر ٹھیک ہی کہ رہا ہوگا' بھلا اسے اس قسم کا جھوٹ بولنے کی کیا پڑی ہے۔ ہو سکتا ہے میری بیوی واقعی پاگل ہو گئی ہو۔ چغل خور نے جب کسان کو اس طرح شش و پنج میں مبتلا دیکھا تو بولا: "اگر تمھیں میری بات پر یقین نہیں تو کل جب وہ کھانا لے کر آئے اس وقت دیکھ لینا"

اس پر کسان کہنے لگا: "ہاں! یہ ٹھیک ہے۔ آج رات تو مجھے کھیتوں ہی میں رہنا ہے کل جب وہ کھانا لے کر آئے گی تو دیکھ لوں گے۔"

چغل خور نے جب یہ جان لیا کہ کسان اس کی باتوں میں آگیا ہے تو وہاں سے چلا آیا اور کسان کے سالوں کے پاس پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے ان سے کہا: "تم لوگ یہاں مزے کر رہے ہیں اور تمھارا بہنوئی تمھاری بہن کو روز مار مار کر ادھ موا کر دیتا ہے۔ وہ اسے اس ظالمانہ طریقے سے مارتا ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتا"۔

کسان کے سالوں نے چغل خور کی یہ بات سنی تو بہت پریشان ہوئے۔ لیکن انھوں نے اس سے کہا: "مگر ہماری بہن نے تو ہمیں یہ کبھی نہیں بتایا؟"

اس پر چغل خور بولا: "وہ بیچاری شرم کے مارے تمھیں کچھ نہیں بتاتی ورنہ اسے تو کسان اس بری طرح مارتا پیٹتا ہے کہ وہ ہلکان ہو جاتی ہے۔ کھیتوں میں سب کے سامنے اس کی بے عزتی کرتا ہے۔"

لیکن ہم تمھاری بات پر کیسے یقین کر لیں؟"

اس پر چغل خور جھٹ سے بول پڑا: "اگر تم لوگ یہ سمجھ رہے ہو کہ میں جھوٹ کہ رہا ہوں تو کل دوپہر کو جب تمھاری بہن کھانا لے کر کھیتوں میں جائے گی' اس وقت تم خود اپنی آنکھوں سے دیکھنا' کسان اسے کس طرح مارتا ہے۔"

کسان کے سالے یہ بات سن کر غصے میں تلملانے لگے۔ بھلا وہ اپنی بہن کی بے عزتی کیسے برداشت کر سکتے تھے۔ انھوں نے چغل خور سے کہا: "اچھا کل ہم کھیت میں چھپ کر یہ سب کچھ آنکھوں سے دیکھیں گے۔"

چغل خور وہاں سے رخصت ہو کر سیدھا کسان کے بھائیوں کے پاس گیا اور ان سے جا کر کہا: "بڑے افسوس کی بات ہے۔ تم لوگ سب ایک ماں کے بیٹے ہو اور پھر بھی اپنے بھائی کی مدد نہیں کر سکتے۔"

کسان کے بھائیوں نے اس سے تعجُّب سے پوچھا: "کیا ہُوا؟ یہ تم کیا کہ رہے ہو؟ ہم کس کی مدد نہیں کرتے؟"

اس پر چغل خور نے روہانسا منہ بنا کر جواب دیا: "تمھارا بھائی سخت مصیبت میں گرفتار ہے، اس کے سالے ہر چوتھے روز آ کر اسے زدوکوب کرتے ہیں اور ایک تم ہو کہ تمھیں اس کی خبر تک نہیں۔ کسان کے بھائی یہ سن کر پریشان سے ہو گئے اور کہنے لگے: "مگر ہمارے بھائی نے تو کچھ نہیں بتایا۔"

چغل خور بولا: "وہ تم سے کیا کہے؟ بیچارہ اپنی شرافت کی وجہ سے کچھ نہیں کہتا اور خاموشی سے یہ بے عزتی برداشت کر لیتا ہے۔"

جواب میں بھائی کہنے لگے: "ہمیں تو تمھاری بات پر یقین نہیں آرہا۔۔۔!"

یہ سن کر چغل خور نے کہا: "اگر تم لوگوں کو میری بات کا یقین نہیں تو کل دوپہر کو آ کر اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھ لینا کہ کس طرح کسان کے سالے اسے مارتے ہیں۔"

کسان کے بھائی غصے میں تلملانے لگے۔ انھوں نے کہا: "اچھا! ہم کل دیکھ لیں گے وہ ہمارے بھائی کو کس طرح ہاتھ لگاتے ہیں۔ ابھی ہم مرے نہیں۔"

اس طرح چغل خور سب لوگوں سے یہ باتیں کہ کر واپس آ گیا اور اپنے کام کاج میں وہ اس طرح آ کر مصروف ہو گیا کہ کسی کو کانوں کان اس بات کی خبر نہ ہوئی کہ کہاں گیا تھا اور کہاں سے آیا ہے۔

دوسرے روز دوپہر کو جب کسان کی بیوی کھانا لے کر کھیتوں میں آئی تو کسان نے کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بڑی احتیاط سے اس کی ہر حرکت کا جائزہ لے رہا تھا کیوں کہ اس کے دل میں تھا کہ کہیں پاگل ہونے کی وجہ سے وہ اسے کاٹ نہ کھائے۔ اسی لیے وہ اس کے قریب ہونے سے ڈرتا تھا۔ دوسری طرف کسان کی بیوی کی یہ کوشش تھی کہ کسان کسی طرح اس کے قریب ہو اور وہ اس کو کاٹ کر یا اسے زبان لگا کر دیکھ سکے کہ نمکین ہے یا نہیں۔ جونہی وہ چھاچھ کا مٹکا اور روٹیوں کی چنگیری زمین پر رکھ کر بیٹھی، کسان جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ یہ دیکھ کر اس کی بیوی بھی روٹیوں کی چنگیری آگے بڑھانے کے بہانے سے قدرے آگے سرک آئی اور پھر جونہی کسان نے روٹی پکڑنے کو ہاتھ آگے بڑھایا، اس نے جھپٹ کر اس کی کلائی پکڑ لی اور اسے چاٹنے کے لیے منہ آگے بڑھایا۔ کسان اچھل کر دور ہٹ گیا۔ اب تو اسے پکا یقین ہو گیا تھا کہ واقعی اس کی بیوی پاگل ہو گئی ہے اور کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔

کسان کو نوکر کی کہی ہوئی بات سچ معلوم ہو رہی تھی۔ ادھر اس کی بیوی نے جب یہ دیکھا کہ کسان اسے جسم چاٹ کر دیکھنے نہیں دے رہا تو اسے اس بات کا یقین ہو گیا کہ کسان واقعی کوڑھی ہو گیا ہے اور نوکر ٹھیک کہہ رہا تھا۔

اس نے ایک بار پھر آگے بڑھ کر کسان کی کلائی پکڑنے کی کوشش کی۔ یہ دیکھ کر کسان نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، پاؤں سے جوتا اتار کر وہیں بیوی کی ٹھکائی شروع کر دی۔ جونہی اس نے بیوی پر جوتے برسانے شروع کیے، قریب ہی کھیت میں چھپے ہوئے کسان کے سالے باہر نکل آئے:

"واقعی نوکر ٹھیک کہہ رہا تھا۔"

ان کے سامنے ان کی بہن کی پٹائی ہو رہی تھی بھلا پھر وہ کیوں نہ یقین کرتے۔ وہ سارے کے سارے للکارتے ہوئے آگے بڑھے اور کسان پر ٹوٹ پڑے:

"آج دیکھتے ہیں، تم ہماری بہن کو کس طرح مارتے ہو؟"

ان کا آگے بڑھنا تھا کہ دوسرے کھیت میں چھپے ہوئے کسان کے بھائیوں نے

دیکھا:

"واقعی نوکر نے ہمیں صحیح اطلاع دی تھی۔"

انھوں نے جواب میں کسان کے سالوں کو للکارا: "آج دیکھتے ہیں، تم ہمارے بھائی کو کس طرح مارتے ہو؟"

اور اس کے بعد وہ سب ایک دوسرے پر پل پڑے۔ وہ سر پھٹول ہوئی، وہ لاٹھیاں چلیں کہ سب خون میں نہا گئے۔ آخر ارد گرد کے کھیتوں میں کام کرنے والے دوسرے لوگ بھاگ کر آئے اور انھوں نے بیچ بچاؤ کرا کے انھیں ایک دوسرے سے الگ کیا۔ پھر جب ان سب کا غصہ قدرے کم ہوا تو ان سے لوگوں نے پوچھا: "تم لوگ اس طرح کیوں لڑ رہے تھے؟"

اس پر سب نے اپنی اپنی بات بتائی کہ یوں نوکر ہمارے پاس آیا تھا اور اس نے یہ یہ بتایا تھا اس طرح جب سب اپنی بات بتا چکے تو پتا چلا کہ:

یہ سب کچھ چغل خور کا کیا دھرا ہے۔

وہ سارے کے سارے مل کر چغل خور کی تلاش میں چلے لیکن اس وقت تک چغل خور وہ گاؤں چھوڑ کر کہیں اور جا چکا تھا۔

کہتے ہیں وہ دن اور آج کا دن، چغل خور کا کہیں پتا نہ چل سکا۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی کوئی چغل خور یہ نہیں مانتا کہ وہ چغل خور ہے۔ دراصل اسے اس بات کا ڈر ہے کہ اگر اس نے یہ بات تسلیم کر لی کہ وہ چغل خور ہے تو کسان، اس کے سالے اور اس کے بھائی اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ اسی لیے ہر چغل خور، چغل خور کہنے پر ناراض ہو جاتا ہے۔

(پنجابی لوک داستانیں)

سوالات

۱۔ لوک داستان سے کیا مراد ہے؟

۲۔ کسان نے چغل خور کو اپنے ہاں کن شرائط پر ملازم رکھا؟

۳۔ کسان کی بیوی نے چغل خور کی بات کا کیسے اعتبار کر لیا؟

۴۔ چغل خور نے کسان کی بیوی کے بھائیوں سے کیا چغلی کھائی؟

۵۔ چغل خور نے کسان کے بھائیوں سے کیا کہا اور وہ کس طرح اس کے جھانسے میں آ گئے؟

۶۔ اس لوک داستان سے آپ کیا نتیجہ اخذ کرتے ہیں؟

۷۔ اس سبق کا خلاصہ اپنے الفاظ میں تحریر کیجیے۔

۸۔ حُرُوف وہ غیر مستقل الفاظ ہیں جو تنہا بولنے یا لکھنے میں کوئی معنی نہیں رکھتے بلکہ مستقل الفاظ کے باہمی ربط کے کام آتے ہیں جیسے:

نمازی مسجد میں ہے۔ اس جملے میں لفظوں کا تَعَلُّق "میں" کی وجہ سے ہے، اگر یہ نہ ہو تو جملہ بے جوڑ اور مہمل ہو جائے اور "میں" حرف ہے۔

قَواعد کی رو سے حروف کی کئی قسمیں ہیں مثلاً: حُروفِ ربط، حُروفِ عِلَّت، حُروفِ عَطف، حُروفِ اِستثنا، حُروفِ تخصیص، حُروفِ فجائیہ، حُروفِ ندائیہ، حُروفِ تشبیہ وغیرہ۔

اس سبق میں سے مندرجہ ذیل حُرُوف کا استعمال تلاش کیجیے:

یا، نہ، ورنہ، چاہے، خواہ، تو، اگر، مگر، جبکہ، کہ، کیونکہ، صرف، بلکہ، ہی نہیں، بلکہ، اگرچہ، لیکن، چونکہ، اس لیے کہ، جو، جوں جوں، توں توں، جیسے جیسے، ویسے ویسے، جو، تو، اگر، تو یا ایسے جملے بنائیے جن میں یہ حُرُوف استعمال ہوں۔

○☆○☆○☆○☆○☆○

پروفیسر انور رومان (مترجم)

(ولادت: ۱۹۲۵ء)

بہادر خان کی سرگذشت

بہادر خان ایک کھاتا پیتا کسان تھا۔ بارش نہ ہونے کی صورت میں بھی وہ کاریز کے پانی کی مدد سے اپنے کھیتوں میں اتنی سیرابی کر لیتا تھا کہ نہ صرف اپنے لیے سال بھر کے غلے کا خرچ پورا کر لیتا بلکہ اپنے ہمسایوں اور غریب غربا کی مدد بھی کر دیتا۔ جب کاریزوں میں پانی تھوڑا ہوتا تو بھی اس کو کسی دوسرے زمیندار کی مزارعت نہ کرنا پڑتی تھی۔ اس کی اس معاشی آزادی کی وجہ سے اس میں کافی خودداری تھی اور اس کی بانٹ چونٹ کر کھانے کی عادت نے اردگرد میں اسے کافی نیک نامی دے رکھی تھی۔ لہٰذا اس کی شادی نہایت آسانی اور دھوم دھام سے ہوئی۔ شادی سے پہلے وہ اپنے کھیتوں اور فصلوں کی پرورش میں بے حد محنت کرتا تھا۔ گندم کے خوشوں کے لیے وہ ایک حریص باپ سے کم نہ تھا۔ وہ ایک ایک خوشے کو گنتا تھا، اس کے لیے دعا مانگتا تھا اور اسے جانتا تھا۔ جب سبز خوشے اناج سے بھر کر سنہری ہو جاتے تھے اور اپنے سر ایک طرف کو جھکا لیتے تھے تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہتی تھی۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ ان خوشوں کو اپنے وجود کا احساس ہے، یہ اپنے مالک کو جانتے اور پہچانتے ہیں، ان میں زندگی کی مسرتیں اور قہقہے ملفوف ہیں اور جو ان سے پیار کرتا ہے، یہ اس کے سامنے سر جھکا دیتے ہیں اور ایک ایک کی جگہ دو دو پھوٹتے ہیں۔

شادی کے بعد اس کے معمول میں تھوڑا سا فرق آنا لازمی تھا۔ شادی سے پہلے اسے پسند نہ تھا کہ کوئی اور اس کے کھیتوں کے ان خوشوں کو چھو بھی لے۔ ان سے اس کی محبت بڑی خود غرض، والہانہ اور حاسدانہ تھی۔ لیکن جب شادی ہو گئی تو وہ سوچنے لگا کہ بونے کاٹنے کے لیے ایک نوکر رکھ لے۔ یہ نوکر بھی اسے اس کی منشا کے مطابق مل گیا۔ وہ ہر وقت کھیتوں سے فالتو گھاس اور کائی وغیرہ صاف کرتا، وقت پر پانی دیتا، بیلوں کو چارا ڈالتا اور فصلوں کی خاطر تواضع میں لگا رہتا تھا۔ بس تھوڑے

تھوڑے وقفے کے بعد وہ حقے کے دو چار کش لگاتا تھا۔ یہی اس کی عیاشی تھی اور پھر جن کی طرح کام کرتا تھا۔ خدا کے فضل سے ان دنوں بارش خوب ہوئی اور بہادر خان کے بنجر کھیت بھی پانی سے بھر گئے۔ نوکر نے ان کھیتوں میں بھی گندم بو دی جو چند ماہ بعد پک کر تیار ہو گئی۔ بہادر خان نے جب پوری گندم کو کٹوایا اور خاردار جھاڑیوں کے پاس جوہان[1] لگوا دیا تو گاؤں کے سب لوگ، راہ گیر اور اردگرد کے دیہات کے باشندے اسے دیکھنے آتے اور اسے کہتے کہ بہادر خان! تو بہت اونچے ستارے والا ہے، تجھے بیوی بھی سلیقے والی ملی ہے اور تیرا نوکر بھی اچھے شگون والا ہے۔ وہ خود اس وسیع انبار کو آنکھ بھر کر دیکھتا تو سر سے پیر تک ایک خاموش قہقہہ بن جاتا۔ لیکن کچھ خوف، کچھ نامعلوم ڈر، کچھ بے نام سے شکوک اس کے دل و دماغ میں رینگتے۔ وہ سوچتا جب غریب آدمی باسی ٹکڑوں کو ترستا ہے تو وہ کسی کے لیے خطرہ نہیں ہوتا۔ لیکن جونہی اسے دو وقت کی روٹی میسر آنے لگتی ہے وہ خطرہ بن جاتا ہے اور جب اس کا گھر بھر جائے تو پھر وہ زمین اور آسمان کی ساری طاقتوں کے درپے ہو جاتا ہے۔

چنانچہ اس نے اپنی بیوی سے کہا کہ وہ خود بھی نوکر کے ہمراہ جوہان[1] کے پاس ٹھہرا کرے گا مبادا نوکر کی نیت خراب ہو جائے یا قزاق ہی اسے لوٹ لیں۔ بیوی نے اس سے اتفاق کیا۔ بہادر خان اور نوکر وہیں رہنے لگے۔ بیوی ہر صبح اور شام ان کا کھانا وہاں دے آتی۔ اسی طرح کئی روز گزر گئے۔ حتیٰ کہ ایک شام جب اس کی بیوی آندھی چلنے کی وجہ سے کھانا وقت سے پہلے دے کر جا چکی تھی، اس کا ایک دُور کا سیال[2] وہیں کھیت میں اس کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ اس کے چچا زاد بھائی لشکران کی شادی تھی جس پر وہ بلاوا لے کر آیا تھا۔ بہادر خان نے سوچا کہ ایسے مواقع بار بار تھوڑی آتے ہیں۔ چنانچہ اس نے بلاوے پر جانا منظور کر لیا۔ اس کی جیب میں سو روپیہ تھا جو شادی کے لیے کافی تھا۔ اس نے نوکر کو سمجھا دیا کہ وہ انبار کی حفاظت کرتا رہے اور اس کے جانے کی بابت کسی سے ذکر نہ کرے مبادا چور اچکے اسے تنہا سمجھ کر اس پر پل پڑیں اور گھر سے جو روٹی آئے وہ کھا لیا کرے۔ اس کے بعد بہادر خان اپنے سیال کے ساتھ

۱۔ کھلیان

۲۔ رشتہ دار

روانہ ہو گیا۔

نوکر ایک زبردست چلم کشوک تھا اور خصوصاً فرصت کے اوقات میں تو وہ اپنے حُقّے سے ایک لمحہ بھی جدا نہ ہوتا تھا۔ اس نے اِدھر اُدھر سے خَس و خاشاک جمع کر کے آگ سلگائی۔ اگرچہ وہ کافی فاصلے پر جھاڑیوں کے وسط میں بیٹھا تھا تاہم ایک غضبناک بگولے نے اس آگ کے کچھ انگارے اٹھا کر جوہان میں پھینک دیے۔ جوہان کو آناً "فاناً" آگ لگ گئی تو نوکر گندم کو بچانے کے لیے دوڑا لیکن وہ خود بھی آگ کی بل کھاتی ہوئی لپٹوں کی نذر ہو گیا۔ اگلی صبح بہادر خان کی بیوی روٹی لے کر جو آئی تو اس نے دیکھا کہ بہادر خان جوہان سمیت جل گیا تھا۔ وہ روتی پیٹتی واپس آگئی اور اپنے سیالوں کو بتایا۔ وہ جلے ہوئے نوکر کو بہادر خان سمجھ کر کھاٹ پر ڈال کر لے گئے اور ایک قبرستان میں دفن کر آئے۔

چند دن بعد بہادر خان اپنی سیال داریوں سے خلاصی پا کر اپنے گھر کو واپس ہوا اور نیم شب کے قریب گھر پہنچا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کی بیوی ماتم کر رہی ہے اور رو رہی ہے۔ بیوی نے اسے دیکھ لیا اور سمجھی کہ اس کا شوہر مردہ سے زندہ ہو کر واپس آیا ہے تاکہ اسے بھی اپنے ساتھ لے جائے۔ پس اس نے ایک چیخ ماری اور سارے تومان[1] کو بتانے کے لیے باہر بھاگی۔ ہر شخص کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔ بہت سے پہاڑوں میں چھپ گئے۔ کچھ نے اپنے کندھوں پر اپنی اپنی بندوقیں رکھ لیں۔ کچھ نے بغلوں میں تلواریں لٹکا لیں اور سینوں پر ڈھال جما لیے اور بہت سوں نے ڈنڈے سنبھال لیے اور "جوانو' پکڑ لو' جانے نہ پائے" کہہ کر بے چارے بہادر خان کا تعاقب کرنے لگے۔ بہادر خاں چار و ناچار بھوکا اور پیاسا ایک قبرستان میں شب بسری کے لیے چھپ گیا اور تارے گن گن کر صبح کا انتظار کرنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر لوگوں نے اسے بھوت پریت کیوں سمجھا۔ شاید اس لیے کہ وہ رات کے وقت اپنے گھر پہنچا تھا۔ بہر حال اسے یقین تھا کہ اس کے لوگ صبح کو اس کو پہچان لیں گے۔ اسی امید پر اس نے رات مُردوں کے قریب گزار دی۔

---

[1] قبیلہ

صبح صبح وہ زور کی بھوک کے مارے اپنے گاؤں میں پھر داخل ہوا۔ اس نے دیکھا کہ مسجد میں مُلّا اذان کہنے کے لیے اپنے ہاتھ کانوں تک اٹھائے ہوئے تھا۔ بہادر خان نے کہا: "اے مُلّا میں بھوکا ہوں۔" مُلّا نے اپنا منہ اس کی طرف موڑا اور بہادر خان کو دیکھ کر اتنا خوفزدہ ہو گیا کہ بے ہوش ہو کر گر پڑا اور زمین پر لوٹ کر مر گیا اور لوگ یہ دیکھ کر اپنے اپنے گھروں میں چھپ گئے۔ بہادر خان کو اس سبب سے پھر قبرستان میں لوٹنا پڑا۔ تھوڑے عرصے کے بعد لوگ مُلّا کو قبرستان لائے اور اسے دفن کر دیا۔ ان کے پاس آپس میں تقسیم کرنے کے لیے کھجوریں تھیں۔ مُلّا کے باپ نے پوچھا: "انھیں کتنے آدمیوں میں تقسیم کرنا ہے۔" کسی نے جواب دیا: "سو آدمیوں میں۔" عین اس وقت بہادر خان نے بھوک سے بے تاب ہو کر ایک قبر کے عقب سے نعرہ لگایا: "سو آدمیوں کو دے دو لیکن پہلے میرا حصہ دو۔" بہادر خان کی آواز سن کر لوگوں نے کھجوریں اور کھاٹ وہیں چھوڑے، بلکہ بہت سوں کی جوتیاں بھی رہ گئیں اور وہ سر توڑ بھاگے۔ کچھ چیختے چلاتے پہاڑوں میں چھپ گئے اور کچھ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگتے جاتے تھے اور پیچھے دیکھتے جاتے تھے۔ بہادر خان کے خوف کی وجہ سے وہ گھروں میں پہنچ گئے اور توبہ کی کہ وہ اپنے گھروں سے باہر نہیں نکلیں گے۔ بہادر خان نے سب لوگوں کو بھاگتے دیکھ کر مونچھوں کو تاؤ دیا اور کھجوریں کھانے لگا۔ اس نے دل میں کہا: "میرے خدا میں نے کیا گناہ کیا ہے، میرے گاؤں کے لوگ مجھے مردہ سمجھتے ہیں اور مجھ سے روپوشی اختیار کرتے ہیں، میری بیوی میرے سائے سے بھی گریز کرتی ہے۔"

آدھی رات کے قریب، جبکہ بہادر خان ایک قبر کے عقب میں بیٹھا قسمت کو کوستے کوستے اونگھ رہا تھا، ایک سیاہ پوش خوفناک سا انسان قبرستان میں داخل ہوا اور سیدھا مُلّا کی قبر پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہاں کھڑے ہو کر اس نے کچھ پڑھا۔ قبر شق ہو گئی اور مُلّا کی لاش گھٹنوں تک باہر آ گئی۔ بہادر خان سمجھ گیا کہ یہ کوئی جادوگر ہے جو تازہ لاشوں پر اپنے جادو کے تجربے کرتا ہے۔ چنانچہ اس نے سوچا کہ وہ جادوگر کو پکڑ کر اس سے جادو سیکھ لے۔ اس خیال سے وہ ٹکڑے ٹکڑے [1] جادوگر کے پیچھے آیا اور پھر

---

[1] چپکے چپکے

یکبارگی لپک کر اس نے اسے قابو کر لیا۔ جادوگر چلایا: "مجھے چھوڑ دو۔" بہادر خان نے کہا: "مجھے اپنا عجیب وغریب سحر سکھاؤ تو چھوڑوں گا۔" جادوگر نے کہا: "مجھے چھوڑ دو تو میں سکھادوں گا۔" آخر بہادر خان نے لیت ولعل کے بعد اسے چھوڑ دیا۔ جادوگر نے فوراً کوئی منتر پھونکا کہ بہادر خان جدھر جائے مُلّا بھی اس کے پیچھے پیچھے ادھر ہی جائے۔ جادوگر تو اس کے بعد غائب ہو گیا لیکن ملا سائے کی طرح بہادر خان کے ساتھ چپک گیا۔ وہ جدھر جاتا، ملا بھی اس کے پیچھے پیچھے جاتا۔ بہادر خان نے سوچا: "میں نے اپنے اوپر ایک اور عذاب مُسَلَّط کر لیا کہ میں جدھر جاتا ہوں مُلّا بھی ادھر ہی جاتا ہے۔ لوگ مجھے دیکھ دیکھ کر ڈر رہے ہیں کہ میں نے مردہ مُلّا کو زندہ کر دیا ہے۔"

ایک دفعہ بہادر خان بھوکا تھا۔ اس نے سوچا کہ میں فلاں فلاں پالیز[1] میں چلتا ہوں جو قریب ہی ہے، وہاں سے کچھ خربوزے اور تربوز چرا کر کھاتا ہوں۔ چنانچہ وہ روانہ ہوا لیکن اس نے دیکھا کہ ملا بھی آرہا ہے۔ اس نے کہا: "او مُلّا! خدا سے ڈرو اور میرا پیچھا چھوڑ دو۔ لوگ تو مجھ سے پہلے ہی بھاگتے ہیں۔ تمھیں دیکھ کر اور بھی خوفزدہ ہو جاتے ہیں۔" مُلّا یہ سن کر تھوڑا سا ٹھٹکا لیکن جونہی بہادر خان چلنے لگا مُلّا بھی اس کے پیچھے ہو لیا۔ بہادر خان نے مُلّا کی خوب مرمت کی لیکن اس کے باوجود مُلّا بہادر خان کے پیچھے لگا رہا۔ بہادر خان نے دوسری دفعہ، تیسری دفعہ اسے خوب زدوکوب کیا لیکن مُلّا پر کوئی اثر نہ ہوا۔ پھر غصے سے بیتاب ہو کر اس نے مُلّا کو گھسیٹنا شروع کیا اور قبرستان میں واپس لا کر اسی کھاٹ سے باندھ دیا جس پر مُلّا کی لاش آئی تھی اور کہنے لگا: "اب چلو تو میں تمھیں دیکھوں گا۔" اس کے بعد وہ روانہ ہوا۔

مُلّا نے جب دیکھا کہ بہادر خان جا رہا ہے تو اس نے زور لگایا اور ایک جھٹکے سے کھاٹ سمیت کھٹ کھٹ، کھٹ کرتا ہوا بہادر خان کے پیچھے چلا۔ بہادر خان نے دیکھا کہ مُلّا بہت تیزی سے اس کے تعاقب میں آرہا ہے تو اس نے پیچ وتاب کھایا اور اسے خوب مارا لیکن سخت جان مُلّا پر مار کٹائی کا کوئی اثر نہ ہوا۔ بہادر خان ناچار ہو کر کھیت میں گیا، جہاں پانی دینے کے لیے ایک بڑا آبی چرخہ نصب تھا، وہاں مُلّا کو کھاٹ

---

[1] باغ

سمیت کھڑا کر کے اس نے کہا: "تم ذرا یہاں ٹھہرو، میں کچھ خربوزے اور تربوز چرا لاؤں میں تمھیں بھی دوں گا اور کچھ میں بھی کھاؤں گا۔" وہ چلا لیکن ملا بھی حرکت میں آگیا۔ بہادر خان نے جوش میں آکر اسے پھر مارنا شروع کیا لیکن ملّا ڈھٹائی سے کھڑا رہا۔ آخر بہادر خان نے مُلّا کو کھاٹ سمیت آبی چرخے سے مضبوط طریقے سے باندھ دیا اور خود لمبے لمبے ڈگ بھرتا تیزی سے پالیز میں داخل ہو گیا۔ مُلّا نے بہادر خان کو جاتے دیکھ کر زور مارا اور ایک زبردست جھٹکا دے کر چرخہ اور کھاٹ سمیت گڑ گگ، گڑ گگ کرتا ہوا اس کے پیچھے روانہ ہوا۔ بہادر خان نے دیکھا تو اس نے کہا: "تیرا خانہ خراب میرا پیچھا چھوڑ دے، خدا سے ڈر۔" یہ کہ کر اس نے مُلّا کو خوب مارا اور آگے چلا۔ ملا بھی پیچھے پیچھے چلا۔ بہادر خان نے کہا: "بدبخت میں بھوکا ہوں، مجھے تنہا چھوڑ دے، میں کچھ خربوزے اور تربوز چرا لاؤں اور ہم دونوں کھائیں گے، یہیں کھڑا رہ۔" لیکن مُلّا کو سکون کہاں تھا۔ وہ آسیب کی طرح اس کے پیچھے رہا۔ بہادر خان نے اسے پھر مارا اور پھر جھاڑیوں میں چھپتا ہوا پالیز میں پہنچا۔ مُلّا بھی گڑ گگ، گڑ گگ کرتا ہوا پیچھے آیا۔ بہادر خان نے جلدی جلدی کچھ خربوزے توڑے۔ پالیز دان[1] نے دیکھا کہ بہادر خان اور مُلّا گڑ گگ، گڑ گگ کرتے ہوئے خربوزے توڑ رہے ہیں تو وہ چیختا ہوا بھاگا اور لوگوں کو بتانے لگا کہ بہادر خان اور مُلّا ہر طرف دندناتے پھر رہے ہیں اور شہریوں اور غریبوں کا مال بزور ہتھیا رہے ہیں۔ لوگ اور بھی خوفزدہ ہو گئے۔

ایک دن بہادر خان نے دور سے دیکھا کہ ایک آدمی بیل پر بیٹھا ہوا روٹی کھاتا آ رہا ہے۔ چنانچہ وہ اس کی طرف چلا اور اس سے کہا: "بندہ خدا! مجھے روٹی دو، میں بھوکا ہوں۔" بیل سوار نے بہادر خان اور ملا کو دیکھا تو وہ وحشت زدہ ہو کر بیل سے گرا اور تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ بہادر خان نے روٹی لے لی اور دونوں اسے کھاتے ہوئے واپس قبرستان آگئے۔

کچھ دن بعد گاؤں کے رئیس کی پوشاک غلیظ ہوئی تو اس نے اپنے دھوبی سے کہا، میرے کپڑے ندی پر لے جاؤ اور صاف کر لاؤ۔ دھوبی نے کہا: "حضور! بہادر خان

---

[1] ۔ مالی

مع مُلّا زندہ ہو گیا ہے اور دونوں چرخہ اور کھاٹ سمیت ادھر ادھر دندناتے پھرتے ہیں، مجھے ڈر ہے کہ کہیں مجھے ندی پر دیکھ لیں اور پکڑ کر مار نہ دیں، اس لیے میں نہیں جاؤں گا۔" رئیس نے کہا: "میں تمھاری حفاظت کے لیے تین مسلح سوار بھیج دیتا ہوں۔"

اس پر دھوبی رضا مند ہو گیا اس نے کپڑے لیے اور سواروں کی معیت میں اپنے گدھے پر بیٹھ کر ندی پر آیا۔ سواروں نے اپنے گھوڑے رسیوں سے مضبوط باندھ دیے اور دھوبی کی پہرہ داری کرتے رہے۔ دریں اثناء بہادر خان کو پیاس لگی اور وہ ندی کی طرف چلا۔ اس کے پیچھے ملا بھی گڑ گگ گڑ گگ کرنے لگا۔ بہادر خان نے کہا: "اے مُلّا کیوں ظلم کرتے ہو، خدا سے ڈرو اور یہیں ٹھہرو تاکہ میں پانی پی آؤں، میں ابھی تمھارے پاس لوٹ آؤں گا۔" لیکن کم بخت مُلّا تو بے دھڑک تھا اس کے قدم کہاں رکتے تھے۔ آخر کار بہادر خان نے اُسترا نکال کر ملا کے بال صاف کر دیے۔ اس کے بعد وہ ندی پر آیا اور جھک کر پانی پینے لگا۔ ملا بھی گڑ گگ گڑ گگ کرتا ہوا وہیں آدھمکا۔ دھوبی کی نگاہ جو اس پر پڑی تو وہ چلایا: "سپاہیو! بہادر خان مع ملا آگیا ہے۔" سپاہیوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ وہ بے لگام گھوڑوں پر چڑھے۔ دھوبی نے کپڑے وہیں چھوڑ دیے اور گدھے پر بیٹھ کر لٹھ مار مار کر اسے گاؤں کی طرف ہانکنے لگا تاکہ جلد از جلد گاؤں والوں کو خبردار کرے۔ سواروں نے گھوڑوں کے یکے بعد دیگرے چابک مارے۔ انھوں نے گھوڑوں کی گردن کے رسے تو کھول دیے تھے لیکن گھبراہٹ میں ایڑیوں کے رسے کھولنا بھول گئے تھے۔ اس وجہ سے گھوڑے ان رسوں اور میخوں کی وجہ سے دوڑتے گر گئے۔ سپاہی انھیں مار رہے تھے اور اس بھاگڑ میں میخیں اکھڑ اکھڑ کر ان کے سروں پر لگ رہی تھیں۔ حتیٰ کہ ان کے سر، چہرے اور کان لہولہان ہو گئے۔ اسی طرح ہوتے ہوتے ان میں سے دو مر گئے اور صرف ایک زندہ واپس آیا۔ رئیس کو اپنی کہانی سنائی اور اپنے زخم دکھائے۔ دھوبی نے توبہ کی کہ وہ پھر کبھی باہر نہ جائے گا۔

بہادر خان نے یہ سب کچھ دیکھا تو وہ سوچنے لگا: "یا خدایا! میں کیا کروں، ندی میں ڈوب مروں یا پتھروں سے اپنا سر پھوڑ لوں، میں اپنے عزیز و اقارب کے لیے

بیگانہ ہو گیا ہوں۔ میرے اپنے تمن ا کے لوگ مجھ سے گریزاں ہیں اور یہ مُلّا کم بخت ایک آسیب کی طرح مجھ سے چمٹا ہوا ہے۔ کاش! میں اس شادی پر نہ گیا ہوتا!" وہ اسی طرح سوچتے سوچتے قبرستان واپس آگیا۔ اس کے لیے وقت کاٹنا دوبھر ہو گیا۔ ایک ایک لمحہ' ایک ایک پہاڑ بن گیا۔ اس کے دماغ میں رینگتا ہوا ہر خیال اس کی رگوں میں کانٹے کی طرح چبھنے لگا۔ "آخر اس نے کونسا گناہ کیا تھا جس کی پاداش میں وہ اس مصیبت میں پھنس گیا اور مصیبت جب شروع ہوئی تو اس کی کوئی انتہا ہی نظر نہ آتی تھی۔" وہ اسی طرح نہ جانے کب تک اور کیا کیا سوچتا رہا۔ آدھی رات کے وقت جادوگر پھر قبرستان میں آیا۔ وہ اسے پکڑنے کے لیے لپکا۔ مُلّا بھی اس کے پیچھے چلا۔ بہادر خان نے کہا: "او شوم! ذرا صبر کر" اور وہ تیز تیز چلتا ہوا جادوگر کے پیچھے پہنچا اور لپک کر اسے پکڑ لیا اور کہنے لگا: "میں تمھیں ہرگز زندہ نہ چھوڑوں گا اگر تم نے ملا کو مجھ سے علیحدہ نہ کیا۔" جادوگر نے بہت لیت و لعل کیا لیکن بہادر خان ڈٹا رہا اور کہنے لگا: "اس دفعہ کوئی رعایت نہ ہوگی۔ مُلّا کو فوراً قبر میں واپس کر دو۔" چنانچہ جادوگر نے مُلّا کو دوبارہ اس کی قبر میں ڈال دیا اور خود قبرستان سے چلا گیا۔

اب بہادر خان اپنے ان سیالوں کی طرف چلا جن کی شادی میں وہ گیا تھا۔ اس نے ان سے سب کچھ کہا اور درخواست کی: "میرے گاؤں والے مجھے مردہ سمجھتے ہیں اس لیے میرے ساتھ چلو اور انھیں بتا دو کہ تمھاری شادی میں آیا تھا۔" چنانچہ وہ اسے لے کر بہادر خان کے گاؤں آئے۔ لوگ اسے دیکھنے کے لیے باہر نکلے۔ اس کے سیال نے رئیس' بہادر خان کی بیوی اور اس کے دوسرے رشتہ داروں کو بلایا اور سمجھایا کہ جسے تم مردہ سمجھتے ہو وہ تو اس کا نوکر تھا۔ بہادر خان تو اس دن شادی میں گیا ہوا تھا۔ وہ سمجھا کر واپس چلا گیا۔ لوگ بہادر خان سے خوش ہو گئے اور وفور مسرت سے ناچ ناچ کر پکارنے لگے: "نن کھتان' چھتان' ناسلامابسون" یعنی ہم نے حاصل کر لیا' ہم آزاد ہو گئے' ہم تمھیں سلام کرتے ہیں۔

(براہوی کی لوک کہانیاں)

ا۔ قبیلہ

سوالات

۱۔ بہادر خان کو اپنی فصلوں سے کس حد تک لگاؤ تھا؟

۲۔ بہادر خان کا جوہان (کھلیان) کیسے نذرِ آتش ہوا؟

۳۔ بلوچستان کے کچھ حصوں میں لوگ آج تک ضعیف الاعتقاد چلے آرہے ہیں، اس داستان سے ان کی ضُعیفُ الاِعتِقادی کی کچھ باتوں کی نشاندہی کیجیے۔

۴۔ رئیس کے دھوبی کے ساتھ کیا سلوک ہوا اور وہ اس سلوک کا کس حد تک متحمل ہو سکا؟

۵۔ بہادر خان پے در پے مصائب جھیلنے کے بعد بالآخر اپنے معاشرے میں کیسے واپس آیا؟

۶۔ اس سبق کا خلاصہ تحریر کیجیے۔

۷۔ جملے کی صحت اور فعل اور فاعل کی مطابقت جیسے ضروری اُمور کے لیے تذکیر وتانیث کے اُصول وقواعد کی پابندی ضروری ہے۔ اردو میں اسم کی صرف دو جنسیں ہیں مذکر اور مؤنث۔ یعنی ہر اسم چاہے وہ جاندار ہو یا بے جان، مذکر ہو گا یا مؤنث۔ اگرچہ قواعد جاننے والوں نے تذکیروتانیث کے کچھ اصول بھی بنائے ہیں لیکن عام طَور پر تذکیروتانیث بول چال اور زبان دان لوگوں کے ذریعے اور رواج کی بنیاد ہی پر معلوم ہوتا ہے۔ خاص طور پر بے جان اسموں کی تذکیروتانیث کے سلسلے میں اہلِ زبان کی گفتگو ہی سُنَد قرار پاتی ہے۔

اس سبق میں سے مندرجہ ذیل الفاظ کو اپنے جملوں میں اس طرح استعمال کیجیے کہ ان کی تذکیروتانیث واضح ہو جائے:

کاریز، آزادی، نیک نامی، محبت، خاطر تواضع، گندم، انبار، طاقت، جوہان، آندھی، آگ، انتظار، کھاٹ، رُوپوشی، قسمت۔

○☆○☆○☆○☆○☆○

شبلی نعمانیؒ

(۱۸۵۷ء - ۱۹۱۴ء)

جہانگیر اور تزکِ جہانگیری

یورپ کے بے درد واقعہ نگاروں نے سلاطین اسلام کی غفلت شعاری، عیش پرستی اور سیہ کاری کے واقعات کو بلند آہنگی سے تمام عالم میں مشہور کیا کہ خود ہمیں کو یقین آچلا اور تقلید پرست تو بالکل یورپ کے ہم آہنگ بن گئے۔

ہمارے انشاء پرداز[1] نے جہانگیر کے کبھی کبھی ہوش میں آجانے کا جو کارنامہ بتایا ہے وہ اس کی کتاب تزکِ جہانگیری ہے۔ اور سچ یہ ہے کہ جہانگیر کے طرزِ عمل اور ہر قسم کے خیالات کے دریافت کرنے کا اس سے زیادہ صحیح ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ہم اس مضمون میں اسی کتاب پر مختلف حیثیتوں سے نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔

اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت (جس کو سب سے پہلے بیان کرنا چاہیے) یہ ہے کہ وہ واقعات کا نہایت صحیح اور سچا مرقع ہے۔ اس کا ہر ہر لفظ شہادت دیتا ہے کہ کتاب کا لکھنے والا کسی واقعے میں کسی قسم کی رنگ آمیزی نہیں کرنا چاہتا۔ وہ "حکمت عملی" اور "پالیٹکس" کے فلسفے سے بالکل ناواقف ہے۔ وہ واقعات پر ملمع سازی کا روغن نہیں چڑھا سکتا۔ وہ عیب بھی کرتا ہے تو ڈنکے کی چوٹ کہ دیتا ہے، اور ہنر کا کوئی کام اس کے ہاتھ سے بن آتا ہے تو داد طلب خاموشی نہیں اختیار کرتا بلکہ علانیہ فخر کا اظہار کرتا ہے۔ مورخین کو اپنے تجسس اور راز جوئی پر ناز ہے کہ انھوں نے ابوالفضل کے قتل کی سازش دریافت کرلی لیکن جہانگیر خود صاف صاف لکھتا ہے۔ اس قسم کے سیکڑوں واقعات ہیں جن سے بداہتاً ثابت ہوتا ہے کہ اس نے جہاں جو کچھ لکھا ہے سچائی کے جادے سے بال برابر بھی نہیں ہٹا ہے۔

تزکِ جہانگیری اس کا روزانہ روزنامچہ ہے۔ اس میں وہ تاریخ وار تمام

---

[1] اس سے مراد مولانا محمد حسین آزاد ہیں جو نیرنگِ خیال کے مصنف ہیں جس میں انھوں نے جہانگیر کے متعلق لکھا ہے۔

واقعات جو اس کو پیش آتے ہیں اور جن اشغال میں وہ مشغول رہتا ہے، تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی عمر کا بڑا حصہ ملک کے دورے میں صرف ہوا ہے، جس کے ذریعے وہ ملک اور رعایا کے حالات سے اطلاع حاصل کرتا تھا۔ اس خصوصیت میں وہ اپنے پیش رووں اور جانشینوں سے بڑھا ہوا ہے کہ اس کے سفر کی مدت اور سفر کے حدود سب سے زیادہ وسیع ہیں۔

دورے کے روزانہ حالات جو وہ قلم بند کرتا ہے، اس میں عیش و عشرت کا حصہ بہت کم نظر آتا ہے۔ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ ان واقعات کو قلم انداز کرتا جاتا ہے۔ لیکن جب اس قسم کے حالات کا اس کے ملکی اور عملی اشغال سے موازنہ کیا جاتا ہے تو صاف نظر آتا ہے کہ ان تفریحی اشغال کو اس نے اسی حد تک جائز رکھا تھا جس قدر آج یورپ نے باوجود کمال تہذیب کے جائز رکھا ہے۔

مُہمّاتِ مُلکی کی طرف توجہ

ہم دیکھتے ہیں کہ کبھی وہ بڑی مہمات پر فوجیں بھیج رہا ہے، کبھی ایک غریب بُڑھیا کی ایک طاقتور درباری کے مقابلے میں داد رسی کر رہا ہے، کبھی علاقے کی پیائش میں مصروف ہے، کبھی صوبہ جات کے گورنروں کے نام احکام جاری کر رہا ہے کبھی ملکی پیداوار کی تحقیق میں مصروف ہے، کبھی سرحدی حکمرانوں سے تعلقات پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہے، کبھی علما کی مجلس میں شریک ہے، کبھی غیرمذہب والوں سے علمی مباحثے کر رہا ہے۔ اسی حالت میں کام کرتے کرتے تھک جاتا ہے تو اربابِ نشاط اور نغمہ و سرود سے دل بہلا لیتا ہے۔

اس نے تخت پر بیٹھنے کے ساتھ پہلا حکم جو صادر کیا وہ زنجیرِ عدالت کا آویزاں کرنا تھا۔ شخصی حکومت میں رعایا کی داد رسی میں جو امر سب سے زیادہ دقت طلب ہوتا ہے وہ بادشاہ کے دربار تک رسائی ہے۔ جہانگیر نے سب سے پہلے اس کی طرف توجہ کی اور حکم دیا کہ ایک زنجیر قلعے کے بُرج سے دربار تک لٹکائی جائے، تاکہ جو مظلوم شاہی دربار تک نہ پہنچ سکے اس زنجیر کو ہلا دے۔ جب کوئی شخص اس زنجیر کو ہلاتا تھا تو قلعے میں خبر ہو جاتی تھی اور جہانگیر اسی وقت باہر نکل آتا تھا اور اس کی داد رسی کرتا۔

تھا۔ جہانگیر کی نفاست پسندی نے یہاں بھی کام کیا یعنی زنجیر زر خالص سے تیار کی گئی۔ یہ زنجیر تیس گز لمبی تھی اور چار من وزن تھا۔ اس میں ساٹھ گھنگرو تھے جو زنجیر ہلانے سے بجتے تھے۔

جغرافیانہ اور مُحقّقانہ تحقیقات

ہندوستان کی سیکڑوں تاریخیں لکھی گئیں، جن میں حکومت اور فتوحات کے حالات ہیں، لیکن کوئی کتاب جغرافیے کے طرز پر نہیں لکھی گئی جس سے ایک ایک شہر اور قصبے کے حالات معلوم ہوتے۔ اس انداز کی سب سے پہلی کتاب آئین اکبری[1] ہے، جس میں نہایت اجمالی حالات ہیں۔ آج کل گیزیٹیر[2] کا جو طریقہ ہے، یہ اس عہد میں بالکل نہ تھا، لیکن اس کا خاکہ درحقیقت جہانگیر نے قائم کر دیا تھا۔ تزک جہانگیری میں وہ جس صوبے یا جس شہر کا حال لکھتا ہے، اس کی ابتدائی تاریخ، مساحت، پیداوار کی اقسام، آب وہوا، اثمار واشجار، رسوم وعادات، ایک ایک چیز کو نہایت تفصیل سے لکھتا ہے۔

جہانگیر کے دورے کی حد ایک طرف آگرے سے لے کر پنجاب اور کشمیر تک اور دوسری طرف مالوے اور گجرات تک ہے۔ ان ممالک کے اضلاع اور شہروں بلکہ قصبات تک کے تمام حالات اس نے جس تحقیق سے لکھے ہیں، اس پر اضافہ نہیں ہو سکتا۔

علم الحیوانات

جہانگیر کے زمانے میں کسی کو اس فن کا خیال بھی نہ ہو گا، لیکن تزک جہانگیری میں اس کے متعلق اس قدر معلومات ملتے ہیں کہ اس علم کی ایک اچھی ابتدائی تصنیف اس سے تیار ہو سکتی ہے۔ شکار کا شوق شاہی لوازم میں داخل ہے اور گو خشک مزاج عالمگیر اس کو "کارِ بیکاراں" کے لقب سے یاد کرتا تھا، لیکن خود بھی اکثر بیکار بن جاتا تھا۔

۱۔ علامہ ابوالفضل کی تصنیف جس کا اردو ترجمہ مولوی محمد فدا علی طالب نے تین جلدوں میں کیا یہ دراصل تمام شعبہ زندگی سے متعلق قانون کی کتاب ہے

۲۔ Gazetteer جغرافیائی فرہنگ۔

تاہم آج تک کسی نے اس سے یہ کام نہیں لیا کہ علمُ الحیوانات کی تدوین میں کام آئے۔ جہانگیر کو بھی شکار کا بے حد شوق تھا۔ ایک دفعہ اس نے اپنی شکار افگنی کا نقشہ تیار کرانا چاہا۔ چونکہ دفتر میں ایک ایک چیز قلم بند کی جاتی تھی' اس لیے تحقیقات سے ثابت ہوا کہ بارہ برس کی عمر' یعنی ۹۸۸ھ سے پچاسویں سال تک ۲۸۵۳۲ جانور اس نے شکار میں مارے تھے' جن میں ۸۶ شیر تھے۔ تزک میں ایک ایک جانور کی الگ الگ تفصیل لکھی ہے۔ وہ جس جانور کو مارتا تھا فوراً اس کا وزن اور تشریح کراتا تھا اور یہ دیکھتا تھا کہ اس میں غیر معمولی کیا چیزیں ہیں۔ چونکہ قدیم تصنیفات میں تصویریں درج نہیں کرتے تھے' اس لیے علم الحیوانات کی تصانیف میں سب سے مقدم یہ ہے کہ جس جانور کا ذکر کیا جائے اس کی صورت شکل' ڈیل ڈول' خط وخال' رنگ وروپ کا اس طرح بیان کیا جائے کہ آنکھوں میں تصویر پھر جائے۔ حیواۃ الحیوان دمیری[1] میں' جو اس فن کی سب سے عمدہ کتاب خیال کی جاتی ہے' اکثر یہ نقص پایا جاتا ہے کہ جانور جو باہم ملتے جلتے ہیں' ان میں امتیاز نہیں ہو سکتا لیکن جہانگیر جس جانور کا ذکر کرتا ہے' تصویر کھینچ کر رکھ دیتا ہے۔

لیکن اس نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ تمام کم یاب جانوروں کی تصویریں کھنچوائیں اور تزکِ جہانگیری میں شامل کیں۔ اکثر شکاروں میں جب کوئی غیر معمولی قدو قامت کا جانور شکار کرتا تھا تو اس کی تصویر کھنچواتا تھا۔ سن ۱۸ جلوس[2] میں ایک نہایت مہیب شیر کا شکار کیا تو اس کی تصویر کھنچوائی۔

علم الحیوانات کے نتائج میں اس سے بہت مدد ملتی ہے کہ جانوروں کے نہایت غیر معمولی اقسام ڈھونڈ کر پیدا کیے جائیں کیونکہ اس سے اکثر جانوروں کی ماہیت اور جنس ونسل جو قرار پا چکی تھی' بدل جاتی ہے۔ جہانگیر اس کا خاص خیال رکھتا ہے۔ سفید رنگ کا چیتا بہت کم سنا گیا ہے۔ راجا نرسنگھ دیو نے جب سن ۳ جلوس میں پیش کیا تو نہایت خوش ہوا۔ تزک میں اس کا جہاں ذکر کیا ہے' لکھتا ہے کہ میں نے حسبِ ذیل

۱۔ کمال الدین الدمیری اپنے دور کے عظیم ترین ماہر حیوانات تھے۔ انہوں نے چودھویں صدی عیسوی میں یہ کتاب مرتب کی۔ اس میں تقریباً ایک ہزار اقسام کے حیوانات پر معلومات درج ہیں۔
۲۔ تخت نشینی کے اٹھارھویں سال

جانور بالکل سفید دیکھے ہیں اور میرے چڑیا خانے میں موجود ہیں۔

شاہین، باشہ، شکرا، کُنجشک، کوا، بٹیر، تیتر، پودنہ، طاؤس، باز۔

جہانگیر کا جانور خانہ حقیقت میں ایک عجائب خانہ تھا۔ اس میں ایسے بھی بہت سے جانور تھے جن کی خلقت غیر معمولی تھی۔ ان میں ایک بکرا تھا جو بقدر ایک پیالے کے دودھ دیتا تھا۔ سن ۹ جلوس[1] میں ولایت زیر باد[2] سے ایک پرند آیا، جو طوطی کے مشابہ تھا۔ اس کی یہ عادت تھی تمام رات الٹا لٹک کر چہچہے کرتا تھا۔

جہانگیر ان عجائبات کے بہم پہنچانے میں بے دریغ روپیہ صرف کرتا تھا۔ ان امرا سے نہایت خوش ہوتا تھا جو اس قسم کی چیزوں کو بہم پہنچاتے تھے، اور روپیہ کا مطلق خیال نہیں کرتے تھے۔

مصوّری

عام خیال ہے کہ چونکہ اسلام نے تصویر کشی کو حرام کردیا، اس لیے مسلمان اس فن میں کچھ ترقی نہ کر سکے، بلکہ ان کے عہد میں یہ لطیف فن گویا مٹ گیا۔ ہم کو مذہبی مسئلے سے بحث نہیں لیکن تاریخی واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے اس فن میں کچھ کم ترقی نہیں کی اور سلاطین اور امرائے اسلام اس فن کے ساتھ خاص شغف رکھتے تھے اور جہانگیر تو گویا عاشق تھا۔ اس کی مہارت اس فن میں اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ ایک تصویر اگر مختلف مصوروں کے ہاتھ کی بنی ہوتی تھی تو وہ بتا دیتا تھا کہ کہاں تک کس کے ہاتھ کا کام ہے۔ جہانگیر تصویر شناسی کا جو دعویٰ کرتا ہے، تذکروں اور تاریخوں سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ سرخوش[3] نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ ایک شخص نے ایک تصویر جہانگیر کو لاکر دی، جس میں ایک عورت کی تصویر اس حالت میں کھینچی تھی کہ اس کی کنیز جھانویں سے اس کے تلوے مل رہی ہے، جہانگیر نے پانچ ہزار روپے دے کر وہ تصویر مول لی۔ اس پر صاحب تصویر کو تعجب ہوا اور عرض کی کہ حضور!

۱۔ جہانگیر کی تخت نشینی کے نویں سال

۲۔ ایک علاقے کا نام

۳۔ محمد افضل سرخوش

اس میں کیا بات ہے؟ جہانگیر نے کہا جب تلوے سہلائے جاتے ہیں تو خفیف سی گدگدی پیدا ہوتی ہے' اس کا اثر چہرے پر بھی ظاہر ہوتا ہے اور یہ اثر تصویر میں موجود ہے۔

تحقیقاتِ اشیا

جہانگیر کو ہر چیز کی تحقیقات کا خاص شوق تھا۔ جس ملک اور جس صوبے میں جاتا تھا وہاں کی ایک ایک چیز کی تحقیق کرتا تھا' ہر جگہ پرچہ نویس اور واقعہ نویس مقرر تھے کہ ملکی حالات کے ساتھ ہر قسم کی تحقیقات کی رپورٹ کرتے رہیں۔ جو باتیں عام طور سے مشہور ہو گئی تھیں اور لوگ ان کو مسلمات کی طرح تسلیم کرتے آتے تھے' جہانگیر ان کی تحقیق کرتا تھا اور غلط ثابت ہوتی تھیں۔ مثلاً عام طور پر مشہور ہے کہ مومیائی کے استعمال سے زخم فوراً اچھا ہو جاتا ہے' جہانگیر نے اس کا تجربہ کیا اور نتیجہ تجربہ ان لفظوں میں لکھتا ہے:

> "بہرحال طبیبوں کی ٹھہرائی ہوئی بات کو رد کرنے کے لیے ایک مرغ کا پاؤں توڑ کر اسے ان کی بتائی ہوئی مقدار سے زیادہ (مومیائی) کھلائی گئی۔ (پاؤں کے) ٹوٹے ہوئے حصے پر ایک ٹکڑا ملا گیا اور تین دن تک اس کی حفاظت کی گئی۔ حالانکہ کہا گیا ہے کہ صبح سے شام تک (محفوظ رکھنا) کافی ہے۔ اس کے بعد جو دیکھا گیا تو کسی قسم کا اثر ظاہر نہ ہوا۔"

زعفران کا خندہ زا ہونا عموماً مُسَلَّم ہے۔ چنانچہ "ذخیرہ خوارزم" شاہی میں جو طِبّ کی معتبر کتاب ہے' بہ تصریح مذکور ہے۔ جہانگیر نے قید خانے سے ایک قیدی کو بلا کر پاؤ سیر زعفران کھلادی' کچھ اثر نہ ہوا۔ دوسرے دن آدھ سیر کھلائی' رحس تک نہ ہوئی۔

ہُما جس کا سایہ مشہور ہے' جہانگیر نے اس کا پتا لگایا تو اس قدر معلوم ہوا کہ پیر پنجال کے پہاڑوں میں ایک پرندہ ہوتا ہے جو ہڈیاں کھاتا ہے۔ جہانگیر نے حکم دیا کہ جو شکار کر کے لائے ہزار روپیہ انعام پائے گا۔ چنانچہ جمال خاں بندوق سے مار کر لایا۔

جہانگیر نے سینہ چاک کرا کے دیکھا تو چینہ دان میں ہڈی کے ریزے تھے۔

جہانگیر کی دِقّت نظری اور موشگافی اس حد تک تھی کہ مصنوعی اور مشتبہ چیزیں، گو کتنی ہی فریب نظر ہوں، اس کو دھوکا نہیں دے سکتی تھیں۔ جہانگیر کو اس تحقیقات کا خاص شوق تھا کہ ہر چیز کس حد تک معمولی حالت سے زیادہ ہو سکتی ہے۔ چنانچہ اس نے اکثر درختوں، پھلوں، جانوروں وغیرہ کے متعلق اس قسم کی تحقیقات کرائیں۔

داد رسی، رعایا کی خبر گیری اور جفاکشی

مخالفین تو کہتے ہیں کہ جہانگیر کا شراب و کباب کے سوا اور کچھ کام نہ تھا، لیکن واقعات بتاتے ہیں کہ رعایا کی داد رسی، عدل و انصاف، ملک کی خبر گیری میں اکبر کے سوا کوئی اس کا جواب نہ تھا۔ جہانگیر اپنے نامور باپ کی طرح دن رات میں صرف تین گھنٹے سوتا تھا۔ احمد آباد گجرات کی آب و ہوا اس کو نہایت ناموافق آئی۔ تاہم جب تک رہا عین گرمی اور حدت کے وقت دوپہر کے بعد کھلے میدان میں دربارِ عام کرتا تھا اور حکم تھا کہ نقیب اور چوبدار وغیرہ بالکل ہٹا دیئے جائیں کہ کسی قسم کی روک ٹوک نہ ہو۔ یہ امر تمام مورخین نے تسلیم کیا ہے کہ عدل و انصاف میں جہانگیر بالکل بے لاگ تھا۔ اس معاملے میں اس کے نزدیک دربار کا ایک رکنِ اعظم اور ایک غریب مزدور دونوں برابر تھے۔

علما اور فقرا کی قدر دانی

ایشیائی سلطنتوں میں علم و فضل کا رواج سلاطین کی قدر دانی پر موقوف ہے، اور اس باب میں سلاطینِ اسلام کو عموماً تمام دنیا کے حکمرانوں پر ترجیح ہے۔ جہانگیر بھی علمی قدر دانی میں اَسلاف کی عمدہ مثال تھا۔ وہ ہر مذہب کے علما اور فقرا سے ملتا تھا اور ان کے ساتھ برتاؤ میں تمام آدابِ شاہی کو بھول جاتا تھا۔ اس کے ساتھ چونکہ نکتہ شناس تھا اس لیے ہر شخص کی نسبت ایسی رائے ظاہر کرتا ہے جو ایک بڑے مُدَقِّق کا کام ہو سکتا ہے۔ یاد ہو گا کہ جب فیضی اکبر کے دربار میں آیا ہے تو جہانگیر اور مراد کی تعلیم

پر مقرر ہوا۔ جہانگیر کی علمی قابلیت تصدیق کرتی ہے کہ فیضی نے اپنا فرض نہایت کامیابی کے ساتھ ادا کیا۔ خانِ خاناں بھی جہانگیر کا اتالیق رہ چکا ہے۔ ایسے استادوں کے فیضِ تعلیم سے ہم ایسے ہی نتیجے کی توقع رکھ سکتے تھے۔ (مقالاتِ شبلی)

سوالات

۱۔ مختصر جواب دیجیے۔

(الف) شہنشاہ جہانگیر نے مظلومین کی داد رسی کا کیا طریقہ اختیار کیا تھا؟

(ب) زنجیرِ عدل کس دھات کی بنی ہوئی تھی، اس کا وزن کتنا تھا اور اس کی لمبائی کس قدر تھی؟

(ج) آئینِ اکبری کس انداز کی پہلی کتاب ہے؟

(د) تزکِ جہانگیری میں صوبوں یا شہروں کے حالات لکھنے کے ضمن میں کن باتوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے؟

(ہ) جہانگیر نے جن جن اضلاع، شہروں اور قصبوں کے حالات جس تحقیق کے ساتھ رقم کیے ہیں، کیا ان میں اضافہ ممکن ہے؟

(و) اورنگ زیب عالمگیر شکار کے شوق کو کس لقب سے یاد کیا کرتا تھا؟

(ز) جہانگیر نے جانوروں کے تفصیلی حالات لکھنے میں کن کن باتوں کو پیشِ نظر رکھا ہے؟

(ح) ہمیں تزکِ جہانگیری میں حیوانات کے حوالے سے کیا کیا معلومات بہم پہنچتی ہیں؟

(ط) جہانگیر فنِ مصوّری کا کس قدر دلدادہ تھا؟

(ی) جہانگیر اشیا کی تحقیقات کے سلسلے میں کس حد تک محتاط تھا؟ کوئی ایک واقعہ لکھیے۔

۲۔ درج ذیل اقتباسات کی تشریح سیاق و سباق کے حوالے سے کیجیے۔

(الف) اس کتاب کی سب سے بڑی ------- بال برابر بھی نہیں ہٹا ہے۔

(ب) ایشیائی سلطنتوں میں ------- توقع رکھ سکتے تھے۔

○☆○☆○☆○☆○☆○

ڈاکٹر علی محمد خاں

(ولادت : ۱۹۴۱ء)

ماحولیاتی آلودگی

کرۂ ارض پر اَن گنت ایسے قدرتی اور غیر قدرتی عوامل بر سرِ پیکار ہیں جن کی وجہ سے ہمارا ماحول مسلسل تبدیلیوں سے گزر رہا ہے۔ ابتداء میں جب دنیا کی آبادی آج سے کہیں کم تھی تو اس دور کا ماحول بھی آج سے کہیں مختلف تھا۔ تاہم یہ بات اہمیت کی حامل ہے کہ منفی اثرات کے حامل قدرتی عوامل کا حل خود قدرت کے پاس موجود ہے اور ان عناصر کے زیر اثر ماحولی توازن بگڑنے کی صورت میں یہ خود کار قدرتی نظام کے تحت متوازن حالت میں آجاتا ہے کیونکہ یہ توازن قدرت کا منشا اور بقائے حیات اور ماحول کے استحکام کی ضمانت ہے۔ البتہ ایسے غیر قدرتی عوامل جو انسانی سرگرمیوں کے باعث ظہور پذیر ہوتے ہیں' ماحول کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچانے کا موجب بنتے ہیں۔ دراصل انسان اپنی خداداد صلاحیتوں کی بنا پر ہمیشہ سے اپنے ماحول میں تغیر و تبدل کے لیے کوشاں رہا ہے۔ اپنی طبعی ترقی پسندی کے زیر اثر انسان نے کائنات کو تسخیر کرنے کا بیڑا ہی نہیں اٹھایا بلکہ ہر میدان میں اپنی دریافتوں اور ایجادوں کے ذریعے فطرت کو زیر کرنے کی بھی ٹھان لی۔ یہ انسانی فتوحات بلاشبہ انسان کو راحت و آرام بہم پہنچانے کا پیش خیمہ ہیں' جن کا تصور اسے ہمیشہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں پیش قدمی کی ترغیب دیتا رہا۔ آج کی دنیا میں صنعتوں کا ایک جال بچھ چکا ہے۔ آمدورفت اور مواصلات کے جدید ذرائع نے نہ صرف فاصلوں کو سمیٹ دیا ہے بلکہ انسان کو وقت کی قید سے بھی آزاد کر دیا ہے۔

اب اگر ہم تصویر کے دوسرے رخ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس ترقی پسندی نے دھیرے دھیرے فطرت کی شکل مسخ کر کے رکھ دی ہے۔ کائنات کا اصول ہے کہ فطرت کی تباہی کبھی ترقی کی بنیاد نہیں بن سکتی۔ اسی حقیقت کے پیش نظر جوں جوں انسان ترقی کی منازل طے کرتا گیا' فطرت تباہی کی طرف بڑھتی گئی اور اس تلخ

حقیقت کا ادراک بھی انسان کو اس وقت ہوا جب اس کے اپنے غارت گر ہاتھوں سے دنیا تباہی کے کنارے آن کھڑی ہوئی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا فطرتی ماحول ایسی غیر فطرتی کثافتوں سے آلودہ ہو رہا ہے جن کے اثرات ناقابلِ تلافی ہیں۔

وہ تمام طبعی، حیاتیاتی اور کیمیائی عناصر جو انسانی سرگرمیوں کے نتیجے میں ماحول کا حصہ بن کر اسے آلودہ کرتے ہیں "آلود کنندہ" کہلاتے ہیں اور تمام وہ منفی ماحولیاتی تبدیلیاں جو ان عناصر کی ماحول میں شمولیت پر ظہور پذیر ہوتی ہیں "ماحولیاتی آلودگی" کہلاتی ہیں۔ کرۂ ارض میں عناصر فطرت کی بنیاد پر ہم ماحولیاتی آلودگی کو چند اقسام میں تقسیم کرتے ہیں تاکہ ہر ایک نظام پر علیحدہ علیحدہ آلود کنندگان کے اثرات اور ان سے بچاؤ کی تدابیر کا جائزہ لے سکیں۔

فضائی آلودگی

ماحولیاتی آلودگی کی پہلی قسم فضائی آلودگی ہے۔ کرۂ ارض کے اردگرد گیسوں کا ایک غلاف موجود ہے جس میں نائٹروجن، آکسیجن، کاربن ڈائی آکسائیڈ اور دیگر گیسیں شامل ہیں۔ یہ تمام گیسیں بلحاظ وزن ایک خاص تناسب سے فضا کا حصہ بنتی ہیں۔ جدید سائنسی و صنعتی دور میں ٹریفک کی لاتعداد گاڑیوں کے انجنوں سے نکلنے والا دھواں اور صنعتی چمنیوں سے خارج ہونے والی مضر گیس فضا کو آلودہ کر دیتے ہیں۔ ہمارے ملک میں تمام صنعتوں سے فاضل گیسیں اور بخارات بغیر کسی ہچکچاہٹ اور معالجے کے فضا میں شامل کر دیے جاتے ہیں جبکہ یہ زہریلی گیسیں اور بخارات خاص طور پر گردونواح میں آباد باشندوں کی صحت پر نہایت مضر اثرات مرتب کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صنعتوں کے قرب وجوار میں رہائش پذیر افراد میں ناک، آنکھ اور گلے کے امراض بکثرت پائے جاتے ہیں جبکہ ان فاضل گیسوں کی ناگوار بدبو اردگرد میں بسنے والوں حتیٰ کہ راہ گیروں کے لیے بھی سانس لینا دوبھر کر دیتی ہے۔ لاہور سے گوجرانوالا یا لاہور سے شیخوپورہ تک کے سفر کے دوران میں آپ نے بھی محسوس کیا ہو گا کہ ان زہریلی گیسوں سے نہ صرف انسان بلکہ نباتات بھی بری طرح متاثر ہوئی ہے اور جہاں کبھی تاحدِ نگاہ لہلہاتے کھیت دکھائی دیتے تھے اب دور دور تک سبزہ نظر نہیں

آتا۔ صنعتی علاقوں میں ہزار ہا کارکن کام کرتے ہیں۔ یہ کارکُن ان زہریلی گیسوں اور بخارات سے سب سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کارکنوں میں ناک، آنکھ اور گلے کے امراض کے علاوہ پھیپھڑوں اور دل کے امراض کا تناسب عام لوگوں کی نسبت کہیں زیادہ پایا جاتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ یہ گیسیں اور بخارات قریبی عمارات کو بھی نقصان پہنچاتے ہیں۔ جہاں تاج محل آگرہ ان ضرر رساں گیسوں سے خاصا متاثر ہوا ہے وہاں کراچی میں قائدِاعظم رحمۃ اللہ علیہ کے مقبرے کی بیرونی دیواروں کی شان و شوکت بھی ماند پڑتی جارہی ہے۔

معدنی ایندھن، جو پٹرول، ڈیزل، موبل آئیل، مٹی کے تیل اور کوئلے کی شکل میں دستیاب ہے، واحد ایندھن ہے جو دنیا بھر میں سب سے زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ جب اس ایندھن کو جلاکر توانائی حاصل کی جاتی ہے تو عملِ اِحتراق (جلنے کا عمل) سے کاربن اور نائٹروجن کے ساتھ ساتھ سلفر کے آکسائیڈ بھی خارج ہوتے ہیں۔ گیسیں اگرچہ بذات خود زیادہ مضر نہیں لیکن دیگر کیمیائی مرکبات کے ساتھ ملاپ کے نتیجے میں بے حد ضرر رساں مرکبات میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ موٹر گاڑیوں میں استعمال ہونے والے پٹرول میں سیسے کا ایک ایسا مرکب شامل کیا جاتا ہے جو انجن کو ناکنگ (جھٹکا) سے بچانے کا کام کرتا ہے مگر اس پٹرول کے اِحتراق کے نتیجے میں انجن سے سیسے اور کاربن کے ذرات سیاہ دھویں کی شکل میں خارج ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں بطور احتجاج سڑکوں پر ٹائر جلانے کا عمل عام ہے۔ ٹائروں کے جلنے سے کاربن کے ذرات پر مشتمل سیاہ دھواں ساری فضا کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ طبی نقطہ نگاہ سے یہ ذرات پھیپھڑوں کے سرطان کا موجب بننے کے علاوہ ناک، آنکھ، حلق، ہڈیوں کے امراض اور کم سن بچوں میں یادداشت کی کمی، تھکاوٹ، افسردگی، دماغی کمزوری اور دیگر فعلیاتی انظام میں خرابی کا اہم سبب ہیں۔ اس کے علاوہ گرد بھی فضا کو آلودہ کرنے والا اہم عنصر ہے۔ کچے راستوں اور شکستہ سڑکوں پر موٹر گاڑیوں کی آمدورفت سے ساری فضا آلودہ ہو جاتی ہے۔ یہ گرد و غبار نظامِ تنفس کی خرابی، آنکھوں کی بیماریوں اور جلدی امراض کا باعث بنتا ہے۔

ایندھن کے اِحتراق سے خارج ہونے والی گیسیں خصوصاً نائٹروجن، کاربن ڈائی آکسائیڈ، کاربن مونو آکسائیڈ اور سلفر ڈائی آکسائیڈ فضا میں موجود گرد کے ذرات اور دیگر کیمیائی مرکبات آبی بخارات کے ساتھ مل کر فضا میں ایک زہریلی دُھند پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ دُھند "فوگ" یا "سموگ" کہلاتی ہے۔ سموگ نہ صرف جاندار اشیاء اور نباتات کو سخت نقصان پہنچاتی ہے بلکہ فضائی اور زمینی ٹریفک کے حادثات کا باعث بھی بنتی ہے۔ ترقی یافتہ ممالک کے صنعتی علاقوں میں سموگ فضائی آلودگی کی خطرناک صورت میں ظاہر ہو چکی ہے جبکہ پاکستان کے بڑے صنعتی شہروں کراچی، حیدر آباد، لاہور اور فیصل آباد میں بھی کچھ اسی طرح کی کیفیت پیدا ہو رہی ہے۔

معدنی ایندھن کے بے تحاشا استعمال کی وجہ سے فضا میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کی کثرت مقدار توازن سے کہیں زیادہ بڑھ کر فضائی آلودگی کا سبب بنتی ہے۔ اس توازن کے بگڑنے سے تمام وافر کاربن ڈائی آکسائیڈ فضا کے گیسی غلاف میں ایک دبیز تہ کی صورت میں جمع ہو جاتی ہے۔ یہ تہ سورج کی روشنی سے حاصل ہونے والی حرارت کو اس گیسی غلاف سے باہر نہیں نکلنے دیتی۔ اسی اثر کے تحت گزشتہ دس سالوں میں کرۂ ارض کے اوسط درجہ حرارت میں اضافہ ہوا ہے۔ ماحولیاتی سائنس دانوں کے مطابق درجہ حرارت میں یہ اضافہ تمام عالم میں ماحولیاتی تبدیلیاں لانے کا محرک ہو سکتا ہے۔

فضائی آلودگی سے کثافت زدہ ماحول نہایت مہلک ہے۔ ان خوفناک نتائج سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ معدنی ایندھن کا متبادل تلاش کر کے فضائی آلودگی پیدا کرنے والے عناصر سے نجات حاصل کی جائے۔ مثلاً شمسی توانائی، پانی اور ہوا کی حرکی قوت سے حاصل شدہ توانائی کا استعمال نہ صرف معاشی اعتبار سے سودمند ہو گا بلکہ فضائی آلودگی میں بھی خاطر خواہ کمی واقع ہوگی۔ صنعتی فاضل گیسوں کی پیدا کردہ آلودگی سے نجات کے لیے ضروری ہے کہ صنعتوں میں فاضل گیسوں کے معالجے کے لیے پلانٹ نصب کیے جائیں اور حکومتی سطح پر فضا کو آلودہ کرنے والی صنعتوں پر جرمانہ عائد کیا جائے۔ اسی طرح موٹر گاڑیوں سے خارج ہونے والے زہریلے دھویں سے

بچاؤ کے لیے لازم ہے کہ سیسے سے مبرا پٹرول کے استعمال کو فوقیت دی جائے۔ گاڑیوں کے انجنوں کی بروقت سروس کرائی جائے۔ حفظِ ماتقدم کے قانون پر عمل درآمد کیا جائے اور دھواں دینے والی گاڑیوں کو قانون کی گرفت میں لیا جائے۔ درخت فضا میں موجود کاربن ڈائی آکسائیڈ کو جذب کر کے صحت مند آکسیجن خارج کرتے ہیں۔ چنانچہ ایسی جگہوں پر، جہاں کارخانوں کی بہتات ہے یا گاڑیاں کثرت سے استعمال ہوتی ہیں، زیادہ تعداد میں پودے اور درخت پیدا کیے جائیں۔ اس کے علاوہ کارخانوں کی وجہ سے فضا کو آلودگی سے بچانے کا سہل طریقہ یہ ہے کہ کارخانے آبادی سے زیادہ سے زیادہ فاصلے پر لگائے جائیں۔ ہم بے احتیاطی سے فصلوں پر کیڑے مار دوائیوں کی صورت میں زہر چھڑک کر اپنی اور دوسروں کی زندگی اجیرن بنا دیتے ہیں اس بارے میں ضابطوں سے ہرگز تجاوز نہ کرنا چاہیے۔

آبی آلودگی

کرۂ ارض کا تین چوتھائی رقبہ پانی پر مشتمل ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ زیرِ زمین بھی پانی کے بے شمار ذخائر موجود ہیں۔ پانی قدرت کا ایک ایسا عطیہ ہے جو اگر میسر نہ ہو تو انسان چند دنوں سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ پانی چونکہ ایک بہترین محلل ہے اس لیے بیشتر اقسام کی کثافتیں اس میں حل ہو کر پانی کو آلودہ کر دیتی ہیں۔ آبی آلودگی کا سبب خواہ کچھ بھی ہو اس کے اثرات آبی جانداروں کے علاوہ انسانوں اور خشکی کے ماحولی نظام کے لیے بھی خطرناک ہوتے ہیں۔ پانی تقریباً ہر صنعت کی ضرورت ہے۔ خاص طور پر چمڑا سازی، کپڑا سازی، شکر سازی، کاغذ اور گتہ بنانے کے کارخانوں میں پانی بہت زیادہ مقدار میں استعمال ہوتا ہے۔ صنعتی استعمال کے بعد فالتو پانی حل پذیر اور غیر حل پذیر کیمیائی مادوں کے ساتھ قریبی جوہڑوں، ندی نالوں اور دریاؤں میں بہا دیا جاتا ہے۔ یہ کیمیائی مادے آبی ماحولی نظام کو متاثر کر کے آبی جانوروں کی موت کا سبب بن سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صنعتی علاقوں کے قرب و جوار میں موجود ایسے ندی نالوں اور دریاؤں میں، جن میں کیمیائی کثافتیں حد سے تجاوز کر چکی ہیں، مچھلیوں اور آبی جانوروں کی تعداد میں تیزی سے کمی واقع ہو رہی ہے۔ مثال کے طور پر

لاہور کے نالہ بیدیاں، لاہور اور شیخوپورہ کی سڑک پر نالہ ڈیک، راولپنڈی کے نالہ لئی، سیالکوٹ کے نالہ ایک اور ملتان کی نہر نوبہار میں کیمیائی آبی آلودگی کے باعث مچھلیاں تقریباً معدوم ہو چکی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ آبی آلودگی معاشیات اور زراعت پر بھی اثر انداز ہو رہی ہے۔ کیمیائی اعتبار سے آلودہ پانی کو آبپاشی کے لیے استعمال کرنا بھی خطرے سے خالی نہیں کیونکہ اس میں موجود مضر کیمیائی مرکبات مثلاً پارہ، سیسہ، نکل، کرومیم وغیرہ اور ان کے نمکیات زمین میں جمع ہو کر پودوں کی جڑوں کے ذریعے پودوں میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ایسی فصلوں کا بطور خوراک استعمال کئی مہلک امراض کا باعث بن سکتا ہے۔

بیشتر طور پر شہری علاقوں کا تمام آلودہ پانی بھی بغیر صاف کیے کسی قریبی نالے یا دریا میں ٹھکانے لگا دیا جاتا ہے جس کے نتیجے میں پانی نہ صرف کیمیائی بلکہ حیاتیاتی اعتبار سے بھی ضرر رساں ہو جاتا ہے۔ اس کی ایک مثال دریائے راوی کی ہے جس میں لاہور کا تمام آلودہ پانی اور صنعتوں کا فالتو آلودہ پانی جس کی مقدار ۲۱۲ ملین گیلن یومیہ ہے بغیر صاف کیے ڈال دیا جاتا ہے۔ خاص طور پر سردیوں میں اس کے اثرات بہت مضر ہوتے ہیں کیونکہ اس دوران میں دریا میں قدرتی پانی کی مقدار کم ہوتی ہے۔ جب یہ آلودہ پانی دریا میں بہتا ہوا زیریں علاقوں کی طرف پہنچتا ہے، جہاں اس کو فصلیں سیراب کرنے اور پینے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، تو اس کی آلودگی انسانی صحت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس وقت دریائے راوی میں آبی آلودگی اس قدر زیادہ ہے کہ لاہور اور اس کے گردونواح میں مچھلی تقریباً ناپید ہو چکی ہے۔ اس آلودگی کے اثرات بہت دور تک محسوس ہوئے ہیں مثلاً ہیڈ بلوکی پر مچھلیوں کی تعداد میں نمایاں کمی واقع ہوئی ہے۔

زیرِ زمین آبی ذخائر کی آلودگی کا سبب بھی یہی آلودکنندگان ہیں۔ کیمیائی فاضل مائع مواد کو سطحِ زمین پر یا زیرِ زمین کہیں بھی ٹھکانے لگایا جائے وہ سرایت کرتا ہوا زیرِ زمین آبی ذخائر میں شامل ہو جاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ سمندر بھی آلودہ ہونے سے مبرّا نہیں۔ ساحلی علاقوں کی بدرووں اور صنعتوں کے فاضل مائع مواد کو سمندر میں ڈال دیا جاتا ہے جس سے سمندر کا پانی بھی آلودہ ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں سمندروں سے

معدنی تیل کی نکاسی، ترسیل اور آمدورفت کے دوران میں ٹینکروں سے رسنے والا تیل بھی سمندری آلودگی کا سبب بنتا ہے۔ یہ آلودگی سمندری جانوروں اور پرندوں کے لیے مہلک ثابت ہوتی ہے نیز ساحلی علاقے بھی اسی آلودگی کے زیرِ اثر آلودہ ہو جاتے ہیں۔

ہمارے ملک میں پینے کے لیے صاف پانی کی قلت کے باعث خصوصاً دیہی علاقوں میں سطحی آبی ذخائر مثلاً کنوؤں، ندی نالوں، دریاؤں اور نہروں سے پانی حاصل کیا جاتا ہے۔ دیہی عوام چونکہ حفظانِ صحت کے اصولوں سے نابلد ہوتے ہیں اس لیے وہ بے دھڑک پینے کے لیے آلودہ پانی استعمال کرتے ہیں جس کے نتیجے میں وہ کئی مہلک اور وبائی امراض مثلاً ہیضہ، پولیو، ٹائیفائیڈ، یرقان اور اسہال کے علاوہ وائرس اور بیکٹیریا سے پیدا ہونے والی دیگر بیماریوں کا آسانی سے شکار ہو جاتے ہیں، جن میں بچے اور بوڑھے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ پلاننگ کمیشن کے اعدادوشمار کے مطابق پاکستان میں چالیس فیصد اموات آلودہ پانی کے استعمال کی وجہ سے ہوتی ہیں۔

آبی آلودگی سے بچاؤ کے لیے ضروری ہے کہ صنعتی آلودگی اور دیگر عوامل کی وجہ سے بگڑتی ہوئی صورت حال کو مناسب طریقے سے کنٹرول کیا جائے۔ اس بارے میں جو صنعتیں پانی کا استعمال زیادہ کرتی ہیں اور آلودہ پانی کو صاف کیے بغیر ندی نالوں اور دریاؤں میں پھینک دیتی ہیں ان کا فرض ہے کہ وہ فوری طور پر آلودہ پانی کی صفائی کے انتظامات کریں۔ مناسب ہو گا کہ حکومتی سطح پر صنعتی اور کیمیائی فاضل مواد کے اس طرح ٹھکانے لگانے پر پابندی عائد کی جائے اور اس کے معالجے کے لیے تمام صنعتوں میں معالجی پلانٹوں کے انصلاب پر زور دیا جائے۔ چھوٹے بڑے شہروں میں سیوریج یعنی گندے پانی کی نکاسی کا نظام بہتر نہ ہونے کی وجہ سے گندا پانی جگہ جگہ کھڑا نظر آتا ہے۔ سیوریج کے نظام میں کوڑا کرکٹ پھینکنے سے پائپ بند ہو جاتے ہیں جس سے ہر طرف گندگی ہی گندگی پھیل جاتی ہے۔ چنانچہ اگر سیوریج کے نظام میں اصلاح کی جائے اور سیوریج کے پانی کی آلودگی کو کم کیے بغیر اسے ندی نالوں اور دریاؤں میں نہ پھینکا جائے تو اس سے بھی خاصی حد تک ماحولیاتی آلودگی میں کمی واقع ہو سکتی ہے۔

زمینی آلودگی

زمینی آلودگی میں فضا اور پانی کو آلودہ کرنے والے عوامل بھی کارفرما ہیں۔ علاوہ ازیں صنعتی ٹھوس فاضل مواد اور رہائشی علاقوں کا کوڑا کرکٹ بھی زمینی آلودگی کا سبب بنتے ہیں۔ یہ آپ کے مشاہدے میں بھی ہے کہ گھروں کا کوڑا کرکٹ اکٹھا کر کے گلیوں اور سڑکوں کے کنارے ڈھیر کر دیا جاتا ہے۔ کوڑے کرکٹ کے یہ ڈھیر نہ صرف علاقے کے جمالیاتی حسن کو برباد کرتے ہیں بلکہ ان سے پیدا ہونے والی بدبو اور جراثیم ماحول کو آلودہ کرتے ہیں جس سے انسانی صحت بھی متاثر ہوتی ہے اور انسان کے لطیف جذبات اور تخلیقی صلاحیتوں پر بھی منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ تیز ہوا اور جانور اس کوڑے کرکٹ کو بکھیر دیتے ہیں جس سے سارا ماحول پراگندہ ہو جاتا ہے۔ پھر یہ ڈھیر نہ صرف مہلک جراثیم کی افزائش گاہیں بنتے ہیں بلکہ بکٹیریا اور دیگر خوردبینی جانداروں کے زیرِ اثر کچرے کے گلنے سڑنے کے عمل سے بدبودار گیسیں پیدا ہوتی ہیں جن سے اردگرد کا ماحول متعفن ہو جاتا ہے۔ مویشیوں اور باربرداری کے لیے استعمال ہونے والے جانوروں کا فضلہ اور دوسری گندگی بھی آلودگی پیدا کرنے کا ایک سبب ہیں۔ ان میں سے کچھ تو جلد ہی قدرتی عوامل سے تحلیل ہو جاتے یا ٹھکانے لگ جاتے ہیں کچھ ہمیشہ کے لیے آلودگی کا باعث بنتے رہتے ہیں۔ کچھ مصنوعات' خاص طور پر مختلف قسم کی پلاسٹک کی مصنوعات قدرتی عوامل سے کبھی ٹھکانے نہیں لگتیں کیونکہ یہ ہمارا وضع کردہ میٹریل ہے اور اس کو ٹھکانے لگانے کا انتظام قدرتی عوامل میں شامل نہیں ہے۔ بعض اوقات کوڑے کرکٹ سے نجات حاصل کرنے کے لیے ان کے ڈھیروں کو نذر آتش کر دیا جاتا ہے۔ اس احتراقی عمل سے جو دھواں پیدا ہوتا ہے اور گیسیں اٹھتی ہیں وہ فضائی آلودگی پیدا کرتی ہیں۔ موجودہ صنعتی دَور میں ناقابلِ تحلیل مادوں پر مشتمل مصنوعات کا استعمال اس قدر عام ہو گیا ہے کہ ترقی یافتہ ممالک کے لیے بھی اپنی ناقابل تحلیل آلائشوں کو ٹھکانے لگانا ایک اہم مسئلہ بن چکا ہے۔ ہمارے ہاں بھی کوڑے کرکٹ سے نجات حاصل کرنے کا موجودہ نظام نہایت غیر تسلی بخش ہے۔ شہر بالخصوص اندرون شہر کی گلیاں اور سڑکیں کثافتوں سے پُر نظر آتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں بیماریوں کی شرح بھی زیادہ ہے۔ بعض اوقات صنعتی ٹھوس یا نیم ٹھوس فاضل

مواد اور کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں کو زمین میں دفن کر دیا جاتا ہے۔ جس سے اس کے اثرات زیرِ زمین پانی میں سرایت کر جاتے ہیں جس سے یہ پانی ضرر رساں ہو جاتا ہے۔

زمین کی آلودگی سے بچاؤ کے لیے لازم ہے کہ گھریلو کوڑے کرکٹ، کمرشل علاقوں، گلیوں اور عوامی اداروں کے ٹھوس فاضل مواد کے نامیاتی مادوں کو علٰحدہ جمع کر کے بائیو گیس پلانٹ کے ذریعے اس سے توانائی حاصل کی جائے۔ نامیاتی مادوں کو مناسب معالجے کے بعد بطور نامیاتی کھاد بھی استعمال میں لایا جا سکتا ہے۔ غیر نامیاتی مادوں کو دوبارہ استعمال کے قابل بنا لینے سے نہ صرف زمینی آلودگی میں بڑی حد تک کمی ہو سکتی ہے بلکہ معیشت پر بوجھ بھی کم کیا جا سکتا ہے۔ تمام ترقی یافتہ ممالک میں ان اشیا کو دوبارہ استعمال میں لانے کے لیے کارخانے کام کر رہے ہیں اور مزید قائم کیے جا رہے ہیں۔ صنعتی ٹھوس فاضل مواد کیمیائی معالجے کے بعد اگر دوبارہ قابلِ استعمال نہ بن سکے تو اسے محفوظ طریقے سے زمین میں ٹھکانے لگانا اہم ہے۔

قدرتی وسائل کسی بھی ملک کے لیے ایک عظیم نعمت سے کم نہیں۔ غیر فطری سرگرمیاں قدرتی وسائل کے انحطاط کا سبب بنتی ہیں۔ جنگلات قدرت کا بیش بہا خزانہ ہیں۔ درخت نہ صرف معیشت میں اہمیت کے حامل ہیں بلکہ یہ ماحول کو آلودگی سے صاف رکھنے کے قدرتی کارخانے ہیں۔ انیسویں صدی کے آغاز سے قبل دنیا میں خشکی کے کل رقبے کا ایک چوتھائی سے زیادہ رقبہ جنگلات پر مشتمل تھا لیکن معدنی ایندھن کے استعمال میں اضافے اور صنعتوں کے قیام کے بعد جنگلات کی کٹائی کا عمل سرعت اختیار کر گیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جنگلات کا کل رقبہ زمینی رقبے کے چھٹے حصے سے بھی کم رہ گیا ہے۔ پاکستان کا صرف تین فیصد رقبہ جنگلات پر مشتمل ہے جبکہ اس محدود رقبے میں بھی تیزی سے کمی ہو رہی ہے۔ جنگلاتی رقبے کی مکمل صفائی کے نتیجے میں زمین بُردگی کا شکار ہونے لگتی ہے۔ جبکہ بُردگی کی شرح میں اضافے سے قابلِ کاشت اراضی میں کمی آتی جاتی ہے اور آبی ذخائر میں تلچھٹ کی مقدار بڑھ جاتی ہے جس کی وجہ سے نہ صرف آبی ذخائر کم ہو جاتے ہیں بلکہ پانی بھی آلودہ ہو جاتا ہے۔ کاشتکاروں کی جدید زرعی اصولوں اور ٹیکنالوجی سے عدم واقفیت کی بنا پر سیم اور تھور زدہ زمین میں اضافہ

ہو رہا ہے جس سے اجناس کی قلت بڑھ جاتی ہے۔ قابل کاشت اراضی میں کمی کے اس عمل کو "صحرائیت" کا نام دیا گیا ہے۔ جنگلاتی رقبے میں کمی اور صحرائیت کے نتیجے میں زمین کا قدرتی ماحول بری طرح متاثر ہو رہا ہے۔ خشکی کے ماحولی نظام میں منفی تبدیلیوں کے رونما ہونے سے جانوروں کی بے شمار نسلیں معدوم ہوتی جا رہی ہیں اور آبادی میں بے تحاشا اضافے، صنعتوں کے قیام اور انسانی سرگرمیوں کے باعث قدرتی وسائل زوال پذیر ہیں۔

اس عمل کی روک تھام کے لیے ضروری ہے کہ جنگلاتی رقبے کی مکمل کٹائی کے عمل کو فوری طور پر منقطع کیا جائے۔ پٹیوں کی شکل میں یا جنگلات کے اندرونی حصوں سے درخت کاٹنے سے زمین پر زیادہ برے اثرات مرتب نہیں ہوتے۔ بطور ایندھن لکڑی کا استعمال ترک کر کے اس کے متبادل ایندھن کا استعمال اور لکڑی کی ناکارہ مصنوعات کو ضائع کرنے کے بجائے ان کے دوبارہ استعمال سے جنگلاتی رقبے میں مزید کمی کو روکا جا سکتا ہے۔ بُردگی کے سدباب کے لیے ضروری ہے کہ زرخیز یا نیم زرخیز زمین کو خالی چھوڑ دینے کے بجائے اس پر شجر کاری کی جائے۔ آبادی میں اضافے کے باعث زرخیز زمین اور جنگلات کو رہائشی آبادیوں میں تبدیل کیا جا رہا ہے جبکہ زیادہ مناسب یہ ہے کہ رہائشی علاقوں کے لیے بنجر زمین اور کاشت کاری کے لیے زرخیز زمین کا انتخاب کیا جائے۔

شور کی آلودگی

شور ناپسندیدہ، بلند اور بے ہنگم آوازوں کا نام ہے۔ سائنسی ایجادات مثلاً ریڈیو، ٹیلی ویژن، لاؤڈ سپیکر اور موٹر گاڑیاں وغیرہ بے حد شور پیدا کرتی ہیں۔ صنعتی مشینوں سے پیدا ہونے والا شور نہ صرف صنعتی کارکنوں بلکہ قرب وجوار میں رہائش پذیر افراد پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ آواز کی شدت کی پیمائش کے لیے جو پیمانہ استعمال کیا جاتا ہے اسے "ڈیسی بل" کہتے ہیں۔ انسانی کان نوے ڈیسی بل تک کی آواز بغیر کسی تکلیف کے سن سکتا ہے جبکہ نوے سے سو ڈیسی بل شور انسانی صحت کے لیے انتہائی نقصان دہ ہے۔ کچھ صنعتوں میں شور کی سطح کے مطالعے سے یہ حقائق سامنے آئے ہیں

کہ اگر کوئی شخص مسلسل آٹھ گھنٹے نوے ڈیسی بل شور کی فضا میں رہے تو وہ بہرا ہو سکتا ہے اور کوئی اچانک دھماکہ جس کے شور کی مقدار ایک سو ساٹھ ڈیسی بل ہو انسان کو مکمل بہرا کر دیتی ہے۔ لاہور کے مختلف علاقوں مثلاً بھاٹی چوک، ریلوے سٹیشن اور آزادی چوک وغیرہ میں دن کے وقت شور کی سطح بہت زیادہ ہوتی ہے۔ "ادارہ تحفظ ماحول" کے ایک سروے کے مطابق ان جگہوں پر شور کی سطح ۷۷ سے ۹۶ ڈیسی بل ہوتی ہے جبکہ یہ سطح زیادہ سے زیادہ نوے ڈیسی بل سے نہ بڑھنی چاہیے۔ ہوائی اڈے اور بعض کارخانوں میں آواز کی بلندی ۸۰ سے ۱۲۰ ڈیسی بل تک پائی گئی ہے۔

ماہرِ نفسیات کے مطابق شور، کام کرنے اور نیند کے دوران میں پُرسکون ماحول میں خلل کا باعث ہی نہیں بنتا بلکہ یہ انسانی نفسیات اور صحت پر بھی گہرے منفی اثرات مرتب کرتا ہے۔ عام مشاہدے کی بات ہے کہ بڑے شہروں میں جہاں شور و غوغا زیادہ ہوتا ہے لوگ نفسیاتی طور پر اونچا بولنے لگتے ہیں۔ شور زدہ ماحول میں روزانہ مسلسل کئی گھنٹے گزارنے والے افراد سرگرانی، کراہت، چڑچڑاپن، اعصابی تناؤ، ذہنی کھنچاؤ، امراضِ قلب اور عارضی یا مستقل طور پر بہرے پن کا شکار ہو سکتے ہیں۔

اگرچہ شور سے مکمل بچاؤ ناممکن ہے تاہم اس میں ممکنہ حد تک کمی کی جا سکتی ہے۔ اس کے لیے لازم ہے کہ خوامخواہ شور پیدا کرنے کا موجب نہ بنا جائے۔ اس کے علاوہ موٹر سائیکلوں، رکشوں اور موٹر گاڑیوں کو درست حالت میں رکھا جائے اور ان کے سائیلنسر درست ہوں اور ہارن کے بے جا استعمال کی مذمت کی جائے۔ صنعتوں میں مشینوں کو درست حالت میں رکھا جائے اور شور وغل والے کارخانوں میں باقاعدہ طور پر شور جذب کرنے والے آلات نصب کیے جائیں۔ عمارتوں میں ایسا میٹریل استعمال کیا جائے جس میں گونج پیدا کرنے کے بجائے آواز جذب کرنے کی صلاحیت ہو۔ ہوائی اڈوں، ریل کی پٹڑیوں، سڑکوں اور فیکٹریوں کے اردگرد بہتات سے گھنے درخت لگائے جائیں کیونکہ درخت بھی قدرتی طور پر شور جذب کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

ماحولیاتی آلودگی کے دیگر عوامل

متذکرہ بالا ماحولیاتی آلودکنندگان کے علاوہ دیگر کئی عوامل بھی ماحولیاتی آلودگی میں کارفرما ہیں جن میں تابکاری مادے بھی ماحول کی آلودگی کا باعث بنتے ہیں۔ موجودہ دور میں جوہری توانائی کا استعمال فروغ پا رہا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں نیوکلیر پلانٹ سیکڑوں کی تعداد میں موجود ہیں۔ ان پلانٹوں اور ایٹمی بجلی گھروں کے فضلات میں بیکار تابکار مادے شدید تابکاری شعاعیں خارج کرتے ہیں۔ اگر ان فضلات کو انتہائی محفوظ طریقے سے ٹھکانے نہ لگایا جائے تو یہ بہت خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔ نیوکلیائی تنصیبات میں اتفاقی یا تخریبی حادثوں، فضا میں نیوکلیائی دھماکوں یا تجربات سے شعاعی آلودگی پھیلتی ہے جس کے مضرات نہ صرف کافی عرصہ تک قائم رہتے ہیں بلکہ یہ نسل درنسل منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ طبیّ معالج بھی طبیّ تجربات کے لیے ایکس ریز اور الٹرا ساؤنڈ وغیرہ استعمال کرتے ہیں، جدید تحقیقات کے مطابق ان کا زیادہ استعمال جسم میں کئی امراض پیدا کرنے کا موجب بنتا ہے۔

آبادی میں حد سے زیادہ اضافہ ماحولیاتی آلودگی کا سب سے بڑا محرک ہے۔ تمام دنیا میں آبادی میں اضافے کے باعث قدرتی وسائل پر بوجھ بڑھ رہا ہے، خوراک کی قلت شدت اختیار کر گئی ہے اور بے گھر اور بے روزگار افراد کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ کچی آبادیوں کی، جو ماحولیاتی آلودگی کا ایک بھیانک منظر پیش کرتی ہیں، تعداد بڑھ رہی ہے۔ موٹر گاڑیوں اور صنعتوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ غرض ہر قسم کی آلودگی کا بنیادی سبب آبادی میں اضافے ہی کو گردانا جاتا ہے۔ اسی بنا پر تمام عالم میں آبادی میں اضافے کو کم کرنے کی کوششیں جاری ہیں۔ تاہم ایک افسوسناک حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ملک میں آبادی میں اضافے کی شرح مزید بڑھ کر تین اعشاریہ ایک فیصد سالانہ ہو چکی ہے جبکہ یہ امر واضح ہے کہ آبادی میں ایک حد سے زیادہ اضافہ کسی بھی ملک کی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ اور اس کے ماحول کی آلودگی کا اہم ترین سبب ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جہاں آبادی (شرح پیدائش) زیادہ ہے ان کا مستقبل نہایت بھیانک ہے۔ آبادی میں اضافے کی شرح کو کم کرنے کے لیے دوسرے

اقدام کے علاوہ ضروری ہے کہ ملک میں شرح خواندگی میں اضافہ کیا جائے جبکہ ہمارے ملک میں خواندگی کی شرح شرمناک حد تک کم ہے۔

انسان کے اردگرد کا ماحول اس کی فطرت کی عکاسی کرتا ہے۔ صحت مند انسانوں سے صحت مند معاشرے جنم لیتے ہیں۔ صحت کی قیمت پر کوئی بھی ترقی خوش آیند نہیں ہوا کرتی۔ انسان دوستی اور پائدار معاشرے کے شفاف تصور کے لیے ہر شخص کو، جہاں تک اس کی دسترس ہے، اپنا فرض ادا کرنا ہوگا۔ چنانچہ ہم پر لازم آتا ہے کہ ہم اپنی ضرورتیں اس طرح پوری کریں جن سے وسائل پر کم سے کم بوجھ پڑے۔ یہ نہ ہو کہ ہمارے آج کے آرام و آسائش کا خمیازہ ہماری آنے والی نسلوں کو بھگتنا پڑے۔ اس کی ابتداء کا پہلا، آسان اور سب سے مناسب راستہ یہ ہے کہ ہم ماحولیات کے بنیادی اصولوں کی پیروی کرتے ہوئے، پانی، توانائی اور باقی سب چیزوں کو کفایت سے استعمال کریں۔ اگر ماحول کی تبدیلی موجودہ رفتار سے جاری رہی تو زیادہ امکان یہی ہے کہ آنے والی نسلوں کے لیے تباہ و برباد شدہ ماحولیاتی نظام ہی باقی رہ جائے گا۔

سوالات

۱۔ ماحولیاتی آلودگی سے کیا مراد ہے؟

۲۔ ماحول کو صاف ستھرا رکھنے میں طالب علم کس حد تک ممد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں؟

۳۔ انسان اپنے ماحول پر کس طرح اثرانداز ہوتا ہے؟

۴۔ ماحول زیادہ تر کن کن ذرائع سے آلودہ ہوتا ہے؟

۵۔ فضائی آلودگی سے کیا مراد ہے؟ فضائی آلودگی سے کیا کیا بیماریاں لاحق ہو سکتی ہیں؟ اور فضائی آلودگی کا تدارک کیسے ممکن ہے؟

۶۔ آبی آلودگی کے بڑے بڑے اسباب کیا ہیں اور ان سے بچاؤ کیسے ممکن ہے؟

۷۔ زمین کو آلودہ کرنے میں کون کون سے عوامل کارفرما ہیں اور ان کا تدارک

کیسے ممکن ہے؟

۸۔ شور کی آلودگی سے کیا مراد ہے؟ شور کی آلودگی کے کیا کیا نقصانات ہو سکتے ہیں اور ان سے کس طرح بچا جا سکتا ہے؟

۹۔ درج ذیل اقتباس کی تلخیص کیجیے جو اصل اقتباس کے ایک تہائی سے زیادہ نہ ہو اور اس کا مناسب عنوان بھی تجویز کیجیے۔

انسان کے اردگرد کا ماحول۔۔۔۔ تباہ و برباد شدہ ماحولیاتی نظام ہی باقی رہ جائے گا۔

○☆○☆○☆○☆○☆○

چراغ حسن حسرت

(۱۹۰۴ء - ۱۹۵۵ء)
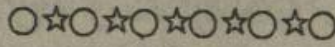
علّامہ اقبالؒ

میکلوڈ روڈ پر لکشمی انشورنس کمپنی کی عمارت سے کچھ آگے سنیما ہے۔ سنیما سے ادھر ایک مکان چھوڑ کے ایک پرانی کوٹھی ہے۔ جہاں آج کل آنکھوں یا دانتوں کا کوئی ڈاکٹر رہتا ہے[1]۔ کسی زمانے میں علامہ اقبال رہ یہیں رہا کرتے تھے۔ چنانچہ ۱۹۳۰ء میں یہیں پہلی مرتبہ ان کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل ہوا تھا۔ اب بھی میں اس طرف سے گزرتا ہوں تو اس کوٹھی کے قریب پہنچ کر قدم رکتے معلوم ہوتے ہیں اور نظریں بے اختیار اس کی طرف اٹھ جاتی ہیں۔

کوٹھی اچھی خاصی تھی، صحن بھی خاصا کشادہ۔ ایک طرف شاگرد پیشہ کے نئے تین کمرے بنے ہوئے تھے، جن میں علامہ اقبال کے نوکر چاکر علی بخش، رحمان، دیوان علی، وغیرہ رہتے تھے۔ لیکن کوٹھی کی دیواریں سیلی ہوئی، پلستر جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا، چھتیں ٹوٹی پھوٹی، منڈیر کی کچھ اینٹیں اپنی جگہ سے اس طرح سرکی ہوئی تھیں کہ ہر وقت منڈیر کے زمین پر آرہنے کا اندیشہ تھا۔ میر کا مکان نہ سہی، بہرحال غالب کے بلّی ماروں والے مکان سے ملتا جلتا نقشہ ضرور تھا۔

کوٹھی کے صحن میں چارپائی بچھی تھی۔ چارپائی پر اجلی چادر، اس پر علامہ اقبالؒ ململ کا کُرتا پہنے، تہ بند باندھے، تکیے سے ٹیک لگائے حقہ پی رہے تھے۔ سرخ و سپید رنگت، بھرا ہوا جسم، سر کے بال کچھ سیاہ کچھ سپید، ڈاڑھی گھٹی ہوئی، چارپائی کے سامنے کچھ کرسیاں تھیں۔ ان پر دو تین آدمی تھے۔ دو تین اٹھ کے جا رہے تھے۔ سالک صاحب میرے ساتھ تھے۔ علامہ اقبال نے پہلے ان کی مزاج پُرسی کی پھر میری طرف توجہ فرمائی۔

---

[1] آج کل یہاں اقبال اکادمی کا دفتر ہے۔

ہم جب گئے تھے تو سورج چھپنے میں کوئی آدھ گھنٹا باقی تھا۔ مگر اٹھے تو اچھی خاصی رات ہو چکی تھی۔ مجھے لاہور آئے ہوئے سوا سال سے اوپر ہو چکا تھا لیکن زیادہ لوگوں سے ربط نہیں تھا۔ یا تنہا گھر میں بیٹھا ہوں یا سالک صاحب کے ہاں۔ ہفتہ میں ایک دو مرتبہ حکیم فقیر محمد چشتی صاحب کے ہاں بھی چلا جاتا تھا۔ لیکن اب جو علامہ اقبال کی خدمت میں باریاب ہونے کا موقع ملا تو ایک اور ٹھکانا ہاتھ آگیا۔ کچھ دنوں میں یہ کیفیت ہوئی کہ اول تو دوسرے تیسرے روز ورنہ ساتویں آٹھویں ان کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتا تھا۔ کبھی کسی دوست کے ساتھ کبھی اکیلا۔ مگر جب جاتا تھا گھنٹا دو گھنٹا ضرور بیٹھتا تھا۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا کہ بارہ بجے تک برابر محفل جمی ہے۔ لوگ آرہے ہیں' جا رہے ہیں۔ ادب' شاعری' سیاست' مذہب پر بحثیں ہو رہی ہیں۔ لیکن ان محفلوں میں سب سے زیادہ علامہ اقبال باتیں کرتے تھے دوسرے لوگوں کی حیثیت زیادہ تر سامعین کی ہوتی تھی۔ میرا مقصود یہ نہیں کہ وہ دوسروں کو بات کرنے کا موقع نہیں دیتے تھے۔ یا بات کاٹ کے بولنا شروع کر دیتے تھے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ہر مسئلہ کے متعلق ان کی معلومات دوسروں سے زیادہ ہوتی تھیں اور اہلِ محفل کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ چند جملے کہُ کے چپکے ہو رہیں۔

ان کے مکان کے دروازے غریب و امیر' ادنیٰ و اعلیٰ سب پر کھلے تھے۔ نہ کوئی حاجب نہ دربان ۔ نہ ملاقات کے لیے کارڈ بھجوانے کی ضرورت' نہ تعارُف کے لیے کسی واسطے کی حاجت۔ جو آتا ہے کرسی کھینچ کے بیٹھ جاتا ہے اور یا تو خود اپنا تعارف کرا دیتا ہے یا چپ چاپ بیٹھا باتیں سنتا رہتا ہے۔ علامہ اقبال باتیں کرتے کرتے تھوڑی دیر کے لیے رکتے ہیں تو اس کی طرف توجہ فرماتے ہیں اور پوچھتے ہیں: "فرمائیے کہاں سے آنا ہوا؟" وہ اپنا نام بتاتا ہے' کوئی حاجت ہوتی ہے تو بیان کر دیتا ہے۔

ان سے جو لوگ ملنے آتے تھے ان میں کچھ تو روز کے آنے والے تھے۔ کچھ دوسرے تیسرے اور کچھ ساتویں آٹھویں آتے تھے۔ بہت سے لوگ ایسے تھے جنھیں عمر بھر میں صرف ایک آدھ مرتبہ ان سے ملنے کا موقع ملا۔ پھر بھی ان کے ہاں ہر وقت میلا سا لگا رہتا تھا۔ جب جاؤ دو تین آدمی بیٹھے ہیں۔ کوئی سفارش کرانے آیا ہے' کوئی

کسی شعر کے معنی پوچھ رہا ہے۔ کسی نے آتے ہی سیاسیات کے متعلق بحث چھیڑ دی ہے اور کوئی مذہب کے متعلق اپنے شکوک بیان کر رہا ہے۔

اکثر لوگ جو باہر کے کسی شہر سے لاہور کی سیر کرنے آتے تھے۔ ان کی کوٹھی پر حاضر ہونا واجبات میں سے سمجھتے تھے۔ کیونکہ لاہور آ کے ڈاکٹر اقبالؒ کو نہ دیکھا تو کیا دیکھا؟ ایسے لوگ بھی تھے جو ان کے نام کے ساتھ ڈاکٹر لکھا دیکھ کر ان سے علاج کرانے آجاتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک شخص ان سے دانت نکلوانے چلا آیا تھا۔ جب اسے معلوم ہوا ڈاکٹر اقبالؒ علاج کرنا نہیں جانتے تو وہ بہت حیران ہوا۔ اور کہنے لگا یہ کیسے ڈاکٹر ہیں جنھیں دانت نکالنا بھی نہیں آتا!

بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جنھیں علامہ اقبالؒ سے ملنے اور ان کی باتیں سننے کا اشتیاق عمر بھر رہا۔ مگر ان کی خدمت میں حاضر ہونے کی جرأت نہ ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں کو ان کی طبیعت کا حال معلوم نہیں تھا۔ وہ ان کی عظمت کے ذکر اذکار سن کر اور ان کے نام کے ساتھ سر جیسا پُر رعب خطاب دیکھ کر دل میں سمجھتے تھے کہ ان کے حضور میں ہم ایسے غریب لوگوں کی رسائی کہاں؟ میرے ایک عزیز دوست جو علامہ اقبالؒ کے سچے عقیدت مند ہیں' ان کی وفات سے کوئی دو مہینے کے بعد مجھ سے ملنے آئے اور جب تک بیٹھے رہے انھیں کا ذکر کرتے رہے۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ علامہ اقبالؒ سے ہر شخص مل سکتا تھا تو انھوں نے بے اختیار رونا شروع کر دیا اور کہنے لگے: "تم نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا؟ مجھے کئی سال سے ان کی خدمت میں حاضر ہونے کی تمنا تھی مگر حوصلہ نہیں پڑتا تھا۔ جی میں سوچتا تھا کسی تقریب کے بغیر کیسے ملوں؟ کیا عجب ہے کہ وہ ملنے سے انکار ہی کر دیں۔ کئی دفعہ اس شوق میں ان کی کوٹھی تک گیا مگر اندر قدم رکھنے کی ہمت نہ پڑی۔ اس لیے باہر سے ہی الٹے پاؤں لوٹ آیا۔"

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ بہت سیدھی سادی زندگی بسر کرتے تھے۔ گھر میں تو وہ ہمیشہ تہ بند اور کُرتے میں نظر آتے تھے۔ البتہ باہر نکلتے تو کبھی کوٹ پتلون پہن لیتے تھے' کبھی فراک کوٹ کے ساتھ شلوار اور ترکی ٹوپی ہوتی تھی۔ ولایت جانے سے پہلے وہ پنجابیوں کا عام لباس پہنتے تھے یعنی کبھی مشہدی لنگی کے ساتھ فراک کوٹ اور شلوار' کبھی

سپید ململ کی پگڑی۔ وہ شروانی اور چُست گھٹنا بھی پہنتے رہے ہیں مگر بہت کم۔ میں نے اس لباس میں انھیں دیکھا تو نہیں البتہ قیاس کہتا ہے کہ شروانی اور چُست گھٹنا ان کے جسم پر بہت پھبتا ہو گا۔

وہ کھانا کم کھاتے تھے مگر ہمیشہ اچھا کھاتے تھے۔ مدت سے ان کا یہ دستور تھا کہ رات کو کھانا نہیں کھاتے تھے صرف نمکین کشمیری چائے پر اکتفا کرتے تھے۔ دسترخوان پر ہمیشہ دو تین سالن ضرور ہوتے تھے۔ پلاؤ اور کباب انھیں بہت مرغوب تھے۔ شب دیگ بھی بہت پسند تھی۔ جاڑے کے دنوں میں بڑے چاؤ سے شب دیگ پکواتے تھے اور خشکہ کے ساتھ کھاتے تھے۔ پھلوں میں صرف آموں سے رغبت تھی۔ آموں کی فصل میں لگن اور سینیاں بھر کے بیٹھ جاتے۔ خود کھاتے ، احباب کو کھلاتے' لطیفے کہتے' آپ ہنستے دوسروں کو ہنساتے تھے۔

جوانی کے زمانے میں ان کا معمول یہ تھا کہ صبح اٹھ کے نماز پڑھتے' قرآن کریم کی تلاوت کرتے' پھر ورزش کرنا شروع کر دیتے۔ ڈنٹر پیلتے' مگدر ہلاتے اور جب سارا جسم عرق عرق ہو جاتا تو مگدر ہاتھ سے چھوٹتا۔ سن زیادہ ہو گیا تو ورزش چھوٹ گئی البتہ قرآنِ کریم کی تلاوت آخر تک جاری رہی۔

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ جوانی میں کبھی کبھار مشاعروں میں بھی شریک ہو جاتے تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ انھیں اس قسم کے اجتماعات سے نفرت سی ہو گئی۔ ایک دن مشاعروں کا ذکر آ گیا تو فرمایا : "اردو شاعری کو ان مشاعروں نے کھویا۔" میں نے پوچھا: "وہ کیسے؟" کہنے لگے : "مشاعروں میں برے بھلے سب شریک ہوتے ہیں اور داد کو شعر کے حُسن و قبح کا معیار سمجھا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو شاعری نے عوام کے مذاق کو اپنا رہنما بنا لیا۔" میں نے عرض کیا : "ان مشاعروں نے تو اردو زبان کو بہت فائدہ پہنچایا ہے۔" فرمایا : "ہاں زبان کو فائدہ پہنچایا اور شاعری کو غارت کر ڈالا۔"

مرحوم کی طبیعت میں ظرافت بہت تھی۔ خشک فلسفیانہ مسائل کو بھی وہ لطیفوں اور پھبتیوں سے ایسا دلچسپ بنا دیتے تھے کہ جی چاہتا تھا پہروں بیٹھے ان کی باتیں سنتے رہیں۔ یوں تو ہر روز دو تین لطیفے ہو جایا کرتے تھے لیکن جو پھبتیاں انھوں نے سر

شہاب الدین کے متعلق کہی ہیں انھیں تاریخی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے انھیں دیکھ علامہ اقبال کو لطیفوں اور پھبتیوں کے سوا اور کچھ نہیں سوجھتا تھا۔ سرشہاب الدین کی رنگت سیاہ ہے۔ ایک دفعہ وہ سیاہ سوٹ پہن کر اسمبلی میں تشریف لے آئے۔ علامہ اقبالؒ نے انھیں دیکھا تو ہنس کے فرمایا: "چودھری صاحب! آج تو آپ ننگے ہی چلے آئے"۔

چودھری صاحب نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ لباس کے انتخاب کا معاملہ نظرِثانی کا محتاج ہے۔ سیاہ رنگت پر سیاہ سوٹ واقعی بھلا معلوم نہیں ہوتا۔ لوگوں کو یہ معلوم کرنے میں دقت ہوتی ہے کہ کوٹ کا کالر کہاں ہے؟ اور ٹھوڑی کہاں؟ یہ سوچ کے سیاہ سوٹ کے بجائے سپید سوٹ پہننا شروع کر دیا۔ سپید پتلون، سپید کوٹ، سپید قمیض، سپید پگڑی۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے انھیں دیکھا تو سر سے پاؤں تک ایک نظر ڈالی اور بے اختیار ہنس پڑے۔ چودھری صاحب نے جھنجھلا کے کہا: "آپ ہنسے کیوں ہیں؟ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا: "میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ آپ ہیں یا کپاس کے کھیت میں ارنا بھینسا۔" ایک مرتبہ پھر ایسا ہی موقع پیش آیا۔ تو مرحوم نے ان پر بجھے ہوئے سگرٹ کی پھبتی کہی۔

میں پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ ان سے ہر قسم کے لوگ ملنے آتے تھے اور وہ سب کی باتیں غور سے سنتے اور ان کا جواب دیتے تھے۔ دوسرے تیسرے کالجوں کے کچھ طلبہ بھی آجاتے تھے۔ ان میں کوئی ان کے اشعار کے معنی پوچھتا تھا، کوئی مذہب کے متعلق سوالات کرتا تھا، کوئی فلسفہ کی بحث لے بیٹھتا تھا۔ ایک دفعہ گورنمنٹ کالج کے چار پانچ طالب علم ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ جانتے ہیں کہ کالج کی مخلوق میں بننے سنورنے کا شوق زیادہ ہے۔ پوڈر اور سرخی کا استعمال روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔ ابروؤں کو خم دینے، زلفوں میں بل ڈالنے، ہونٹوں کو سرخی کے استعمال سے "لعلین" بنانے کا شوق زیادہ ہوتا جا رہا ہے۔ ایک تو یہ چاروں پانچوں گل چہرہ اور نازک اندام، اس پر بناؤ سنگار کا خاص اہتمام۔ انھوں نے آتے ہی پردہ کی بحث چھیڑ دی اور ایک نوجوان کہنے لگا: "ڈاکٹر صاحب! اب مسلمانوں کو پردہ اٹھا دینا چاہیے۔" ڈاکٹر

صاحب مسکرا کے بولے: "آپ عورتوں کو پردے سے نکالنا چاہتے ہیں اور میں اس فکر میں ہوں کہ کالج کے نوجوانوں کو بھی پردے میں بٹھا دیا جائے۔"

علی بخش ان کا پرانا نوکر ہے اور کوئی چالیس سال تک برابر ان کے ساتھ رہا ہے۔ ملازمت اختیار کی تو مسیں بھی نہیں بھیگی تھیں۔ اب ڈاڑھی مونچھیں سپید ہو چکی ہیں۔ ڈاڑھی تو خیر منڈا دی اور پردہ ڈھک گیا۔ مونچھوں کو خضاب کیا۔ مگر چند دنوں میں خضاب اڑ گیا اور مونچھوں کی رنگت کچھ عجیب سی ہو گئی۔ انتقال سے ایک دو مہینے پہلے کا ذکر ہے کہ علامہ مرحوم تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ اردگرد کچھ بے تکلف احباب بیٹھے تھے۔ علی بخش پاس کھڑا تھا کہ اس کی مونچھوں کی رنگت کا ذکر چھڑ گیا۔ ایک صاحب کہنے لگے: "یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ آخر علی بخش کی مونچھوں کی رنگت کیا ہے؟" دوسرے بولے: "خاکستری؟" ایک اور صاحب نے کہا: "خاکستری نہیں، اگرئی" ڈاکٹر صاحب بھی سن رہے تھے۔ مسکرا کے بولے: "نہ اگرئی نہ خاکستری، مچھئی کہو، مچھئی۔"

مرحوم زندگی کے بعض معاملات میں خاص ضابطوں کے پابند تھے۔ وہ گھر کا سارا حساب کتاب باقاعدہ رکھتے تھے اور ہر شخص کے خط کا جواب ضرور دیتے تھے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ کوئی شخص ان سے سند یا کسی تصنیف پر ان کی رائے لینے آتا تھا تو کہتے تھے خود لکھ لاؤ، میں دستخط کر دوں گا اور یہ بات صرف ٹالنے کی غرض سے نہیں کہتے تھے بلکہ جو کچھ کوئی لکھ لاتا تھا اس پر دستخط کر دیتے تھے۔ ان کی طبیعت میں بلا کی آمد تھی۔ ایک ایک نشست میں دو دو سو شعر لکھ جاتے تھے۔ پلنگ کے پاس ایک تپائی پر پنسل اور کاغذ پڑا رہتا تھا۔ جب شعر گوئی پر طبیعت مائل ہوتی تھی، لکھنا شروع کر دیتے تھے۔ کبھی خود لکھتے تھے، کبھی کسی کو لکھوا دیتے تھے۔ عشقِ رسولؐ نے ان کے دل کو گداز کر رکھا تھا۔ نبی کریمؐ کا نام لیتے وقت ان کی آنکھیں پُرنم ہو جاتی تھیں اور قرآن پڑھتے پڑھتے بے اختیار رو پڑتے تھے۔ غرض ان کی شخصیت بے حد دل آویز تھی۔ جن لوگوں نے صرف ان کا کلام پڑھا ہے اور ان سے ملے نہیں وہ اقبالؒ کے اعلیٰ کمالات سے بے خبر ہیں۔

موت سے کوئی ڈھائی سال پہلے وہ میو روڈ پر اپنی نو تعمیر کوٹھی میں اٹھ گئے۔ وہاں گئے ابھی تھوڑے دن ہوئے تھے کہ ان کی بیگم صاحبہ کا انتقال ہو گیا۔ انھیں اس واقعے کا بہت صدمہ ہوا۔ میں نے اس حالت میں انھیں دیکھا کہ مرحومہ کی قبر کھودی جا رہی ہے اور وہ پیشانی پر ہاتھ رکھے پاس ہی بیٹھے ہیں۔ اس وقت وہ بہت بوڑھے معلوم ہو رہے تھے۔ کمر جھکی ہوئی تھی اور چہرہ زرد۔ اس واقعے کے بعد ان کی صحت برابر بگڑتی چلی گئی۔ آخر ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ کو انتقال کیا اور شاہی مسجد کے باہر دفن ہوئے۔

(مَردم دِیدہ)

سوالات

۱۔ چراغ حسن حسرت نے میکلوڈ روڈ والی کوٹھی کا جو نقشہ کھینچا ہے اسے اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

۲۔ علامہ اقبال رہ کی محفل میں بالعموم کن موضوعات پر گفتگو ہوتی تھی اور ان سے ملنے کے لیے کس قسم کے لوگ آتے تھے؟

۳۔ علامہ اقبال رہ کس طرح کا لباس زیب تن کرتے تھے؟

۴۔ مندرجہ ذیل جملوں کی وضاحت کیجیے:

(الف) فرمایا: "ہاں زبان کو فائدہ پہنچایا اور اردو شاعری کو غارت کر ڈالا"۔

(ب) اور میں اس فکر میں ہوں کہ کالج کے نوجوانوں کو بھی پردے میں بٹھا دیا جائے۔

(ج) عشقِ رسول ؐ نے ان کے دل کو گداز کر رکھا تھا۔

۵۔ روز مرہ اس بول چال اور اُسلوبِ بیان کو کہتے ہیں جو خاص اہلِ زبان استعمال کرتے ہیں۔ اس میں قیاس کو دخل نہیں بلکہ سماعت پر دارومدار ہے۔ مثلاً: بلاناغہ پر قیاس کر کے اس کی جگہ بے ناغہ، روز روز کی جگہ دن

دن اور آئے دن کی جگہ آئے روز کہنا غلط ہو گا کیونکہ یہ الفاظ بول چال میں اس طرح کبھی نہیں آتے۔ روز مرہ میں الفاظ کے استعمال کا ایک خاص انداز ہوتا ہے۔ لیکن وہ الفاظ اپنے لغوی اور اصلی معنی دیتے ہیں۔ تحریر وتقریر میں جہاں تک ممکن ہو روز مرہ کی پابندی ضروری خیال کی جاتی ہے۔ کلام میں جس قدر روز مرہ کی پابندی کم ہوگی اسی قدر وہ فصاحت کے درجے سے ساقط سمجھا جائے گا۔ روز مرہ قواعد زبان کے اصولوں سے بالا ہوتا ہے اور اس کے لیے کسوٹی اہلِ زبان کا اُسلوبِ بیان ہی ہوتا ہے۔ ہر محاورہ روز مرہ کی ذیل میں بھی آتا ہے لیکن ہر روز مرہ کا محاورہ ہونا ضروری نہیں ہوتا۔

اس سبق میں سے روز مرہ کی چند مثالیں تلاش کر کے انھیں اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

۶۔ مندرجہ ذیل الفاظ پر اعراب لگا کر ان کا تَلَفُّظ واضح کیجیے:

بلی ماروں، اشتیاق، گھٹنا، ڈنٹر، نازک اندام، خاکستری۔

○☆○☆○☆○☆○☆○

بیگم اختر ریاض الدین

(ولادت : ۱۹۳۶ء)
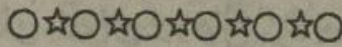
ہوائی

دنیا کے حسین سفر ہمیشہ مجھ پر مسلط رہے ہیں یہ ایک اور سہی۔ کچھ اتنے لمبے ہوائی سفر کا ڈر، کچھ ایک صاحبہ نے ڈرایا کہ ٹوکیو سے ہونولولو تک نیچے بحرالکاہل ہوتا ہے اور اوپر خدا۔ کہیں زمین کا ذرا سا ٹکڑا بھی ڈھارس کے لیے دکھائی نہیں دیتا اور معمول کے مطابق اگر طوفان آجائے تو پھر الامان! سفر اللہ اللہ کرتے گزرتا ہے۔ پیٹ میں ہَول اٹھے۔ لیکن میرے میاں تو تین مہینے پہلے جا چکے تھے۔ اس لیے مراجعت ناممکن تھی۔ اوکھلی میں سر دیا تو ان دھمکوں سے کیا ڈرنا۔ بوریا بستر باندھا (بستر تو ہوتا ہی نہیں یہ محاورے کی بات ہے) گھر سمیٹ کر ایک گیراج میں بند کیا۔ گھر سمیٹنے میں اب طاق ہو گئی ہوں اس طرح پل بھر میں اس کی گٹھڑی باندھ کر الگ کرتی ہوں کہ گویا کبھی تھا ہی نہیں۔ سب سے چھوٹی بیٹی جو اب کالج کے پہلے سال میں تھی، ساتھ ہو لی۔ بڑی دو لڑکیوں کے بی اے کے امتحان تھے ان کو ڈھائی مہینے بعد آنا تھا۔ کراچی پہنچ کر بی 'او' اے' سی[1] کا ٹکٹ بک کرایا۔ اس غریب لائن سے اگر جانا ہو تو ۲۴ گھنٹے کی گنجائش رکھنی چاہیے اگر ۲۶ کو جانا ہو تو ۲۵ کو سیٹ بک کراؤ۔ کیونکہ وہ چوذہ سو چالیس منٹ سے کم لیٹ ہونا کسر شان سمجھتی ہے لیکن میں پھر بھی ہمیشہ اسی ہوائی کمپنی کو چنتی ہوں۔ کیونکہ اس کی نشست آرام دہ ہوتی ہے اور عملہ تمیز دار۔ تو خیر ہم نے پہلی ٹھیکی کلکتہ میں لگائی۔ کلکتہ میری جائے پیدائش ہے۔ حالانکہ میں صرف ایک سال کی شیر خوار وہاں سے لے آئی گئی تھی لیکن پھر بھی اس جگہ سے اُنس تھا۔ اس کو دیکھنے کا ارمان تھا لیکن میرے جذبات نے مجھے ہمیشہ دھکے کھلوائے۔ ایئرپورٹ سے لے کر پولیس اسٹیشن تک جو میرا اور باقی مجھ جیسے سیاحوں کا حال ہوا وہ ناگفتہ بہ ہے۔ خدا کسی شریف انسان کو کلکتہ نہ لے جائے۔ اگر مرزا غالب نے اس میں کچھ دیکھا تو ہندوستانی کسٹم آفیسر اور

---

[1] British Overseas Air Ways Corporation

بنیا پولیس سے پہلے دیکھا ہو گا۔ قصہ کوتاہ ہم نے جلدی سے اپنی جان چھڑائی اور ہانگ کانگ[1] روانہ ہوئے۔ وہاں جا کر روح خوش ہو جاتی ہے۔ تازہ دم ہو کر ٹوکیو روانہ ہوئے۔ راستہ سخت طوفانی تھا۔ کمبخت "پین ایم[2]" پرانا کھٹارا جہاز چار گھنٹے لرزتا رہا اور ہمیں لرزاتا رہا۔ ساتھ بیٹھا جاپانی تاجر تسلی دیتے ہوئے بولا: "یہ تو کچھ بھی نہیں۔ جب ٹوکیو سے ہوائی جاؤ گی تو ہوائی جہاز ایسے اچھلے گا جیسے چھاج میں گیہوں۔" ہم نے انا للہ پڑھ لیا اور ارادہ کر لیا کہ میاں کو ہوائی میں ہی رہنے دیں اور ہم ٹوکیو میں ان کی واپسی کا انتظار کریں۔ لیکن خاک چھاننے کا شوق خوف و خطر پر غالب آ گیا اور جنرل شیخ اور بیگم شیخ کی خاطر مدارات کا مزہ چکھ کر دو دن ٹوکیو ٹھہر کر جل تو جلال تو کہتے ہوئے جاپان ایئر لائنز میں بیٹھ گئے۔ ہوائی جہاز چلا تو ہم نے اللہ سے گڑگڑا کر دعا مانگی کہ یارب ہماری عزت رکھ لے اور خیر سے سفر پورا کر دے۔ میرے مولا نے میری مراد ایسی پوری کی کہ سارا سفر آسمانوں میں ریشم کی طرح سَر سَر کرتا گزر گیا۔ میں نے اتنے خوشگوار چھ گھنٹے کبھی نہیں گزارے تھے۔

رات کو ساڑھے دس بجے ہمارا جہاز ہوائی کے دارالسلطنت ہونولولو میں اترا۔ میاں کو تار دے دیا تھا۔ امید تھی کہ ہوائی اڈے پر ہار لے کر پہنچیں گے۔ جزیرہ ہوائی کی یہ ایک رسم دیرینہ ہے کہ ہر آنے والے کا پھولوں کے حسین گجروں سے استقبال کیا جاتا ہے۔ اس لیے ارمان تھا کہ کم از کم میاں تو پھول نچھاور کرنے پہنچ جائیں گے۔ لیکن میاں ریاض الدین صاحب حسبِ معمول غائب' رات کا وقت' مجھے ان کا پتا بھی نہیں معلوم۔ جناب بلی کی طرح تین گھر تبدیل کر چکے تھے۔ ہوائی کی یونیورسٹی میں فون کیا تو انھوں نے کہا' ایسٹ ویسٹ سنٹر[3] سے پوچھو۔ اتنے میں ایک ٹیکسی والا آگے بڑھا' میں وہاں تک آپ کو لے جاتا ہوں' باقی پھر دیکھا جائے گا۔ ہائی رائز ہوسٹل[4] تک پہنچے تو اونچی اونچی عمارات' بتیاں جل رہی ہیں' طلبہ پڑھ رہے ہیں لیکن ہمارے میاں ندارد۔ غصہ اور پریشانی دونوں مل گئے۔ یہ اچھا استقبال ہو رہا ہے۔

۱۔ Hong Kong

۲۔ Pan Am

۳۔ East West Centre

۴۔ High Rise Hostel

رات کے بارہ بجے ! تین مہینے بعد بیوی آئی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اتنے میں ایک کار لڑکیوں سے لدی پھندی، چیختی چلاتی آن کر رکی۔ انجان شکلوں نے میرے گلے میں ہار ڈالے۔ پیچھے ایک اور کار اس میں گٹار پر کچھ نوجوان ہوائی گیت گاتے ہوئے اترے اور ان نوجوانوں میں چھپے ہوئے میاں ریاض الدین مسکراتے ہوئے چلے آرہے ہیں۔ اس سے پہلے کہ میں حسبِ معمول برستی، ان کی سہیلیوں نے سمجھایا کہ تار پڑھنے میں غلط فہمی ہو گئی۔ ہوائی کا وقت جاپان کے وقت سے ۱۴ گھنٹے پیچھے ہے اس لیے اکثر تاریخوں میں گڑبڑ ہو جاتی ہے۔ ہم نے جل کر کہا کہ اصل گڑبڑ تو ہماری شادی کی تاریخ سے شروع ہوئی تھی۔ بہرحال خدا کا شکر ادا کیا۔ ٹیکسی والے کا شکریہ ادا کیا۔ پھر گھر روانہ ہوئے۔ رات کے اندھیرے میں بھی وائی کیکی[1] کا ساحل کبھی نہیں سوتا۔ سڑکیں روشن اور جواں دل روشن تر۔

مجھے گھر دیکھنے کا شوق لیکن ریاض صاحب ٹالتے جائیں کہ تم صبح آرام سے دیکھنا۔ ابھی کمروں میں بتی مت جلاؤ۔ اور اس کی وجہ سمجھ میں آئی جب گھر کے ہر کونے میں منوں کوڑا اور گرد و غبار دیکھا۔ ہر دراز سے میلے موزے اور رومال، ہر جیب سے تھیٹر، سنیما فلور شو کی پرچیاں اور ریزگاری، پینٹری[2] میں پانچ دن سے برتن بغیر دھلے پڑے تھے۔ میاں بجائے برتن دھونے کے نئے برتن نکال نکال کر استعمال کرتے جاتے تھے۔ اس طرح درجنوں موزے، رومال، بنیان خرید ڈالے تاکہ پرانے دھونے نہ پڑیں۔ بہرحال رات کو دو بجے تک اودھم مچتا رہا۔ پھر ہمسائے کی گرجدار آواز آئی: "خاموش ـ" ہم عموماً ہمسائے کی بات نہیں سنتے۔ لیکن یہ ہمسایہ ہوائی کا مشہور پہلوان اور ہیوی ویٹ چیمپئن تھا اور نام بھی تھا ہارڈ بائلڈ ہیگرٹی[3] اس لیے اس کی ایک تنبیہ ہی کافی تھی۔ دو منٹ کے اندر سب لڑکے لڑکیاں غائب۔ خیر ہم تھکے ہارے سو گئے۔ واللہ اعلم کب اٹھے۔ میاں دفتر جا چکے تھے۔ ناشتا خود بنایا۔ زندگی میں پہلی دفعہ خود کھانا پکانا تھا۔ اس لیے کام کا پتا ہی نہ چلا۔ اب آٹے دال کا بھاؤ معلوم

۱۔ Waikiki

۲۔ Pantry

۳۔ Hard Boiled Haggerty

ہوا۔ میری بیٹی ناز اور میں نے کمر کس کر سارا دن گھر کی صفائی کی۔ اور لنچ قریبی ہوٹل میں جا کر کھایا۔ رات کو بھی کچھ نہ پکایا۔ جالے چیونٹیاں اور گرد ہٹا ہٹا کر کمر دکھ رہی تھی۔ یہ جو میاں کی سات پشتوں پر احسان کیا تھا۔ شام کو ہم جزیرے کا اولیں معائنہ کرنے کار میں گئے۔ ڈھلتے سورج میں بحرالکاہل کروٹیں بدل رہا تھا اور چاروں طرف زمرد کی آمریت مستحکم ہو چکی تھی۔ تا حدِ نظر سبزہ ہی سبزہ۔ یوں احساس ہوا کہ جزیرے اوواہو[1] میں کہنہ مشق کائنات نئے سرے سے شباب پر آئی ہے اس کے ننھے منے رقبے میں فطرت کا ہر رنگ ہر انگ پایا جاتا ہے۔ سمندر یہاں عمیق تر ہوتا چلا گیا ہے۔ یہ جنوبی یورپ کے آبی کناروں[2] سے زیادہ نیلا اور چمکیلا ہے۔ دوپہر کے وقت اس نیلم کی بھڑک آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے۔ میں نے وجدانی حسن میں اس طرح ڈوبے ہوئے ساحل بہت کم دیکھے ہیں۔

یہاں کے کوہساروں نے اس جزیرے کے گول چہرے کو ایک نیا زاویہ بخشا ہے۔ یہ کہیں سنگلاخ ہیں اور کہیں اتنے سبز کہ ازلی برساتوں کا رین بسیرا معلوم ہوتے ہیں۔

اگلے دن ہم سب نے ہنوما بے' پر پِک نِک منائی۔ یہ جگہ مجھے ایسی بھائی کہ دوڑی چھوٹی ادھر ہی کا رخ کرتی تھی۔ یہاں پانی سب سے مہذب اور شفاف تھا۔ یہ ساحل آبی مخلوق کے لیے مشہور تھا اور ہوائی کی یونیورسٹی دنیا بھر میں علومِ سمندر[3] میں سبقت لے گئی ہے۔

غرضیکہ اول تو قدرت نے اپنے حسن کے لنگر یہاں جاری کر دیے تھے۔ جو کچھ کمی تھی وہ انسان نے پوری کر دی۔ ہوائی بھی خداوندِ عظیم اور اس کے نائب انسان کی مشترکہ سازش کا ایک جاذبِ نظر نمونہ ہے۔ اس شام ہم گھر کا سارا سودا لینے سُپر مارکیٹ گئے۔ بہت سے صاحبان اس ادارے کو جانتے ہیں۔ لیکن بہت سی میری

۱- Oaho
۲- Riverai
۳- Oceanography

ہم وطن بہنیں اس کے متعلق جاننا چاہیں گی۔ تو سنیے سپر مارکیٹ امریکن سرمایہ داری کا مکمل مظاہرہ اور امریکن طرزِ حیات کا بنیادی قلعہ اور اس کی لامحدود افراط کا ذخار ہے۔ جب سے یہ بروئے زمین بر سرِ پیکار ہوا ننھی ننھی دکانیں اور چھوٹے چھوٹے بساطی پنساری دیوالیہ ہو گئے۔ یہ سپر مارکیٹ دس بازاروں کا مہاگرو ہے۔ ساری انار کلی اور مال روڈ کی دکانوں کا سامان اس کی ایک پلیٹ میں سما جائے۔ آپ جب داخل ہوں تو فوراً چار پہیوں والی ٹرالی ساتھ لے لیں کہ ہفتے دو ہفتے کا راشن اس میں ڈالتی جائیں اور جب خود چلتے چلتے تھک جائیں تو اس میں بیٹھ جائیں اور کسی اور سے کہیں کہ آپ کو کھینچے۔ صرف یہ آخری نصیحت میری اختراع ہے' ورنہ درحقیقت سپر مارکیٹ ایسی شیطان کی آنت ہے کہ دل چاہتا ہے کہ خود ٹرالی میں لٹک جائیں۔ اس ادارے کی افراط دیکھ کر انسان ایشیا' افریقہ کی بھوک اور قحط بھول جاتا ہے۔ اس جگہ بلاارادہ اور بلا ضرورت خریداری کرنی پڑتی ہے۔ ہر شے کی پچاس قسمیں اور ہر قسم چھت تک چنی ہوئی۔ ہر دوسرے قدم پر سیل لکھا ہوا۔ اگر نقد نہیں تو ادھار لیجیے۔

سپر مارکیٹ میں جا کر عورت کی آنکھیں اور بٹوے کھل جاتے ہیں۔ ۳۲ ڈالر کی کھانے پینے کی چیزیں لے لیں۔ کار بھر گئی۔ اس سپر مارکیٹ میں الگ نرسری بھی ہوتی ہے' جہاں عورتیں اپنے بچے چھوڑ کر اطمینان سے شاپنگ کرتی ہیں۔ لیکن ایک عورت نے اپنے ڈیڑھ سالہ بچے کی گردن میں کتے جیسا پٹا ڈالا ہوا تھا اور اس کی زنجیر ٹرالی سے باندھی ہوئی تھی۔ وہ سرخ گول مٹول بچہ ماں کے پیچھے پیچھے زنجیر سے بندھا ہوا لڑھکتا چلا آ رہا تھا جیسے کوئی پالتو پلّا ہو۔

میاں نے ہمارے پیچھے کچھ گھر کا سامان مثلاً سیکنڈ ہینڈ کار' ٹیلی ویژن' صوفہ گراموفون' ٹیپ ریکارڈر اور باغ کی ہلکی کرسیاں وغیرہ خرید رکھا تھا۔

اتنا سلیقہ میرے میاں میں کہاں سے آ گیا۔ مجھے نہیں معلوم۔ لیکن یہ سب ایک دکان کے توسّل سے ہوا۔ جو غریب' مفلوجوں اور یتیموں کے لیے چلائی گئی تھی۔ اس لیے میرے میاں نے خیرات کے جذبے میں اپنے گھر کو پھٹیچر فرنیچر سے بھر لیا۔ کار

لے sale

۱۸۵۷ء کا ماڈل تھی۔ جب چلتی تو دنیا دیکھتی تھی اور جب رکتی تھی تو دنیا شکر کرتی تھی۔ اس کے پُر اَسرار پٹاخے نہ معلوم کہاں سے چھوٹتے تھے۔ ہم نے جاتے ہی کام بانٹ لیے۔ میں کھانا پکاؤں گی بیٹی صفائی کرے گی۔ میاں' بولے ہم تمھاری ڈرائیوری کریں گے۔ ہم لاجواب ہو گئے۔ اس لیے کوئی اور کام ان کو نہ دیا کیونکہ اس کار کو چلانا ان ہی کا کام تھا۔ میں باہر ملک میں اگر کار چلاؤں تو کم سے کم مانوس ڈھانچہ تو ہو۔ اس کم بخت کے گیئر[1] کدھر اور بریک[2] کدھر۔ بالکل بے سروپا۔ لیکن شاباش ہے اس کار پر کہ ہزاروں میل سیریں کیں لیکن اس نے ایک دفعہ بھی دغا نہ دی۔ پرانا ٹیلی ویژن کچھ ایسا برا نہ تھا۔ دو دھپ لگاؤ یا گرم کمبل ڈالو تو اس کے کالے سفید تر مرے ناچنے بند ہو جاتے تھے۔ پھر گھنٹوں صحیح چلتا تھا۔ جب تک کہ چینل نہ بدلو۔ چینل بدلی اور پھر وہی دھموکے تھپڑ۔ گرم پانی کی بوتل' وہ پھر چل پڑا۔

تو صاحب یہ تو ہوائی کا ازدواجی رخ تھا۔ اب تک گرہستن ماں' بیوی' بول رہی تھی۔ لیکن یہ گرہستن ماں بیوی دو وقت بلکہ اگلے دو دن کا اکٹھا کھانا پکا کر ریفریجریٹر میں بھر کر آزادی کا سانس بھی لیتی تھی۔ جگہ جگہ سیر پر خود نکل جاتی تھی۔ لائبریریوں سے گود بھر بھر کر جزائر ہوائی بلکہ سارے بحرالکاہل کے جزائر پر کتابیں لاتی تھی۔ آہستہ آہستہ لوگوں سے ملاقات' پروفیسر صاحبان سے گفتگو۔ سیاحوں اور طلبہ سے میل جول' بہت اچھا وقت گزرا۔ ہونولولو کے مختلف مدارج ابھرنے شروع ہوئے اس کی ہمہ گوں زندگی کی چاشنی کا چسکا لگ گیا۔

ہوائی میں امریکہ کی فیڈرل حکومت[3] نے ایک عظیم الشان مرکز کھولا ہے جسے "ایسٹ ویسٹ سنٹر[4]" کہتے ہیں۔ اس کی حسین حدود اور عمارات میں مغرب اور مشرق کے عُلما مدعو کیے جاتے ہیں۔ جو سینئر سکالرز[5] کہلاتے ہیں۔ وہ مرکز کے خرچ پر آتے ہیں۔ ہزار بارہ سو ڈالر کا وظیفہ ہر مہینے پاتے ہیں۔ اس ننھے سے وظیفے میں ایک

۱۔ Gear

۲۔ Brake

۳۔ Federal Gevernment

۴۔ East West Centre

۵۔ Senior Scholars

خاندان ٹھاٹ کر سکتا ہے۔ دس مہینے یا سال کورس کی میعاد ہوتی ہے۔ اس دوران میں جو مرضی آئے کیجیے، پڑھیے لکھیے، ریسرچ کیجیے، تاثرات قلمبند کیجیے، کوئی پابندی نہیں، کوئی امتحان نہیں۔ کوئی کلاس نہیں۔ کوئی وقت نہیں۔ میرے میاں اس آزادی پر مگن تھے۔ آپ کا آرام دہ کمرہ، ٹائپ رائٹر، غسل خانہ، بہترین لائبریری، ساتھ ہی سستا اور مزے کا ریستوران، اردگرد لڑکے، لڑکیاں، آزادی کی فضا۔ اکثر عالم سگریٹ کا دھواں اور غپ اڑاتے پائے جاتے تھے لیکن کوئی رپورٹ کرنے والا نہیں تھا۔ کچھ عالم کتابیں بھی لکھ جاتے ہیں جو یہ مرکز بہت فخریہ شائع کرتا ہے۔

اب ایک سی ایس پی کے لیے "سینئر سکالر" بننا بہت آسان ہے۔ سینئر تو وہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے، اسے کبھی بچپن میں بھی غلطی سے کسی نے جونیئر نہیں کہا۔ اب رہا سکالر، تو سی ایس پی کا بلا ملتے ہی وہ عالم بھی بن جاتا ہے۔ ضلع میں ہر کتاب پر اسی کا پیش لفظ ہوتا ہے۔ کالج کے "کانووکیشن"[1] پر وہ عالمانہ تقریر جھاڑتا ہے۔ اس کے فتوے پر نکاح ٹوٹتے ہیں۔ اور بی ڈی جڑتے ہیں۔ آرٹ کونسل، اسلامی مشاورتی کونسل، فلسفہ والسنہ کی مجلسوں، سائنس کے ایوانوں کا چیئرمین اسی کرسی کا بندہ ہوتا ہے۔ اس لیے ایک سی ایس پی کے لیے ہوائی میں "سینئر سکالر کہلانا کوئی معیوب یا مضحکہ خیز بات نہیں۔ اس میں جو بھی ہو، طنز ہرگز شامل نہیں۔

ہاں تو ایسٹ ویسٹ سنٹر اور ہوائی کی یونیورسٹی میں یوں تو ارضی قربت ہے لیکن ازلی رقابت بھی ہے۔ کسی حد تک یہ رقابت صحت مند بھی ہے۔ امریکہ کے بہترین پروفیسر اور اعلیٰ ذہن سردی گرمی لیکچر کے لیے بلائے جاتے ہیں۔ طرح طرح کی نمائشیں، فلم، جشن منائے جاتے ہیں۔ اس کی جدید عمارات کے سامنے لمبی سے لمبی موٹریں جو آدھی طلبہ کی اور آدھی پروفیسروں کی ہوتی ہیں، امریکہ کی افراط کا صحیح ثبوت ہیں۔

اس مغرب و مشرق کے مرکز کا ایک جاپانی باغ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ اتنا "ایمان شکن ہے" کہ میں اکثر لائبریری جاتے جاتے اس میں گھس جاتی تھی۔ جزائر

---

[1] Convocation

"ٹہیٹی کے پھول خصوصاً گارڈینیا، زرد چنبیلی، کنول، کچا کچا سبزہ، نڈھال پانی اور رنگین مچھلیاں اور اس کی پشت پر متنوّع درختوں کا ذخیرہ۔

اس ایسٹ ویسٹ سنٹر کے علاوہ یونیورسٹی کا میلوں میں پھیلا ہوا احاطہ بھی ایک دیدہ زیب سبزہ زار ہے۔ ہر قدم پر گل آویزاں رَوِشیں اور بتدریج باڑیں۔ لیکن اس کے علاوہ جو سب سے دل پذیر عنصر اس فضا میں پایا جاتا تھا وہ تھا بین الاقوامی طلبہ کا ربط ضبط۔ جنوبی بحرالکاہل سے لے کر جاپان، انڈونیشیا، برما، ملایا، فلپائن، کوریا، ویتنام، فجی کے جزائر، آسٹریا، آسٹریلیا، پاکستان، ہندوستان، یورپ اور امریکہ کے جواں سال جوئندگانِ علم۔ یہ معاشرتی تنوّع بھی ایک تعلیمی حیثیت رکھتا تھا۔ یہاں بھانت بھانت کے لڑکے لڑکیوں سے ملنا جلنا، تبادلہ خیالات کرنا، طرح طرح کے کھانے طرح طرح کے گانے، طرح طرح کے رقص، ہنستے کھیلتے انسان، بے شمار نئی باتیں سیکھ لیتے تھے۔

(دھنک پر قدم)

سوالات

ا۔ مندرجہ ذیل جملوں کی وضاحت کیجیے:

الف۔ نیچے بحرالکاہل ہوتا ہے اور اوپر خدا، کہیں زمین کا ذرا سا ٹکڑا بھی ڈھارس کے لیے دکھائی نہیں دیتا۔

ب۔ اگر ۲۶ کو جانا ہو تو ۲۵ کی سیٹ بک کراؤ کیونکہ وہ چودہ سو چالیس منٹ سے کم لیٹ ہونا کسر شان سمجھتی ہے۔

ج۔ خدا کسی شریف انسان کو کلکتہ نہ لے جائے۔ اگر مرزا غالب نے اس میں کچھ دیکھا تو ہندوستانی کسٹم آفیسر اور بنیا پولیس سے پہلے دیکھا ہوگا۔

د۔ سارا سفر آسمانوں میں ریشم کی طرح سرسر کرتا گزر گیا۔

ہ۔ ڈھلتے سورج میں بحرالکاہل کروٹیں لے رہا تھا اور چاروں طرف۔

زمرد کی آمریت مستحکم ہو چکی تھی۔

ز۔ سپر مارکیٹ امریکن سرمایہ داری کا مکمل مظاہرہ اور امریکن طرز حیات کا بنیادی قلعہ اور اس کی لامحدود افراط کا ذخار ہے۔

۲۔ درج ذیل محاورات اور ضرب الامثال کو جملوں میں استعمال کیجیے:

اوکھلی میں سر دیا تو دھمکوں سے کیا ڈرنا' دھکے کھانا' انا للہ پڑھنا۔ خاک چھاننا' بلی کی طرح گھر بدلنا' شیطان کی آنت ہونا۔

۳۔ "سفرنامہ کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے پڑھنے والوں کو معلومات اور تفصیل مہیا کرے اس طرح کہ پورا ماحول سمجھ میں آجائے" آپ نے اپنے ملک میں یا ملک سے باہر کسی جگہ کا سفر کیا ہو تو اس کا حال اپنے لفظوں میں لکھیے۔

۴۔ تشبیہ کے معنی ہیں کسی خاص لحاظ سے ایک شے کو کسی دوسری شے جیسا ظاہر کرنا جیسے:

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا

اوس کے قطروں کو موتیوں سے تشبیہ دی ہے۔

جس چیز کو کسی دوسری چیز سے تشبیہ دی جائے اسے مشبّہ اور جس سے تشبیہ دی جائے وہ مشبّہ بہ کہلاتی ہے۔ اس شعر میں اوس کے قطرے مشبّہ اور موتی مشبّہ بہ ہے۔ جو معنی مشبّہ اور مشبّہ بہ میں مشترک ہوں وہ وجہِ شبہ کہلاتے ہیں۔ اوس کے قطروں اور موتیوں میں آب وتاب ایسی چیز ہے کہ دونوں میں پائی جاتی ہے' یہی وجہِ شبہ ہے۔ مشبہ کی رفعت اور حسن یا تحقیر ذلت یا رعب وہیبت وغیرہ صفات کو ظاہر کرنا غرضِ تشبیہ کہلاتا ہے۔ اس مثال میں اوس کے قطروں کی خوشنمائی اور چمک دمک ظاہر کرنا غرضِ تشبیہ ہے۔ مانند' مثل' جیسا' برابر وغیرہ کو حروفِ تشبیہ کہتے ہیں۔ کلام میں یہ کبھی آتے ہیں اور کبھی نہیں۔

اس سبق میں چند تشبیہات استعمال ہوئی ہیں آپ کسی ایک تشبیہ کی نشاندہی کر کے اس میں سے ارکانِ تشبیہ کی وضاحت کیجیے۔

○☆○☆○☆○☆○☆○

عبد الحلیم شرر

(۱۸۶۰ء - ۱۹۲۶ء)

فردوسِ بریں

("فردوس بریں" کی داستان کا موضوع فرقہ باطنیہ کی تحریک کا وہ طوفان بلاخیز ہے جو چھٹی صدی ہجری کے اوائل سے شروع ہوا اور مسلسل ڈیڑھ سو سال تک عالمِ اسلام میں تباہی و بربادی پھیلانے کا موجب بنا رہا۔ باطنین نے کوہسار طالقان میں ایک مصنوعی جنت بنا رکھی تھی۔ یہ جنت ایک طرف تو باطنیوں کے فرماں روا اور روحانی پیشوا کا عشرت کدہ تھی اور دوسری طرف اس جنت کے فریب سے لوگوں کو باطنی فدائی بنانے کا کام لیا جاتا تھا۔

داستان کا بنیادی کردار حسین اور اس کی ہونے والی رفیقہ حیات زمرد اپنے شہر آمل سے حج کا ارادہ لے کر نکلتے ہیں۔ اثنائے سفر میں ان کا گزر سلسلہ کوہ طالقان کی اس وادی سے ہوتا ہے جس میں سے صاف و شفاف نہر ویرنجان گزرتی ہے۔ اس وادی میں پہنچ کر زمرد اپنے بھائی موسیٰ کی قبر تلاش کرتی ہے جس کے متعلق اس نے سن رکھا تھا کہ وہ پریوں کے ایک غول کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ قبر مل جاتی ہے مگر اس کے تھوڑی ہی دیر بعد انھیں پریوں کا ایک غول نظر آتا ہے، جسے دیکھ کر دونوں بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ حسین ہوش میں آتا ہے تو اسے موسیٰ کی قبر کے پاس ہی زمرد کی قبر بھی بنی ہوئی ملتی ہے۔ وہ محبوبہ کی قبر کا مجاور بن کر بیٹھ جاتا ہے اور کافی عرصے بعد اس وقت وہاں سے رخصت ہوتا ہے جب اسے زمرد کا خط ملتا ہے، جس میں اسے یہ ہدایت کی گئی ہے کہ وہ شیخ علی وجودی کی خدمت میں حاضر ہو اور جو کچھ وہ کہیں اس کی بے چون و چرا تعمیل کرے،

اس لیے کہ جس جنت میں زمرد ہے اس میں پہنچنے کی یہی سبیل ہے۔
حسین تعمیل کرتا ہے اور سختیاں جھیلتا ہوا شیخ تک پہنچتا ہے اور فنا فی
الشیخ کی منزل پر پہنچ کر شیخ کے حکم سے ایک بہت بڑے عالم امام نجم
الدین نیشاپوری کو قتل کرتا ہے اور اس کے صلے میں وہ بہشت
بریں کی سیر کرتا ہے۔)

حسین کو نہیں خبر کہ یہ غفلت کتنی دیر تک اس پر طاری رہی، لیکن مدہوشی تھوڑی تھوڑی کم ہوئی تھی اور نشہ غفلت اترنا شروع ہوا تھا۔ حسین نے اس وقت اپنے آپ کو اس حالت میں پایا کہ ایک طلاکار اور مرصع کشتی میں سوار ہے اور نازک بدن اور پری جمال لڑکوں کی کوشش سے وہ کشتی ایک پتلی مگر بہت ہی دل کش نہر کے کنارے ابھی ابھی آکے ٹھہری ہے۔ نرم اور نظر فریب سبزے کو شفاف اور پاک وصاف پانی اپنی روانی میں چومتا ہوا نکل جاتا ہے۔ بعض مقامات پر گنجان اور سایہ دار درخت ہیں جو پیچیدہ اور خم دار زلفوں کی طرح نہر کی گوری مگر خم آلود پیشانی پر دونوں طرف سے جھک پڑے ہیں۔ مگر جہاں پر کشتی آکے کنارے لگی ہے وہاں ایک کشادہ مرغزار ہے۔ ان خوبصورت ملاحوں کے کہنے کے بموجب وہ کشتی سے اتر کے سبزہ زار کی سیر کرنے لگا۔ وہاں جا کے دیکھا تو اور حیرت ہوئی۔ پانی کے پاس ہی سے سبزے کا ایک پتلا اور برابر حاشیہ چھوڑ کے شگفتہ اور خوش رنگ پھولوں کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے جو نہر کے دونوں جانب حدِ نظر تک پھیلتے چلے گئے ہیں۔ اگرچہ پھولوں میں شادابی وخوش رنگی کی وہی شان ہے جو صرف خود رُو پھولوں میں نظر آتی ہے مگر اس قدرتی بہار کے ساتھ یہ لطف بھی ہے کہ نہایت ہی لیاقت بلکہ بظاہر مافوق العادت ہوشیاری ودانائی سے چمن بندی کی گئی ہے۔ چمنوں کی بعض قطاریں تو ایسی ہیں جن میں ایک ہی قسم اور ایک ہی رنگ کے پھول ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ایک ہی قوم اور ایک ہی وردی کی فوج مختلف کمپنیوں میں تقسیم ہوتی حدِ نظر تک چلی گئی ہے۔ مگر اکثر چمن ایسے ہیں جن میں مختلف رنگ کے پھولوں کو ترتیب دے کے زمین پر ایسی ایسی گل کاریاں کی گئی ہیں کہ عقلِ انسانی حیرت میں آجاتی ہے۔ سارا مرغزار اور ساری وادی جو کوسوں تک پھیلی ہوئی ہے اور جسے خوب صورت، متوازی اور سرسبز وشاداب

پہاڑوں نے اپنے حلقے میں کر لیا ہے' از سرتاپا ان ہی چمنوں اور پھولوں سے بھری ہے اور مختلف نہریں جو آبشاروں کی شان سے اور پانی کی چادریں بن بن کے پہاڑوں سے اتری ہیں' ان ہی چمنوں اور پھولوں کے درمیان میں جابجا بہ رہی ہیں اور ان کے پانی نے خواہ پھولوں کی خوش بو سے متاثر ہو کے یا کسی اور وجہ سے گلاب اور کیوڑے کی شان پیدا کر لی ہے۔ یہ نہریں زبان حال سے پکار پکار کے کہ رہی ہیں کہ ہم ہی تسنیم و سلسبیل ہیں۔[1] راستوں اور روشوں کی ترتیب میں یہ معجزنما کیفیت پیدا ہو گئی ہے کہ ہر چمن کے ایک پہلو کو نہر دھوتی ہے تو اس کے دوسرے پہلو کو ایک چھوٹی سی خوش نما سڑک اپنے آغوش میں لیتی ہے۔ یہ سڑکیں چمن سے بھی زیادہ کمال صناعی دکھا رہی ہیں۔ مختلف قسم اور مختلف رنگ کے سنگ ریزوں سے ان سڑکوں کی تعمیر میں کام لیا گیا ہے اور ہر سڑک پر ایک خاص رنگ کے سنگ ریزے بچھا کے کوئی سڑک فیروزے کی' کوئی زمرد کی' کوئی یاقوت کی اور کوئی نیلم کی بنا دی گئی ہے۔ پھر ترتیب میں یہ لطف ہے کہ جس رنگ کے پھولوں کا چمن ہے اسی کے مناسب و موزوں رنگ کی پتلی خوش نما سڑک اس کے پہلو سے گزری ہے۔ نغمہ سنج طیور ان چمنوں میں اڑتے پھرتے ہیں۔ پھولوں کے قریب بیٹھ بیٹھ کے عشق و محبت کی داستان سناتے ہیں اور خدا جانے کس کمال استادی سے تعلیم دی گئی ہے کہ اکثر آنے جانے والے جہاں دیگر اطراف سے پری پیکروں کے نورانی گلوں سے خیر مقدم کا ترانہ سنتے ہیں' وہاں ان نغمہ سنج طائروں کا بینڈ بھی اپنے قدرتی ارغنون سے یہی کلمہ خیر مقدم سناتا ہے کہ "سَلَامٌ عَلَیْکُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خَالِدِیْنَ"۔[2]

حسین نے نہایت ہی جوش و حیرت سے دیکھا کہ ان ہی چمنوں میں جا بجا نہروں کے کنارے کنارے سونے چاندی کے تخت بچھے ہیں جن پر ریشمی پھول دار کپڑوں کا فرش ہے۔ لوگ پُر تکلف اور طلائی گاؤ تکیوں سے پیٹھ لگائے بیٹھے ہیں اور جنت کی بے فکریوں سے لطف اٹھا رہے ہیں۔ خوب صورت خوب صورت آفت روزگار لڑکے کہیں تو سامنے دست بستہ کھڑے ہیں اور کہیں نہایت ہی نزاکت اور دل

۱۔ جنت میں دو مشہور نہروں کے نام

۲۔ تم پر سلامتی ہو' تم خوش رہو۔ پس جنت میں ہمیشہ کے لیے داخل ہو جاؤ۔

فریب حرکتوں سے ساقی گری کرتے ہیں۔ طیور پھل دار درختوں سے پھل توڑ توڑ کے لاتے ہیں اور ان کے سامنے رکھ کے اڑ جاتے ہیں۔ پھل ہی نہیں، یہ خوش نما طیور کپڑوں میں لپٹے ہوئے کبابوں کی پوٹلیاں بھی لاتے ہیں۔ سب سے زیادہ جس چیز نے حسین کو متوجہ کیا، وہ یہ بات تھی کہ یہ سب لوگ بے غل و غش نہایت بے فکری واطمینان سے ان لذتوں کے مزے لوٹ رہے تھے اور خبر بھی نہ ہوتی تھی کہ پاس سے کون گزرتا ہے اور انھیں کس نظر سے دیکھتا ہے۔ نہ کسی کو کسی سے حسد تھا اور نہ کسی کو کسی لطف کے چھپانے کی ضرورت تھی:

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد
کسے را با کسے کارے نباشد[1]

یہ عالم دیکھ کے حسین کے دل میں ایک جوش و ولولہ پیدا ہوا۔ اس نے کسی قدر بلند آواز سے کہا: "بے شک فردوس بریں یہی ہے! یہیں آکے نیکو کاروں اور ایمانداروں کو اپنے اعمالِ نیک کا صلہ ملتا ہے۔ مگر افسوس! اے زمرد تو کہاں.....؟" یہ جملہ ناتمام ہی تھا کہ پاس کے چمن کے پھولوں کے نیچے سے ایک شیریں و دل کش آواز میں کسی نے کہا: "تو ابھی جنت کے چمنوں ہی کو دیکھ رہا ہے، ذرا محلوں اور قصروں کو بھی نظر اٹھا کے دیکھ!"

حسین نے نظر اٹھا کے اس رفیع الشان قصر کو دیکھا اور اس کے ساتھ ہی اس کی نظر دیگر عمارتوں پر بھی جا پڑی اور اسے نظر آیا کہ یہ عمارتیں باغوں سے بھی زیادہ حیرت انگیز ہیں۔ بعض بالکل سونے کی، بعض چاندی کی، بعض مونگے کی اور بعض موتیوں کی نظر آتی ہیں۔ یہ تمام مکانات جو حسبِ حیثیت محل، قصر اور کوشک[2] کے لفظ سے تعبیر کیے جا سکتے ہیں۔ مذکورہ اشیا کے علاوہ ان میں کوئی فیروزے کا، کوئی زمرد کا، کوئی یاقوت کا اور کوئی ہیرے کا ہے۔ موتی کے محل جن میں سے ایک خاص حسین کے لیے ہے، کچھ ایسے آب دار رنگ میں رنگے ہوئے ہیں کہ نیچے سے اوپر تک ایک ہی

۱۔ جنت ایسی جگہ ہے جہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ کسی کو کسی سے کوئی سروکار نہ ہوگا۔
۲۔ محل اونچی اور بلند عمارت

موتی میں ترشے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں جا بجا صدفِ صادق کے جھلکتے ہوئے ٹکڑے جڑے ہیں۔ تمام محلوں پر علاوہ اس رنگ کے جس کی طرف محل منسوب ہیں، ہر در و دیوار کے گرد بلور اور شیشے کے ٹکڑوں کا حاشیہ بنا ہوا ہے اور ان شیشوں کے نیچے ڈاک دی ہوئی ہے۔ یہ آئینے دن کو آفتاب کی ضو میں اور رات کو ہزارہا کافوری شمعوں کی روشنی میں اس قدر جگمگا اٹھتے ہیں کہ تیز سے تیز نگاہ خیرگی کرنے لگتی ہے۔ اس کے علاوہ ان ہی دیواروں میں اندر باہر جواہرات بھی جڑے ہیں جو اپنی کرنیں چمکا چمکا کے ایک عجیب لطف پیدا کرتے ہیں۔ بہرتقدیر اس مجموعی سامان، سنہرے، روپہلے اور رنگ برنگ قصروں، ان کے آئینوں اور جواہرات نے ہر چہار طرف ایک ایسی نور کی کیفیت پیدا کر رکھی ہے کہ نظر پڑتے ہی انسان کے دل میں ایک جوش اور ولولہ پیدا ہو جاتا ہے۔

حسین ان محلوں کو دیکھ کے ذرا تھوڑی دیر تک تو مبہوت کھڑا رہا مگر ہوش آتے ہی اس خاص محل کی طرف دوڑا جس کی نسبت اس پری پیکر حور کی زبانی سنا تھا کہ خاص اس کے لیے ہے اور جس میں پیاری زمرد کے ملنے کی امید تھی۔ اب اس کے جذبات دلی اس جوش و خروش سے زمرد کی طرف متوجہ تھے کہ اس نے نہ کسی چیز کی طرف نظر اٹھائی، نہ کسی سامانِ عشرت کو دیکھا اور سیدھا اس قصرِ دُری کے دروازے پر جا پہنچا۔ زمرد بھی استقبال کے لیے محل کے باہر نکل آئی تھی اور ایک غیر معمولی مگر نہایت دل ربا وضع سے بال کھولے اور زلفوں کو شانوں اور پیٹھ پر بکھرائے کھڑی تھی۔

حسین : (آنسو پونچھ کے) زمرد! یہی فردوس بریں ہے؟

زمرد : یہی!

حسین : تم یہاں چلی آئیں اور مجھے اسی درد و اَلم میں چھوڑ دیا؟

زمرد : یہ میرے اختیار کی بات تھی؟ مجھے تو ایک اتفاقی شہادت نے یہاں پہنچا دیا مگر تمھاری زندگی باقی تھی اور ضرور تھا کہ اتنے مدارج و مراحل طے کر کے یہاں آؤ۔ مگر سچ کہتی ہوں کہ اس جنت میں بھی تمھارے فراق نے کبھی چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ کیا کہوں کن دشواریوں سے مجھے اتنی اجازت ملی ہے

کہ تمھیں اپنے پاس آنے کا راستہ اور طریقہ بتاؤں۔

حسین: میرے تو ایسے اعمال تھے کہ شاید مر کے بھی یہاں نہ پہنچ سکتا صرف تمھاری محبت تھی جو خضرِ طریقت بن کے لائی۔

زمرد: لیکن اگر تمھارے دل میں طلب صادق نہ ہوتی تو میں کیا کر سکتی تھی؟

حسین: مگر اس طلب سے یہ تھوڑا ہی ممکن تھا کہ میں اس ملاء اعلیٰ میں آ پہنچتا۔ میں تو دل میں ٹھان چکا تھا کہ اس قبر کے پاس اور اس چٹان کے سامنے جس پر تمھارا پیارا نام کندہ ہے، پڑے پڑے دم توڑ دوں گا۔

زمرد: خیر یہ باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی، اب اندر چل کے آرام سے بیٹھو، شراب طہور کے دو ایک جام پیو اور دیکھو اس خداوندِ جل وعلانے تمھارے لیے کیسے کیسے سامانِ راحت اور کیسی کیسی لذتیں فراہم کر رکھی ہیں۔

یہ کہہ کے زمرد حسین کو اندر لے گئی۔

جس وقت حسین نہر کے کنارے کشتی سے اترا ہے، سرِ شام کا وقت تھا، مگر اب رات ہو گئی تھی۔ ہر طرف کافوری شمعیں روشن ہوئیں اور ایک خاص قسم کی ٹھنڈی روشنی جس کا پتا نہ چلتا تھا کہ کہاں سے آتی ہے اور کیوں کر پیدا ہوتی ہے، دروازوں، بلند کھڑکیوں اور چھت کے روشن دانوں سے رہ رہ کے چمک اٹھتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ گویا یکایک ہزار ہا مہتابیاں چھوڑ دی گئیں۔ اس غیبی روشنی کو حسین نے حیرت سے دیکھا اور دریافت کرنے کے لیے کہ یہ کیسی روشنی ہے، وہ بار بار دروازے سے جھانک کے باہر دیکھتا مگر کچھ حال نہ کھلا۔ صرف اتنا معلوم ہوا کہ اس روشنی کا مرکز ونشاگرد کی پہاڑیوں کی چوٹیوں پر ہے، جہاں وہ زیادہ چمکتی ہے اور وہیں سے اس کی کرنیں آکے تمام مکانات کو روشن کر دیتی ہیں۔ ایک یہ بات بھی اس نے دیکھی کہ یہ روشنی جب پوری تیزی اور کمال پر آجاتی تو چاروں طرف سے لوگ چلّا اٹھتے: "هٰذَا الَّذِیْ مَا وَعَدَنِیْ رَبِّیْ[1]" بلکہ سب کے ساتھ ایک بے اختیاری کے جوش میں یہی کلمہ

---

[1] یہی ہے جس کا میرے رب نے وعدہ کر رکھا تھا۔

خود حسین کی زبان سے بھی کئی مرتبہ نکل گیا۔ جب اس روشنی کا راز حسین کے حل کیے نہ حل ہو سکا تو اس نے زمرد سے پوچھا: "یہ کیسی روشنی ہے؟"

زمرد: تم نے نہیں پہچانا؟ یہی وہ نُورِ الٰہی ہے جو موسیٰ کو وادیٔ ایمن[1] میں نظر آیا تھا۔ تم نے قرآن و احادیث میں پڑھا ہے کہ جنت میں خدا کا دیدار ہو گا' اس سے یہی نور عبارت ہے۔

اب حسین نے مکان کے فرش اور تمام سامان کو دیکھا اور اسے یقین ہو گیا کہ یہ سب نوری سامان ہے جو دنیا میں نہ کبھی انسان کے دل میں گزرا ہے اور نہ کسی کے قیاس و گمان میں آسکتا ہے۔

زمرد: یہی محبت تمھیں یہاں لائی ہے' ورنہ یہ وہ مقام ہے جہاں کسی زندہ انسان کا بہت کم گزر ہوا ہے۔ یہ تمھاری بڑی فضیلت ہے کہ اس جسمِ خاکی کے ساتھ اس نورستان میں آپہنچے۔

حسین کو جنت میں پھرتے پورا ایک ہفتہ گزر گیا اور یہ ہفتہ اس حالت میں گزرا کہ دل کش اور نشاط انگیز نغموں کی آواز اکثر کانوں میں گونجتی رہتی اور گو بہت سی حوریں اس کی خدمت کو حاضر تھیں اور سب پری جمال و زاہد فریب تھیں مگر اسے زمرد کے سوا کسی سے کچھ علاقہ نہ تھا۔ دونوں ہمیشہ فرحت بخش وادیوں اور روح افزا مرغزاروں میں ٹہلتے رہتے۔ زمرد نے اتنے ہی زمانے میں پھرا پھرا کے اسے یہاں کی تمام نزہت گاہیں اور سب دل چسپ مقامات دکھا دیے۔ ایک مرتبہ حسین نے کہا: "زمرد! میں تو سنتا تھا کہ جنت میں ہمیشہ صبح کا وقت رہتا ہے مگر آکے دیکھا تو یہاں بھی وہی دنیا کے سے تغیراتِ زمانہ موجود ہیں!"

زمرد: اس امر میں لوگوں سے سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ ہر وقت صبح رہتی ہے' اس کا یہ مطلب نہیں کہ اور کسی وقت کا لطف انسان یہاں اٹھا سکتا ہی نہیں۔ ایسا ہو تو جنت سے ایک بڑا لطف اٹھ جائے۔ اصل

1۔ لغوی معنی مبارک وادی۔ مراد وہ دامنِ کوہ ہے جہاں حضرت موسیٰ کو خدا کا جلوہ نظر آیا تھا۔

مطلب یہ ہے کہ یہاں ہر وقت کوئی ایسا مقام ضرور مل جائے گا جہاں انسان جس وقت کا لطف چاہے اٹھالے۔

حسین : یہ کیوں کر؟

زمرد : زبان سے کہنے کی نہیں، میں چل کے تمھیں آنکھوں سے دکھائے دیتی ہوں۔

یہ کہ کے زمرد اسے ساتھ لیے ہوئے قصرِ دُرّی سے باہر نکلی اور کہا: "دیکھو یہاں دوپہر کا سماں ہے، اب آگے چلو۔"

تھوڑی دیر بعد دونوں ایک ایسے درختوں سے گھرے ہوئے سبزہ زار میں پہنچے جہاں آفتاب کی روشنی کو درخت روکے تھے۔ ہر طرف سے اندھیرا جھکا ہوا تھا اور مشرقی قلہ ہائے کوہ سے ایک ہلکی ہلکی روشنی نمودار تھی۔ زمرد یہاں پہنچ کے بولی: "دیکھو یہ صبح کا وقت ہے، ہے نا؟"

حسین : بے شک ہے۔

زمرد : آگے چلو۔

یہاں سے روانہ ہو کے تھوڑی دیر میں دونوں ایک ایسی چھوٹی سی وادی میں پہنچے جو ہر طرف سے پہاڑیوں میں گھری ہوئی تھی۔ یہاں بھی درختوں نے خفیف تاریکی پیدا کر دی تھی اور ذرا فاصلے کے مقامات پر ہلکا ہلکا دھواں اٹھتا نظر آرہا تھا، کہیں کہیں چراغ جلنے لگے تھے، طیور کے چہچہانے کا شور بلند تھا اور مغرب کے قلے پر آفتاب کے غروب ہونے کی سی شعاع نظر آرہی تھی۔ زمرد نے یہاں رک کے کہا "اور یہ شام ہوئی۔"

حسین : اس میں کسے شک ہو سکتا ہے!

زمرد : دن کا سماں دیکھ چکے، صبح دیکھ چکے اور شام بھی دیکھ لی، صرف رات کا لطف باقی ہے، چلو وہ بھی دکھائے دیتی ہوں۔

یہاں سے واپس آکے زمرد حسین کو لیے ہوئے ایک پہاڑ کے غار میں داخل ہوئی جہاں نہایت خوبی سے ایک نشیبی راستہ بنا ہوا تھا۔ زینے نہ تھے بلکہ زمین جو پختہ،

مُنطّع اور رنگ برنگ تھی، ساعت بہ ساعت نیچی ہوتی جاتی تھی۔ اس زمین دوز راستے میں جاتے جاتے دونوں ایک نہایت ہی عالی شان اور پر تکلف قصر میں پہنچے، جس میں ہر جگہ کافوری شمعیں روشن تھیں۔ جھاڑ اور فانوس کثرت سے لٹک رہے تھے اور درودیوار پر بلور اور شیشے کے رنگ برنگ ٹکڑوں کو ان شمعوں کی شعاعیں کچھ ایسی عجیب وغریب روشنی سے چمکا رہی تھیں کہ نظر خیرہ ہوئی جاتی تھی۔

زمرد: دیکھو یہ رات ہے اور کیسی پیاری رات!

حسین: پیاری زمرد! اگر تو ساتھ ہو تو ہر چیز پیاری ہے۔

مگر پیشتر کے برخلاف زمرد اب کسی قدر افسردہ سی تھی۔ اس کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ گو زبردستی کوشش کر کے چہرے کو بشاش بناتی ہے مگر دل اندر سے بیٹھا جاتا ہے۔ حسین نے اس امر کو حیرت سے دیکھا اور کہا: "زمرد! اس فردوسِ بریں میں بھی آج تم مجھے ملول نظر آتی ہو؟"

زمرد: نہیں، مگر ہاں! گذشتہ مفارقت کسی کسی وقت یاد آجاتی ہے تو خواہ مخواہ دل بھر آتا ہے۔

حسین: مگر خدا نے وہ مصیبت کاٹ دی اور اب امید ہے کہ ہم دونوں ہمیشہ یوں ہی لطف اٹھاتے رہیں گے۔

زمرد: خدا کرے ایسا ہو، مگر حسین ابھی مجھے اس کی امید نہیں۔

حسین: (حیرت سے) امید نہیں؟ یہ جنت ہے جس کے لطف سرمدی وابدی ہیں۔ یہاں نہ کسی دشمن کا اندیشہ ہو سکتا ہے، نہ کسی حاسد کا حسد۔ پھر ناامیدی وحسرت نصیبی کا کیا سبب؟ "وَلَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَتِہِ اللّٰہِ"[1]

زمرد: بے شک، مگر حسین تم یہاں قبل از وقت آئے ہو اور ابدی اور سرمدی لطف اٹھانے کے لیے وہی لوگ آتے ہیں جو مرنے کے بعد دنیا سے قطع تعلق کر کے آئیں۔ تم نے ابھی اس مادی دنیا کے علائق قطع نہیں کیے اور اس مادی

1۔ اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔

جسم کو ساتھ لائے ہو جس کو وہیں دنیا میں چھوڑنے کے لیے تمھیں ایک دفعہ اس عالم میں ضرور جانا ہے۔

حسین : افسوس! پھر میں کب جاؤں گا؟

زمرد : جب حکم ہو جائے، مگر مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ جلدی جانا پڑے گا' اس لیے کہ وہاں کی کئی شدید ضرورتیں تمھیں بلا رہی ہیں۔

حسین : (رو کر) پھر اب تو مجھ سے تمھارے فراق کی مصیبت نہ برداشت کی جائے گی۔ جاتے ہی اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالوں گا اور تم سے چھوٹے ایک گھڑی بھی نہ گزری ہوگی کہ پھر تمھارے پاس آپہنچوں گا۔

زمرد : کہیں ایسا غضب بھی نہ کرنا۔ خودکشی کرلی تو جنت تم پر حرام ہو جائے گی۔ پھر تو قیامت تک بھی ملنے کی امید نہ رہے گی۔

حسین : (زور سے سینے پر ہاتھ مار کے) ہائے مجھ سے کیوں کر زندہ رہا جائے گا۔ زمرد! خدا کے لیے کوئی تدبیر بتا ورنہ یہ سمجھ لے کہ ہمیشہ کے لیے مایوسی ہے' اس لیے کہ اب میں دنیا میں جا کے زندہ نہیں رہ سکتا۔ ہزار روکوں مگر میرا خنجر میرے سینے پر اٹھ ہی جائے گا۔ اچھا اگر یہ نہیں تو تم بھی میرے ساتھ چلو!

زمرد : یہ تو کسی طرح ممکن ہی نہیں۔ حسین! یہ نہ سمجھو کہ میں اپنے بس میں ......

حسین : (اپنے آپ کو سنبھال کر) پیاری زمرد تم ہی کوئی تدبیر بتاؤ گی تو کام چلے گا۔ ورنہ ...... مگر یہ جملہ نہیں پورا ہونے پایا تھا کہ جی بھر آیا اور زاروقطار رونے لگا۔

زمرد : (اپنے نازک ہاتھ سے اس کا منہ بند کر کے) کیا غضب کرتے ہو! خدا کے لیے سنبھلو! دنیا میں جا کے جی بھر کے رو لینا' مگر ابھی میری ایک بات ذرا ہوش و حواس درست کر کے سن لو۔

حسین : (نہ رکنے والے جوشِ گریہ کو روک کے) کہو پیاری زمرد! دل و جان سے

سن رہا ہوں۔

زمرد : یہاں سے جانے کے بعد پہلے تو تم کوشش کرنا کہ وہی لوگ جن کی مدد سے اس دفعہ یہاں آئے، انھیں لوگوں کی اطاعت کر کے اور انھیں خوش کر کے پھر یہاں آنے کا موقع پاؤ۔ اپنی حاجت روائی کے لیے تم ان کے کسی حکم سے انحراف نہ کرنا۔ لیکن اگر وہ تمھیں یہاں دوبارہ بھیجنے کا کسی طرح وعدہ ہی نہ کریں اور سب طرف سے مایوس ہو جاؤ تو پھر اسی وادی میں آ کے ٹھہرنا جہاں میری قبر ہے اور جہاں خط بھیج کے میں نے تمھیں یہاں آنے کی تدبیر بتائی تھی۔

حسین : دیکھوں اب کتنے دنوں ٹھوکریں کھانی پڑتی ہیں۔

زمرد : صبر کرو اور ضبط سے کام لو! اور خبردار ایسی کم زوری اور بزدلی نہ دکھانا کہ خودکشی کا ارادہ کر لو۔

حسین : میں اسی کو ڈرتا ہوں۔ پیاری زمرد! تیرے عشق میں بعض وقت نہ اپنے ہوش میں ہوتا ہوں اور نہ اپنا نیک وبد سمجھتا ہوں۔ یہ تیرے ہی لیے تھا کہ میں نے اپنے چچا اور شیخِ وقت امام نجم الدین نیشاپوری کو قتل کر ڈالا۔

زمرد : جانتی ہوں، مگر اس میں مجھ کو نہ شریک کرو (کچھ آہٹ پا کے) بس اب خاموش ہو رہو۔

ناگہاں چھ سات حوریں نازوانداز سے قدم رکھتی ہوئی سامنے آئیں اور محبت کے لہجے میں حسین سے کہنے لگیں: "اب چل کے باہر کی سیر کیجیے اور ان نورانی تختوں پر جلوہ افروز ہو جیے جو چمنوں کے درمیان میں ہیں۔ اس وقت کی بہار دیکھنے کے قابل ہے اور شرابِ طہور کے جاموں میں خاص مزہ ہے۔"

حسین : میں تو یہاں تنہا ہی اچھا ہوں۔

زمرد : تو وہاں چلنے میں کیا مضائقہ ہے؟ چلو میں بھی ساتھ چلتی ہوں۔

حسین : خیر اگر تمھاری بھی یہی مرضی ہے تو مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے! چلو!

اتنی دیر میں اور سب حوریں بھی آگئیں اور زمرد حسین کو ساتھ لیے قصرِ دُرّی کے باہر نکلی۔ سب کے سب لالہ زار کے درمیان میں طلائی تختوں پر جا کے بیٹھے۔ تخت کے دونوں جانب دو حوض تھے جن میں سے ایک میں میٹھا دودھ بھرا تھا اور دوسرے میں شراب ارغوانی چھلک رہی تھی اور بغیر کہے صرف واقعات سے یقین دلایا جاتا تھا کہ ایک حوض کوثر اور دوسرا شراب طہور کا حوض ہے۔ سامنے چند حوریں بیٹھ کے عجب دل ربا اور وجد میں لانے والی دھن میں گانے لگیں۔ دو چار غلمان یعنی خوب صورت خوب صورت کم عمر لڑکے سونے کے جام و صراحی لا کے کھڑے ہو گئے اور نغمہ و سرود کے ساتھ دور بھی چلنے لگا۔ دو چار جاموں نے حسین پر از خود رفتگی کی کیفیت پیدا کر دی اور جب وہ اس عالم نور کو بے خودی کی نیم باز آنکھوں سے دیکھ رہا تھا، اسے نظر آیا کہ زمرد ایک ہاتھ تو اس کے گلے میں ڈالے ہے اور دوسرے ہاتھ سے ایک چھلکتا ہوا جام اس کے منہ سے لگا رہی ہے۔ حسین اس لطفِ صحبت کا دل ہی دل میں مزا اٹھا کے اس جام کو پی گیا مگر پینے کے بعد معلوم ہوا کہ جیسے زمرد کی آنکھوں سے موتیوں کی طرح آنسو ٹپک رہے ہیں۔ بے خودی کے جوش میں پیاری دل ربا کی دل دہی کے لیے بڑھنے ہی کو تھا کہ مدہوش گر پڑا۔ بس اس کے بعد اسے اپنے پرائے کی خبر نہ تھی۔

سوالات

۱۔ مندرجہ ذیل تراکیب کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

نشۂ غفلت، خضرِ طریقت، طلبِ صادق، ملاءِ اعلیٰ، شرابِ طہور، وادیِ ایمن، جسمِ خاکی، قصرِ دُرّی۔

۲۔ مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب دیجیے۔

(الف) حسین نے چمن بندی کی خوبیوں کے سلسلے میں کیا کیا دیکھا؟

(ب) حسین نے "فِردَوسِ بریں" کے محلات کو کیسا پایا؟

(ج) زمرد نے غیبی روشنی کی کیا وضاحت کی؟

(د) "فردوسِ بریں" میں حسین کا ایک ہفتہ کیسے بسر ہوا؟

(ہ) زمرد نے صبح، دوپہر، شام اور رات کے اوقات کو کیسے سمجھایا؟

(و) زمرد نے حسین کو "فردَوسِ برِیں" میں دوبارہ آنے کی کیا تدبیر بتائی؟

۳۔ سیاق وسباق کے حوالے سے درجِ ذیل اقتباسات کی تشریح کیجیے۔

(الف) پانی کے پاس ہی سے ---------- حد نظر تک چلی گئی ہے۔

(ب) مگر اکثر چمن ایسے ہیں ----------- شان پیدا کر لی ہے۔

(ج) اس امر میں لوگوں سے ------------ چاہے اٹھا لے۔

(د) یہاں سے واپس آ کے ---------- نظر خیرہ ہوئی جاتی تھی۔

۴۔ اس سبق کا خلاصہ اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

○☆○☆○☆○☆○☆○

خواجہ الطاف حسین حالی

(۱۸۳۷ء - ۱۹۱۴ء)
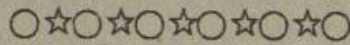
نیچرل شاعری

نیچرل شاعری سے وہ شاعری مراد ہے جو لفظاً" و معناً" دونوں حیثیتوں سے نیچر یعنی فطرت یا عادت کے موافق ہو۔ لفظاً" نیچر کے موافق ہونے سے یہ غرض ہے کہ شعر کے الفاظ اور ان کی ترکیب وبندش تا بمقدور اس زبان کی معمولی بول چال کے موافق ہو، جس میں وہ شعر کہا گیا ہے۔ کیونکہ ہر زبان کی معمولی بول چال اور روز مرہ اس ملک والوں کے حق میں جہاں وہ زبان بولی جاتی ہے نیچر یا سیکنڈ نیچر کا حکم رکھتے ہیں، پس شعر کا بیان جس قدر کہ بے ضرورت معمولی بول چال اور روز مرہ سے بعید ہو گا اسی قدر اَن نیچرل سمجھا جائے گا۔ معناً" نیچر کے موافق ہونے سے یہ مطلب ہے کہ شعر میں ایسی باتیں بیان کی جائیں جیسی کہ ہمیشہ دنیا میں ہوا کرتی ہیں یا ہونی چاہییں۔ پس جس شعر کا مفہوم اس کے خلاف ہو گا وہ اَن نیچرل سمجھا جائے گا۔ مثلاً:

رہی نرگس آسا کھڑی کی کھڑی
کوئی رکھ کے زیرِ زنخداں چھڑی

کسی نے کہا گھر ہوا یہ خراب
رہی کوئی انگلی کو دانتوں میں داب

(میر حسن)

ان دونوں شعروں کو نیچرل کہا جائے گا کیونکہ بیان بھی بول چال کے موافق ہے اور مضمون بھی ایسا ہے کہ جس موقع پر وہ لایا گیا ہے وہاں ہمیشہ ایسا ہی واقع ہوا کرتا ہے۔ یا مثلاً:

رہتا ہے اپنا عشق میں یوں دل سے مشورہ
جس طرح آشنا سے کرے آشنا صلاح

(ذوق)

۱۔ روز مرہ معمول کی بات چیت۔

اس شعر کو بھی نیچرل کہا جائے گا کیونکہ عشق میں اور ہر ایک مشکل کے وقت انسان اپنے دل سے اسی طرح مشورہ کیا کرتا ہے۔ یا مثلاً:

ترے رخسار وگیسو سے بتا تشبیہ دوں کیوں کر
نہ ہے لالہ میں رنگ ایسا نہ ہے سنبل میں بو ایسی (ظفرؔ)

اس شعر کو بھی نیچرل کہا جائے گا کیونکہ عاشق کو فی الواقع کوئی رنگ اور کوئی بُو معشوق کے رنگ وبو سے بہتر یا اس کے برابر نہیں معلوم ہوتی۔ یا مثلاً:

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا (مومنؔ)

یہ بھی نیچرل شعر سمجھا جائے گا کیونکہ جس سے تعلق خاطر بڑھ جاتا ہے اس کا تصور تنہائی میں ہمیشہ پیش نظر رہتا ہے۔ یا مثلاً:

طبیعت کوئی دن میں بھر جائے گی چڑھی ہے یہ آندھی اتر جائے گی
رہیں گی دمِ مرگ تک خواہشیں یہ نیت کوئی آج بھر جائے گی
(داغؔ)

ان دونوں شعروں کا مضمون گو ایک دوسرے کی ضد معلوم ہوتا ہے مگر دونوں اپنی اپنی جگہ نیچر کے مطابق ہیں۔ فی الواقع ہوا وہوس کا بھوت بڑے زور شور کے ساتھ سر پر چڑھتا ہے مگر بہت جلد اتر جاتا ہے اور فی الواقع دنیا کی خواہشوں سے کبھی نیت سیر نہیں ہوتی۔ یا مثلاً:

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں
(غالبؔ)

یہ شعر بھی نیچرل ہے اور فطرتِ انسانی کی کسی قدر گہری اور پوشیدہ خاصیت کا پتا دیتا

ہے جس کے بیان کرنے کے بعد کوئی شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا۔

اوپر کے تمام اشعار جیسا کہ ظاہر ہے ایسے ہیں جن کو لفظاً" اور معناً" دونوں حیثیتوں سے نیچرل کہنا چاہیے۔ اب ہم چند مثالیں ایسی دیتے ہیں جن کو لفظاً" یا معناً" دونوں حیثیتوں سے نیچرل نہیں کہا جا سکتا مثلاً:

عرض کیجیے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا (غالبؔ)

جوہرِ اندیشہ میں کیسی ہی گرمی ہو یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ اس میں صحرا نوردی کا خیال آنے سے خود صحرا جل اٹھے۔ یا مثلاً:

کیا نزاکت ہے جو توڑا شاخِ گُل سے کوئی پھول
آتشِ گُل سے پڑے چھالے تمھارے ہاتھ میں (امیرؔ)

نزاکت کسی درجہ کی کیوں نہ ہو یہ ممکن نہیں کہ آتشِ گُل یعنی خود گُل کے چھونے سے ہاتھ میں چھالے پڑ جائیں۔ یا مثلاً:

دفن ہے جس جا پہ کُشتہ سرد مہری کا تری
بیشتر ہوتا ہے پیدا واں شجر کافور کا

(ذوقؔ)

سرد مہری میں اتنی ہی ٹھنڈک ہو سکتی ہے جتنی کہ لفظ سرد میں۔ پھر اس کے کشتہ کی خاک میں اتنا اثر ہونا کہ اس سے شجرِ کافور پیدا ہو، محض الفاظ ہی الفاظ ہیں جن میں معانی کا بالکل نام و نشان نہیں۔

ہر زبان میں نیچرل شاعری ہمیشہ قدما کے حصے میں رہی ہے۔ مگر قدما کے طبقہ اول میں شاعری کو قبولیت کا درجہ حاصل نہیں ہوتا۔ انھیں کا دوسرا طبقہ اس کو سڈول بناتا ہے اور سانچے میں ڈھال کر اس کو خوش نما اور دلربا صورت میں ظاہر کرتا ہے مگر اس کی نیچرل حالت کو اس خوشنمائی اور دلربائی میں بھی بدستور قائم رکھتا ہے۔ ان کے

بعد متاخرین کا دور شروع ہوتا ہے۔ اگر یہ لوگ قدما کی تقلید سے قدم باہر نہیں رکھتے اور خیالات کے اسی دائرہ میں محدود رہتے ہیں جو قدما نے ظاہر کیے تھے اور نیچر کے اس منظر سے جو قدما کے پیش نظر تھا، آنکھ اٹھا کر دوسری طرف نہیں دیکھتے تو ان کی شاعری رفتہ رفتہ نیچرل حالت سے تنزل کرتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ نیچر کی راہ راست سے بہت دور جا پڑتے ہیں۔ اس کی مثال ایسی سمجھنی چاہیے کہ ایک باورچی نے ایسے مقام پر جہاں لوگ سالم، کچے اور الونے ماش یا مونگ پانی میں بھیگے ہوئے کھاتے تھے، انھیں پانی میں ابال کر اور نمک ڈال کر لوگوں کو کھلایا۔ انھوں نے اپنی معمولی غذا سے اسی کو بہت غنیمت سمجھا۔ دوسرے باورچی نے ماش یا مونگ دلوا کر اور دال کو دھو کر اور مناسب مصالح اور گھی ڈال کر کھانا تیار کیا۔ اب تیسرے باورچی کو اگر وہ دال ہی پکانے میں اپنی استادی ظاہر کرنی چاہتا ہے، اس کے سوا اور کوئی موقع تنوّع پیدا کرنے کا باقی نہیں رہا کہ وہ مقدارِ مناسب سے زیادہ مرچیں اور کھٹائی اور گھی ڈال کر لوگوں کو اپنی چٹ پٹی ہانڈی پر فریفتہ کرے۔

اسی مطلب کو ہم دوسری طرح پر دل نشین کرنے میں کوشش کرتے ہیں۔ فرض کرو کہ فارسی میں، جس پر اردو شاعری کی بنیاد رکھی گئی ہے، جن لوگوں نے اول غزل لکھی ہوگی، ضرور ہے کہ انھوں نے عشق و محبت کے اسباب اور دواعی محض نیچرل اور سیدھے سادے طور پر معشوق کی صورت، حسن و جمال، نگاہ اور ناز و انداز وغیرہ کو قرار دیا ہوگا۔ ان کے بعد لوگوں نے انھیں باتوں کو مجاز اور استعارہ کے پیرایہ میں بیان کیا۔ مثلاً نگاہ و ابرو یا غمزہ و ناز و ادا کو مجازاً ''تیغ و شمشیر کے ساتھ تعبیر کیا اور اس جدت و تازگی سے وہ مضمون زیادہ لطیف و بامزہ ہو گیا۔ متاخرین جب اسی مضمون پر پل پڑے اور ان کو قدما کے استعارہ سے بہتر کوئی اور استعارہ ہاتھ نہ آیا اور جدت پیدا کرنے کا خیال دامن گیر ہوا، انھوں نے تیغ و شمشیر کے مجازی معنوں سے قطع نظر کی اور اس سے خاص سروہی یا اصل تلوار مراد لینے لگے جو میان میں رہتی ہے، گلے میں حمائل کی جاتی ہے، زخمی کرتی ہے، ٹکڑے اڑاتی ہے، سر اتارتی ہے، خون بہاتی ہے، چورنگ کاٹتی ہے، اس کی دھار تیز بھی ہو سکتی ہے اور کند بھی، قاتل کا ہاتھ اس کے مارنے سے تھک سکتا ہے، وہ قاتل کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر سکتی ہے، اس کے مقتول کا مقدمہ عدالت میں

دائر ہو سکتا ہے' اس کا قصاص لیا جا سکتا ہے' اس کے وارثوں کو خون بہا دیا جا سکتا ہے۔ غرض کہ جو خواص ایک لوہے کی اصلی تلوار میں ہو سکتے ہیں وہ سب اس کے لیے ثابت کرنے لگے۔

یا مثلاً اگلوں نے کسی پر عاشق ہو جانے کو مجازاً" دل دادن یا دل باختن یا دل فروختن سے تعبیر کیا تھا۔ رفتہ رفتہ متاخرین نے دل کو ایک ایسی چیز قرار دے لیا جو کہ مثل ایک جواہر یا ایک پھل کے ہاتھ سے چھینا جا سکتا ہے' واپس لیا جا سکتا ہے' کھویا اور پایا جا سکتا ہے۔ کبھی اس کی قیمت پر تکرار ہوتی ہے' سودا بنتا ہے تو دیا جاتا ہے ورنہ نہیں دیا جاتا۔ کبھی اس کو معشوق عاشق سے لے کر کسی طاق میں ڈال کر بھول جاتا ہے۔ اتفاقاً" وہ عاشق کے ہاتھ لگ جاتا ہے اور وہ آنکھ بچا کر وہاں سے اڑا لاتا ہے۔ پھر معشوق کے ہاں اس کی ڈھنڈیا پڑتی ہے اور عاشق اس کی رسید نہیں دیتا۔ کبھی وہ یاروں کے جلسہ میں آنکھوں ہی آنکھوں میں غائب ہو جاتا ہے' سارا گھر چھان مارتے ہیں کہیں پتا نہیں لگتا۔ اتفاقاً" معشوق جو بالوں میں کنگھی کرتا ہے تو وہ جوں کی طرح جھڑ پڑتا ہے۔ کبھی وہ ایسا تلپٹ ہو جاتا ہے کہ زلف یار کی ایک ایک شکن اور ایک ایک لٹ میں اس کی تلاش کی جاتی ہے مگر کہیں کچھ سراغ نہیں ملتا۔ کبھی وہ بیع بالخیار کے قاعدے سے یار کے ہاتھ اس شرط پر فروخت کیا جاتا ہے کہ پسند آئے تو رکھنا ورنہ پھیر دینا اور کبھی اس کا نیلام بول دیا جاتا ہے کہ جو زیادہ دام لگائے وہی لے جائے۔

یا مثلاً اگلوں نے معشوق کو اس لیے کہ وہ گویا لوگوں کے دل شکار کرتا ہے مجازاً" صیاد باندھا تھا۔ پچھلوں نے رفتہ رفتہ اس پر تمام احکام حقیقی صیاد کے مترتب کر دیے۔ اب وہ کہیں جال لگا کر چڑیاں پکڑتا ہے' کہیں ان کو تیر مار کر گراتا ہے' کہیں ان کو زندہ پنجرے میں بند کرتا ہے' کہیں ان کے پر نوچتا ہے' کہیں ان کو ذبح کر کے زمین پر تڑپاتا ہے۔ جب کبھی وہ تیر کمان لگا کر جنگل کی طرف جا نکلتا ہے' تمام جنگل کے پنچھی اور پکھیرو اس سے پناہ مانگتے ہیں۔ سیکڑوں پرندوں کے کباب لگا کر کھا گیا۔ بیسیوں پنجرے قمریوں اور کبوتروں کوؤں اور بٹیروں کے اس کے دروازہ پر ٹنگے رہتے ہیں۔ سارے چڑی مار اس کے آگے کان پکڑتے ہیں۔

یا مثلاً اگلوں نے عشقِ الٰہی یا محبتِ روحانی کو جو ایک انسان کو دوسرے انسان کے ساتھ ہو سکتی ہے مجازاً" شراب کے نشہ سے تعبیر کیا تھا اور اس مناسبت سے جام و صراحی، خم و پیمانہ اور ساقی و مے فروش وغیرہ کے الفاظ بطور استعارہ کے استعمال کیے تھے۔ رفتہ رفتہ وہ اور اس کے تمام لوازمات اپنے حقیقی معنوں میں استعمال ہونے لگے۔ یہاں تک کہ مُشاعرہ بلامبالغہ کلال کی دکان بن گئی۔ ایک کہتا ہے 'لا۔ دوسرا کہتا ہے' اور لا۔ تیسرا کہتا ہے پیالہ نہیں تو اوک ہی سے پلا۔ کچھ بہک رہے ہیں اور کچھ ہنکار رہے ہیں۔ جوان اور بوڑھے' جاہل اور عالم' رند اور پارسا سب ایک رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ جو ہے سو نشہ کے خمار میں انگڑائیاں لے رہا ہے۔ جدھر دیکھو اَلعَطَشُ اَلعَطَش کی پکار ہے۔

یا مثلاً قدما نے لاغری بدن کو اندوہ عشق یا صدمہ جدائی کا ایک لازمی نتیجہ سمجھ کر اس کو کسی موثر طریقہ سے بیان کیا تھا۔ متاخرین نے رفتہ رفتہ اس کی نوبت یہاں تک پہنچا دی کہ فراش جھاڑو دیتا ہے تو خس و خاشاک کے ساتھ عاشق زار کو بھی سمیٹ لے جاتا ہے۔ معشوق جب صبح کو اٹھتا ہے تو عاشق کو لاغری کے سبب بستر پر نہیں پاتا۔ ناچار بچھونا جھاڑ کر دیکھتا ہے تا کہ زمین پر کچھ گرتا ہوا معلوم ہو۔ عاشق کو موت ڈھونڈتی پھرتی ہے مگر لاغری کے سبب وہ اس کو کہیں نظر نہیں آتا۔ میدانِ قیامت میں فرشتے چاروں طرف ڈھونڈتے پھرتے ہیں اور قاضی یوم الحساب منتظر بیٹھا ہے مگر عاشق کا لاغری کے سبب کہیں پتا نہیں ملتا۔

اسی طرح متاخرین نے ہر مضمون کو جو قدما نیچرل طور پر باندھ گئے تھے' نیچر کی سرحد سے ایک دوسرے عالم میں پہنچا دیا۔ معشوق کے دہانہ کو تنگ کرتے کرتے صفحہ روزگار سے یک قلم مٹا دیا۔ کمر کو پتلی کرتے کرتے بالکل معدوم کر دیا۔ زلف کو دراز کرتے کرتے عمر خضر سے بھی بڑھا دیا۔ رشک کو بڑھاتے بڑھاتے خدا سے بھی بدگمان بن گئے۔ جدائی کی رات کو طول دیتے دیتے ابد سے جا بھڑایا۔ الغرض جب پچھلے انھیں مضامین کو جو اگلے باندھ گئے ہیں اوڑھنا اور بچھونا بنا لیتے ہیں تو ان کو مجبوراً نیچرل شاعری سے دست بردار ہونا اور میل کا بیل بنانا پڑتا ہے۔

اس بات کے زیادہ ذہن نشین کرنے کے لیے (کہ شاعری کا آغاز کس حالت میں ہوتا ہے اور پھر قدما کا دوسرا طبقہ اس کو کس طرح اسی نیچرل حالت میں درست کرتا ہے اور ان کے بعد متاخرین اس کو کیا چیز بنا دیتے ہیں) اردو شعرا کے ہر ہر طبقہ کے کلام میں سے کچھ کچھ مثالیں نقل کرنی مناسب معلوم ہوتی ہیں۔

شاہ آبرو اس طول مدت کو جو مفارقت کے زمانے میں عاشق کو محسوس ہوتا ہے اس طرح بیان کرتے ہیں :

جدائی کے زمانہ کی سجن کیا زیادتی کہیے
کہ اس ظالم کی جو ہم پر گھڑی گذری سو جگ بیتا

اسی مضمون کو میر نے یوں ادا کیا ہے :

ہر آن ہم کو تجھ بن ایک اک برس ہوئی ہے
کیا آگیا زمانہ اے یار رفتہ رفتہ

ناسخ جو پانچویں طبقہ میں ہیں وہ اس مضمون کو یوں باندھتے ہیں :

جائے کافورِ سحر چاہیے کافورِ حنوط
یہ شبِ ہجر ہے یارو شبِ دیجور نہیں

یعنی شبِ ہجر جب تک ہماری جان نہ لے گی ٹلنے والی نہیں ہے۔ پس کافورِ سحر کی توقع رکھنی عبث ہے بلکہ اس کی جگہ کافورِ حنوط غسلِ میت کے لیے درکار ہے۔ اگرچہ مضمون کے لحاظ سے تینوں شعروں کو نیچرل کہا جا سکتا ہے کیونکہ شوق و انتظار کی حالت میں ممکن ہے کہ عاشق کو ایک ایک گھڑی جگ اور ایک ایک آن برس کے برابر معلوم ہو اور ممکن ہے کہ عاشق طولِ شب فراق سے تنگ آکر جینے سے مایوس ہو جائے۔ مگر ناسخ کی طرزِ بیان اردو کی معمولی بول چال سے اس قدر بعید ہے کہ اس کو کسی طرح نیچرل بیان نہیں کہا جا سکتا۔

تیسری مثال : شاہ حاتم جو پہلے طبقہ میں شمار کیے گئے ہیں وہ دوست کے ملنے کی آرزو اور

اس کے دیکھنے کے شوق کو اس طرح بیان کرتے ہیں :

زندگی دردِ سر ہوئی حاتمؔ
کب ملے گا مجھے پیا میرا

سوداؔ یوں کہتے ہیں :

دل کو یہ آرزو ہے صبا کوئے یار میں
ہمراہ تیرے پہنچے بہل کر غبار میں

منشی امیر احمد صاحب امیر جو موجودہ طبقہ کے مشہور شاعر ہیں وہ اسی مضمون کو یوں ادا کرتے ہیں :

واکردہ چشمِ دل صفتِ نقشِ پا ہوں میں
ہر رہگذر میں راہ تری دیکھتا ہوں میں

اس مثال میں بھی تینوں شعروں کو اگرچہ خیال کے لحاظ سے نیچرل کہا جاسکتا ہے مگر اخیر شعر کے بیان میں بمقابلہ حاتمؔ اور سودا کے صاف تصنع اور ساختگی پائی جاتی ہے اور بیان نیچرل نہیں رہا۔ اگر زیادہ تفحص کیا جائے تو ان سے بہت زیادہ صریح اور صاف مثالیں کثرت سے مل سکتی ہیں۔

اوپر کے بیان سے یہ ہرگز سمجھنا نہیں چاہیے کہ متاخرین کی شاعری ہمیشہ اَن نیچرل ہوتی ہے نہیں، بلکہ ممکن ہے کہ متاخرین میں کچھ ایسے لوگ بھی ہوں جو قدما کی جولان گاہ کے علاوہ ایک دوسرے میدان میں طبع آزمائی کریں یا اسی جولان گاہ کو کسی قدر وسعت دیں یا زبان میں بہ نسبت متقدمین کے زیادہ گھلاوٹ اور لوچ اور وسعت اور صفائی پیدا کر سکیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ لکھنؤ میں میرانیس نے مرثیہ کو بے انتہا ترقی دی ہے اور نواب مرزا شوق نے مثنوی کو زبان اور بیان کے لحاظ سے بہت صاف کیا ہے اسی طرح دلی میں ذوق، ظفر اور خاص کر داغ نے غزل کی زبان میں نہایت

وسعت اور صفائی اور بانکپن پیدا کر دیا ہے۔

(مقدمہ شعروشاعری)

سوالات

۱۔ نیچرل شاعری سے کیا مراد ہے؟

۲۔ اَنْ نیچرل شاعری کا مفہوم واضح کیجیے۔

۳۔ اس سبق میں نیچرل شاعری کی جو شعری مثالیں دی گئی ہیں ان کے علاوہ تین شعری مثالیں دیجیے اور ان کی وضاحت کیجیے۔

۴۔ قدما کے دور سے متاخرین کے دور تک آتے آتے نیچرل شاعری کیسے ان نیچرل ہوتی چلی گئی؟

۵۔ متاخرین میں سے بعض شعرا نے لاغریِ بدن کے مضمون کو کس کس پیرائے میں بیان کیا ہے؟

۶۔ اَنْ نیچرل شاعری کی تین مثالیں دیجیے اور واضح کیجیے کہ انھیں نیچرل شاعری کے زمرے میں کیوں شمار نہیں کیا جا سکتا؟

۷۔ اس سبق میں جہاں جہاں تشبیہیں اور استعارے آئے ہیں ان کی نشاندہی کیجیے۔

۸۔ اس سبق کا خلاصہ اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

۹۔ سیاق وسباق کے حوالے سے مندرجہ ذیل اقتباسات کی تشریح کیجیے۔

(الف) نیچرل شاعری سے ---------- وہ ان نیچرل سمجھا جائے گا۔

(ب) ہر زبان میں نیچرل شاعری ---------- بہت دور جا پڑتے ہیں۔

○☆○☆○☆○☆○☆○

ابنِ انشا

(۱۹۲۷ء - ۱۹۷۸ء)

کہا جاپان کو جائیں؟ کہا جاپان کو جاؤ

ٹوکیو میں یہ ہمارا تیسرا پھیرا تھا۔ ایک روز ہندوستانی پاکستانی کھانے کی تلاش میں گنزا نکل گئے۔ وہاں سب سڑکیں اور سب عمارتیں ایک سی ہیں۔ ہر چند کہ بدرقہ[1] ساتھ تھا اتنا بھٹکے، اتنا بھٹکے کہ بے حال ہو گئے۔ ناز ہوٹل جس کا راستہ ہمارے خیال میں ہمیں آتا تھا نہ ملنا تھا نہ ملا۔ پی آئی اے کے سیلز آفس میں گئے۔ وہاں ایک جاپانی بیٹھا ایک افغانی کا ٹکٹ بنا رہا تھا۔ وہ بھی ہماری مدد نہ کر سکے۔ آخر اشو کا ہوٹل کا بورڈ دیکھ کر اندر چلے گئے اور وہیں بھوجن کیا۔ ہم سے کراچی سے ٹوکیو جانے کو کہیے تو ہم بہ دل وجان تیار ہیں۔ لیکن اپنے ہوٹل سے اٹھ کر گنزا یا کہیں اور جانے کو ہم سے نہ کہیے۔

جاپانی پہلوانوں کی کُشتی ہم نے ویسے تو نہیں دیکھی، ٹیلی ویژن پر دیکھی ہے۔ جو رائے کسی باہر والے کی ہمارے پکے گانے کے باب میں ہو سکتی ہے، وہی ہماری اس کشتی کے بارے میں ہے۔ معیار ہمارے ہاں صحت وتنومندی کا یہ ہے کہ چھاتی نکلی رہے اور کمر دبی رہے۔ چنانچہ چیتے کی کمر کو رشک کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ جاپانی پہلوان اپنا پورا بدن نکالتا ہے خصوصاً پیٹ۔ جب تک وہ تیل کے ماٹ کی طرح لٹک کر تھل تھل نہ کرے، پہلوان کو کشتی کے لائق نہیں سمجھا جاتا۔ آدمی کیا ہوتا ہے، گوشت اور چربی کا پہاڑ ہوتا ہے۔ پہلے مینڈک کی طرح ہاتھ ٹیک کر، پیٹھ اٹھا کر، ایک دوسرے کو گھورتے ہیں۔ پھر نمک اٹھا کر چھڑکتے ہیں۔ کچھ اپنے لنگوٹ پر مَلتے ہیں۔ پھر دونوں حریف ایک دوسرے کو دھکیلتے ہیں، یا نہ جانے کیا کرتے ہیں۔ اس کے لیے پہلوان کو بہت کھانا پڑتا ہے۔ بے تحاشا کھانا، لیٹنا اور ڈکارنا پڑتا ہے۔ ایسے کام کی ممانعت ہے جس میں چربی کے ذرا سا ڈھلنے کا بھی خطرہ ہو۔ اس کشتی سے لطف اندوز ہونے کے لیے ذوق چاہیے

---

[1] راہنما۔ نگہبان۔ محافظ

اور وہ دو چار دن میں نہیں، دو چار نسل ہی میں پیدا ہو سکتا ہے۔ ایسا ہی ذوق جاپان کے روایتی تھیٹر "کابوکی" کو پسند کرنے کے لیے بھی مطلوب ہے۔ ہم نے ایک بار دیکھا' دوسری بار دیکھنے کی ہوس نہیں ہے' بلکہ تاب بھی نہیں ہے۔ اس میں ایک سی کہانی ہوتی ہے اور ایک سی نفیری[1] بجتی ہے اور ایک سی حرکات ہوتی ہیں اور ایک سی سکنات ہوتی ہیں۔ حرکات والا شخص ہیرو ہوتا ہے جو فریاد نما تقریر کرتا رہتا ہے اور سکنات کے لیے دو بی بیاں پس منظر میں بٹھا دی جاتی ہیں جو برابر گھٹنوں کے بل بیٹھی رہتی ہیں۔ ایک آدھ عورت جوڑا بنائے ہاتھ میں خنجر یا قرولی لیے ہیرو کے آس پاس گھومتی رہتی ہے۔ ہر کہانی میں ایک کٹا ہوا سر ضرور شامل ہوتا ہے' اس لیے کٹا ہوا سر رکھنے کا ڈبا سازوسامان کا لازمی جزو ہے۔ نہایت اسپرو افزا کھیل[2] ہے۔ ویسے تو ہمارا تمام کلاسیکل چیزوں کے متعلق ایسا ہی خیال ہے۔

ٹوکیو میں ہوٹل والے ہر روز ایک ماچس اور ایک چھپے ہوئے کپڑے کا کوئی جامہ ہمارے کمرے میں رکھ دیتے تھے۔ ایک روز کھول کے دیکھا تو وہ کیمونو تھا' ڈریسنگ گون نما چیز۔ شاید اس کو نائٹ سوٹ کے طور پر استعمال کرتے ہوں گے۔ ایک آدھ بار ہم نے پہن کر دیکھا' ڈھیلا ڈھالا تھا۔ ہمیں تو خوش نہ آیا۔ اس پر ٹھپے سے جگہ جگہ گرینڈ پیلس ہوٹل بھی لکھا تھا۔ ورنہ ہم بھول چوک سے اسے اپنے کپڑوں میں رکھ کے لے آتے اور آپ صاحبان کو دکھاتے۔ اسے آپ چوری کا نام نہیں دے سکتے۔ تحفہ لانا الگ چیز ہے جیسے ہم ماچسیں جمع کر کے لے ہی آتے ہیں۔ ایک چپل بھی ہمارے کمرے میں دھری رہتی تھی' اس پر بھی ظالموں نے گرینڈ پیلس ہوٹل نقش کر رکھا ہے' ورنہ تحفے کے لیے بری نہیں تھی۔ ہم بدنیتی سے تو نہ لاتے لیکن ہمارے جوتوں کے ساتھ غلطی سے تو آ سکتی تھی۔ ہمیں یہاں آ کر پتا چلتا کہ ہم لے آئے ہیں۔ بھلا اتنی سی چیز پر ہوٹل کا ٹھپہ لگانے کی کیا ضرورت ہے۔

ہم ٹوکیو سے باہر "ہاکونے" بھی گئے کہ ایک ٹھنڈا پہاڑی صحت افزا مقام

1۔ شہنائی

2۔ مراد غیر دلچسپ کھیل جو سردردی کا باعث ہو۔

ہے۔ راستے میں ایک آدھ جگہ ٹھیکی لی[1]۔ کوکا کولا وغیرہ پیا اور بُھٹہ خرید کے کھایا۔ مہنگا نہیں تھا۔ ایک بُھٹہ ہمارے حساب سے چار روپے کا پڑا' ابلا ہوا' نمک سمیت۔ یہاں ہمیں جس ہوٹل میں ٹھہرایا گیا وہ بہت بڑا' ہزار کمرنے سے زیادہ کا' دور دور تک پھیلا ہوا ہوٹل تھا۔ بارش ہو رہی تھی اور اطراف میں جنگل ہی جنگل تھا۔ وہ دن ہفتے کا تھا' اس لیے رش بہت تھا۔ بے شمار جاپانی جوڑے چھٹی منانے پہنچے ہوئے تھے۔ ہماری مغربی ضروریات کا خیال رکھتے ہوئے پلنگ ماڈرن ڈالے گئے تھے لیکن ایک کونے میں چبوترا بھی تھا جس پر چٹائیاں بچھی تھیں اور آلتی پالتی مار کر بیٹھنے کے لیے گدے تھے' بیچ میں چوکی اور چوکی پر چائے کا پورا سامان کیمونو پہن کر بیٹھیے اور چُسکی لگائیے۔

ہاکونے کے راستے میں مسٹر نوما کا پرانا مکان پڑتا ہے۔ مسٹر نوما کون ہیں' ان کے تعارف کی یہاں گنجائش نہیں۔ صرف اتنا جانیے کہ جاپان کے سب سے بڑے پبلشر ہیں۔ ہماری کئی برس سے یاد اللہ ہے۔ پاکستان بھی آچکے ہیں۔ خود تو وہ ٹوکیو میں بیمار ہیں لیکن یہاں ہمارے خیر مقدم کا انتظام ان کے داماد نے کیا تھا۔ یہ روایتی طرز کا دیہاتی مکان ہے' چٹائیاں ہی چٹائیاں' کھڑکیوں میں شیشوں کی بجائے کاغذ' نیچی نیچی چوکیاں۔ یہاں جاپانی انداز کی مٹھائیوں اور چائے کا انتظام تھا۔ بہرحال اس مکان اور ہوٹل کو دیکھ کر جاپان کا کچھ کچھ نقشہ معلوم ہوا ورنہ مرکزی ٹوکیو کی عمارات تو ویسی ہی ہیں جیسی کسی بھی ماڈرن شہر میں ہوتی ہیں' جدید' محکم اور فلک پیما۔

اے صاحبو! جاپان تو جدید ہے لیکن جاپانی اتنے جدید نہیں ہیں۔ ان کا طرزِ فکر وہی ہے کہ جو تھا۔ سلام وطعام اور نشست و برخاست سب میں سرگشتۂ خمارِ رسوم وقیود ہیں۔ یہ نہ سمجھیے کہ چغے پہنے پھرتے ہیں یا ساری عورتیں سر پر جوڑے بناکر کے پیچھے گدی باندھے پنکھا کرتی نظر آتی ہیں۔ کام کاج کا سارا لباس مغربی ہے کہ آسانی اسی میں ہے۔ تاہم آپس میں سلام سر جھکا کر ہی کرتے ہیں۔ خواہ سڑک پر ٹریفک ہی چل رہا ہو اور لوگوں کا راستہ بھی رکتا ہو۔ اس کے لیے فاصلے کا بھی التزام ہے (مصافحے کا دستور نہیں) اور یہ آداب بھی مقرر ہیں کہ کس درجے کے آدمی کے

1۔ چلتے چلتے تھک کر دم لینا۔

آگے کتنا جھکنا چاہیے۔ تھوڑا جھکنا یا کمر کو دہرا کرنا لازمی ہے۔ تحفے کا لین دین بھی ان کی طبعی عادات و رسوم میں ہے۔ جس کو تحفہ دیا جائے اس کے لیے لازم ہے کہ اس سے دو پیسے زیادہ کا تحفہ لائے اور جوابی تحفے کی قیمت کچھ قدرے زیادہ ہونی چاہیے۔ اگر دو فریقوں میں پے در پے تحفوں کا تبادلہ ہوتا ہے تو جان لیجیے کہ تھوڑے دنوں میں یا تو دونوں دیوالیہ ہو جائیں گے یا سمجھ دار ہوئے تو کوئی بات نکال کر ترک تعلق کر لیں گے۔

اور اے لوگو! آداب کے ذکر میں سنیے کہ جاپان میں خودکُشی تک کے آداب ہیں۔ ہاراکری ایک رسم ہے۔ لوگ مجمع عام میں کرتے ہیں۔ دو مشہور مصنفین نے، جن میں ایک نوبیل انعام یافتہ بھی تھے اور جن سے اسٹاک ہوم میں ملاقات کا شرف ہمیں حاصل ہو چکا ہے، کھلے خزانے خودکشی کی ہے۔ اس کے لیے قاعدے مقرر ہیں کہ خنجر پیٹ میں کس طرف گھونپا جائے، کتنا گھونپا جائے اور گھونپتے وقت کپڑے کیسے ہونے چاہیں اور نشست کیسی رہنی چاہیے۔ خودکشی ایک پورا فلسفہ ہے۔ یہ نہیں کہ ریل کے نیچے سر دے دیا۔ زہر پھانک لیا یا چھت سے چھلانگ لگا دی یا سمندر میں ڈوب گئے۔ ہر بات کا کوئی قاعدہ ہوتا ہے، قانون ہوتا ہے۔

اب ہم تھوڑی دیر کو جاپان سے پاکستان آتے ہیں جو کمال جاپان والوں نے انفرادی خودکشی میں پیدا کیا ہے وہ ہم نے اجتماعی خودکشی میں حاصل کیا ہے اور اس میں چھوٹے بڑے سب ہی شریک ہیں۔ وہ بھی جو ۹۳ ہزار سپاہیوں کو دشمن کی قید میں جا پھنساتے ہیں، وہ بھی جو بسوں کو جلاتے ہیں، وہ بھی جو کارخانے بند کر کے اور ہڑتالیں کرا کے ملک کو اقتصادی طور پر مفلوج کرتے ہیں اور لوگوں کو بے روزگار کرتے ہیں، وہ بھی جو رینجرز پر پتھر پھینکتے ہیں اور کرفیو لگواتے ہیں۔ ہم نے کل ایک جلی ہوئی بس اور پانی کی گاڑی کو دیکھا تو پوچھا کیا یہ گاڑیاں دشمن کی ہیں؟ کیا یہ ٹریفک کے کھمبے دشمن کے ہیں؟ کیا یہ سڑکیں اور یہ کھسوٹے ہوئے پودے کسی دشمن ملک کے ہیں۔ معلوم ہوا سب ہمارے اپنے ہیں۔ یہ سب ہمارے اپنے ہیں۔ تو یہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں،

جلاتے ہیں، نوچتے ہیں، کھسوٹتے ہیں، یہ سب خودکشی کی تعریف میں آتا ہے یا نہیں؟

(ابنِ بطوطہ کے تعاقب میں)

سوالات

۱۔ مختصر جواب دیجیے۔

(الف) جاپانی کُشتی کے بارے میں مصنف کی کیا رائے ہے؟

(ب) جاپانی پہلوان اپنی روایتی کُشتی کی تیاری کس طرح کرتے ہیں؟

(ج) جاپانی پہلوانون کے کُشتی لڑنے کا انداز کیا ہے؟

(د) مصنف کو گرینڈ پیلس ہوٹل ٹوکیو سے ڈریسنگ گون نما چیز اور چپل اپنے وطن میں لانے کا اشتیاق کیوں تھا؟

(ہ) مصنف کو جاپانی تھیٹر "کابوکی" دیکھنے کی تاب کیوں نہیں ہے؟

(و) مصنف کو ہاکونے کے جس ہوٹل میں ٹھہرایا گیا اس کا نقشہ مصنف نے کن الفاظ میں کھینچا ہے؟

(ز) جاپانیوں میں ایک دوسرے کو سلام کرنے اور تحفے تحائف پیش کرنے کا سلیقہ کیا ہے؟

۲۔ مندرجہ ذیل جملوں کی وضاحت کیجیے۔

(الف) ہر چند کہ بدرقہ ساتھ تھا، اتنے بھٹکے کہ بے حال ہو گئے۔

(ب) ہم سے کراچی سے ٹوکیو جانے کو کہیے تو ہم بہ دل و جان تیار ہیں لیکن اپنے ہوٹل سے اٹھ کر گنزا یا کہیں اور جانے کو ہم سے نہ کہیے۔

(ج) ایسے کام کی ممانعت ہے جس میں چربی کے ذرا سا ڈھلنے کا بھی خطرہ ہو۔

(د) ہم نے ایک بار دیکھا، دوسری بار دیکھنے کی ہوس نہیں ہے۔

(ہ) ہماری مغربی ضروریات کا خیال رکھتے ہوئے، پلنگ ماڈرن ڈالے گئے تھے۔

(و) سلام وطعام اور نشست وبرخاست سب میں سرگشتۂ خمارِ رسوم وقیود ہیں

(ز) ہر بات کا کوئی قاعدہ ہوتا ہے، قانون ہوتا ہے۔

۳۔ سیاق وسباق کے حوالے سے اقتباس کی تشریح کیجیے:

اب ہم تھوڑی دیر کو ---------- تعریف میں آتا ہے یا نہیں؟

○☆○☆○☆○☆○☆○

میرزا ادیب

(ولادت: ۱۹۱۴)

فاطمہ ـــــ برناوی
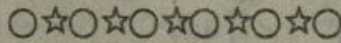
کردار

سلمان غنی: ـــــ ایک فلسطینی معلم
عمارہ: ـــــ سلمان غنی کی بیوی
ذکیتر: ـــــ ان کی بیٹی
جبار: ـــــ سلمان غنی کا جواں سال بیٹا
فاطمہ برناوی: ـــــ فلسطین کی بہادر اور جاں سپار لڑکی تحریک الفتح کی روح رواں
سہیل: ـــــ تحریک الفتح کا ایک راہنما
یہودی کیپٹن فرونی،
یہودی کرنل جواد اور دو یہودی سپاہی:
نعمان اور حاکم۔

پہلا منظر

فلسطین ــــ میں ایک بستی القدس کے نواح میں سلمان غنی کا مکان!

(سلمان باہر سے مکان میں آتا ہے)

سلمان: (بلند آواز میں) عمارہ کہاں ہو تم عمارہ!

عمارہ: (کچھ فاصلے سے) میں یہاں ہوں باورچی خانے میں۔

سلمان: وہاں کیا کر رہی ہو؟ میرے پاس آؤ۔

عمارہ: قہوہ نہیں پئیں گے!

سلمان: نہیں ادھر آجاؤ۔

(عمارہ آتی ہے)

عمارہ: آپ اتنی جلدی پریشان کیوں ہو جاتے ہیں؟

سلمان: پتا نہیں کیا معاملہ ہے، آج صبح سے یہودی سپاہیوں کی چاپ سن رہا ہوں، وہ ادھر گشت لگا رہے ہیں۔

عمارہ: میں نے دو تین بار دروازہ کھول کر باہر دیکھا تھا، کوئی نہیں تھا۔

سلمان: تم نے دروازہ کیوں کھولا تھا اور یہ ذکیہ کہاں ہے۔ کافی دیر سے اسے میں نے دیکھا نہیں ہے۔ کہاں غائب ہو گئی ہے بلاؤ اسے (پکارتے ہوئے ذکیہ! ذکیہ!!)

عمارہ: کئی مرتبہ آپ سے کہا ہے کہ بچی کو اس طرح نہ پکارو۔ آج کل تو ہوا کے جھونکے پر بھی یہ خدشہ ہوتا ہے کہ کوئی آفت نہ نازل ہو جائے۔

سلمان: عمارہ! تم جانتی نہیں ہو۔ یہ ہماری بدبختی اور نکبت کا دور ہے۔ ہماری زندگی موت کے طویل سایوں میں سسک رہی ہے۔ ہم اللہ کے مقہور بندے ہو گئے ہیں۔

عمارہ: آپ کی یہ باتیں بہت اذیت ناک ہیں۔

سلمان: میری باتیں بہت اذیت ناک ہیں کیونکہ یہ زندگی کی اذیت ناک حقیقت کا اظہار کرتی ہیں۔ اذیت کے بعد پھر اذیت۔ لیل و نہار یونہی گزرتے ہیں، ہر نیا دن ایک نئی مصیبت لے کر آتا ہے اور ہر نئی رات ایک تازہ زخم لگاتی ہے۔ فلسطین، میرا فلسطین ــــ ہم سب کا فلسطین کبھی زندہ تھا۔ آج یہودیوں کے ظلم وجور میں جکڑا لہو کے آنسو بہا رہا ہے اور ہمارا مقدر یہ ہے کہ ہر روز یہ منظر دیکھیں اور دیکھتے دیکھتے مر جائیں۔

عمارہ: پھر وہی ماتم!

سلمان: ماتم؟ (جنوں انگیز قہقہہ لگا کر) ہمیں ماتم کے سوا اب اور کرنا ہی کیا ہے۔ ماتم اپنے اس ماضی کا ماتم، جو جاہ و جلال کے لاکھوں آفتاب لے کر سارے فلسطین پر چھا گیا تھا اور اس سرزمین کا ذرہ ذرہ روشنیوں سے منور ہو گیا تھا۔ آج وہ سب کے سب آفتاب تاریکیوں کے اتھاہ سمندر میں دفن ہو گئے ہیں۔ کہیں بھی روشنی کی ایک کرن تک باقی نہیں رہی۔ تم میری طرف اس طرح کیوں دیکھ رہی ہو جیسے میں پاگل ہو گیا ہوں۔ تم دونوں مجھے پاگل سمجھتی ہو اور شاید میں پاگل ہوں بھی!

عمارہ: نہیں میں ایسا نہیں سمجھتی۔

سلمان: غلط کہہ رہی ہو۔ تمہارے چہرے پر پھیلے ہوئے مایوسی کے اثرات صاف ظاہر کرتے ہیں کہ تم مجھے پاگل سمجھ رہی ہو اور ٹھیک ہی سمجھتی ہو۔ میں نے عقل و خرد کا سارا اثاثہ گنوا دیا ہے اور یہ اثاثہ اس وقت گنوایا تھا جب ظالم یہودی میرے لخت جگر کو یہاں سے گرفتار کر کے لے گئے تھے۔

عمارہ: یہودی کتوں نے گرفتار کرتے وقت اس پر کتنا تشدد کیا تھا مگر میرے بہادر بچے کے منہ سے ہلکی سی چیخ بھی نہیں نکلی تھی۔

سلمان: اس کے منہ سے کوئی چیخ نہیں نکلی تھی لیکن میرا دل ڈوب گیا تھا اور یہ مظلوم دل اب تک اسی طوفان میں ہچکولے کھا رہا ہے۔ تم نہیں جانتیں عمارہ! مجھ پر ان لمبے دنوں اور لمبی راتوں میں کیا کیفیت گزرتی رہتی ہے۔ میرا ایک ایک لمحہ جہنم کی آگ میں پگھل رہا ہے۔ پناہ رب الرحیم۔

عمارہ: میں جانتی ہوں مجھے کس چیز کا علم نہیں ہے؟

سلمان: تم کیا جانو! تم کیا جان سکتی ہو! آج جب میں گھر سے باہر نکل کر ذرا

دور گیا اور میری آنکھوں نے اس یہودی قالین فروش کی دکان کے سامنے سرخ خاک کو دیکھا' جہاں میرے بچے کو بے دردی سے ذبح کیا گیا تھا تو یوں لگا جیسے میرے سینے میں ایک شگاف ہو گیا ہے اور اندر کا سارا لہو باہر آ رہا ہے۔ یہ سرخ خاک ہر وقت میری نگاہوں کے سامنے رہتی ہے۔ کسی وقت بھی اوجھل نہیں ہوتی۔ عمارہ اس دن بھی صبح سے مجھے یہودیوں کی چاپ سنائی دینے لگی تھی اور آج بھی میں یہ چاپ سن رہا ہوں میری ذکیہ کہاں ہے؟

عمارہ: ذکیہ کمرے کے اندر کوئی کام کر رہی ہے۔

سلمان: وہ گھر سے باہر تو نہیں گئی

عمارہ: باہر کیا کرنے جائے گی؟

سلمان: عمارہ! کیا اس وسیع کائنات میں کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جہاں میں' تم اور میری بچی تینوں جا کر آباد ہو جائیں اور فراموشی کا ایک گہرا پردہ ہمارے حواس پر چھا جائے' ہمیں کچھ بھی یاد نہ رہے ہم سب کچھ بھول جائیں۔

عمارہ: ہم فلسطین سے نہیں جائیں گے۔ فلسطین ہمارے آباو اجداد کا وطن ہے اور ہمارے بعد ہماری اولاد کا وطن ہو گا۔

سلمان: یہ خوش فہمی ہے۔ جس طرح آج سے صدیوں پہلے اہلِ روما نے یہودیوں کو یہاں سے جلاوطن کر دیا تھا۔ اسی طرح یہ بدبخت یہودی ہمیں نکال دیں گے اور ہم نہ جانے کہاں کہاں کی خاک چھانتے پھریں گے۔

عمارہ: نہیں یہ کبھی نہیں ہو گا۔ آپ مایوس ہو گئے ہیں۔ آپ انتہائی یاس کے عالم میں یہ لفظ کہ رہے ہیں۔ فلسطین ہمارا ہے' ہم فلسطین کے ہیں۔

سلمان: میں مایوس کیوں نہ ہوں۔ میں مسلمانوں کی تقدیر کو دبے پاؤں آتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ یہ تقدیر لہو لہان ہے' اس سے لہو بہ رہا ہے اور اسی لہو میں ہمیں بہ جانا ہے' آج یا کل' چند روز کے اندر اندر۔

عمارہ: ہمیں اگر لہو ہی میں بہ جانا ہے تو یہیں رہیں گے اور اسی خاک میں مل جائیں گے۔

سلمان: کاش ہم کسی اجنبی جزیرے میں چلے جائیں۔

عمارہ: آپ کے بچے نے اس وطن کی آزادی کے لیے جان قربان کر دی اور آپ یہاں سے چلے جانا چاہتے ہیں۔

سلمان: میرے بچے کے سر میں ایک خوفناک قسم کا سودا سما گیا تھا۔ وہ اور اس جیسے شوریدہ سر نوجوان بے سود کوشش کر رہے ہیں۔ اب فلسطین پر وہ سورج کبھی طلوع نہیں ہو گا، جسے یہودی ظلم وتشدد کی اندھی رات نگل گئی ہے۔

عمارہ: آپ نے تو مایوسی کی انتہا کر دی ہے۔

سلمان: عمارہ! یہ دیکھو۔ سنو! سنو۔ یہ چاپ۔ یہ چاپ!

عمارہ: باہر فوجی پھر رہے ہیں اور آج کل یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہر روز پھرتے رہتے ہیں۔

سلمان: اتنی بلند اور متواتر چاپ پہلے کہاں سنائی دی تھی؟

عمارہ: میں تو ہر روز سنتی رہتی ہوں۔

سلمان: ذکیہ کو اب تک کیوں نہیں بلایا؟

عمارہ: کہ تو رہی ہوں وہ کمرے کے اندر کوئی کام کر رہی ہے۔

سلمان: اسے بلاؤ۔ میں خود بلاتا ہوں۔

عمارہ: آپ یہیں رہیں' میں اسے بلا لاتی ہوں۔

(عمارہ کمرے سے نکل جاتی ہے اور جب واپس آتی ہے تو اس کے ساتھ ذکیہ بھی ہے)

ذکیہ : جی ابو فرمائیے!

سلمان : میری بچی! تو کہاں چلی گئی تھی۔ یہاں آجا میرے پاس!

ذکیہ : فرمائیے

سلمان : مجھے کچھ نہیں کہنا میں کہہ بھی کیا سکتا ہوں۔ میں نے سنا ہے کل چند دیوانے نوجوان یہاں آئے تھے۔

ذکیہ : ہاں آئے تھے۔ انھوں نے کہا تھا ہم جبار کا انتقام ضرور لیں گے۔

سلمان : انتقام! کس سے انتقام لیں گے۔ اس قوت سے انتقام لیں گے جسے دنیا کی عظیم طاقتوں کی پشت پناہی حاصل ہے۔ جس نے ہم سب کو حقیر تنکوں کی طرح منتشر کر دیا ہے۔ میں نے منع کر دیا تھا کہ یہ لوگ یہاں نہ آیا کریں۔ انھوں نے میرے لختِ جگر کو مجھ سے چھین لیا' اب کیا لینے آتے ہیں۔ میری ذکیہ کو بھی مجھ سے چھین لینا چاہتے ہیں۔

ذکیہ : ابا! اگر کسی دن میرے وطن نے مجھے بلایا تو ......

سلمان : نہیں تم نہیں جاؤ گی۔ تم نہیں جاؤ گی۔ میں ان کو یہاں آنے سے روک دوں گا۔

(سلمان کمرے سے باہر جانے لگتا ہے)

عمارہ: آپ چلے کہاں؟

سلمان : میں وہاں جا رہا ہوں جہاں یہ پاگل نوجوان جمع ہوتے ہیں۔

عمارہ: مت جائیے۔ رک جائیے۔

سلمان : مجھے جانے دو۔ میں انھیں روک دینا چاہتا ہوں۔

ذکیہ : ابا نہ جائیے! کیوں جاتے ہیں آپ؟ ابا! ابا!!

سلمان: میں ضرور جاؤں گا ذکیہ ! یہ جنونی نوجوان یہاں آتے رہتے ہیں۔ اسی لیے یہودی سپاہی کئی دن سے مجھے گھُور گھُور کر دیکھ رہے ہیں۔ میرے گھر کے اردگرد پھیلے ہوئے ہیں۔ کسی وقت بھی ہمیں گرفتار کر لیں گے۔

ذکیہ : امی ابا کو کیا ہو گیا ہے؟

(سلمان تیزی سے نکل جاتا ہے)

عمارہ: بیٹی! مایوسی نے ان کے سوچنے سمجھنے کی قوت مسلوب کر لی ہے۔ انھیں ہر طرف بے رحم اسرائیلی ہی نظر آتے رہتے ہیں۔ ان نوجوانوں کو یہ کیا سمجھائیں گے؟ کیا کہیں گے ان سے ؟ یہودیوں کے ظلم کے خلاف بغاوت نہ کرو۔ فلسطین کی آزادی کا خیال دل سے نکال دو! وہ کب سنیں گے ان کی باتیں، آج فلسطین میں کونسا ایسا گھرانہ ہے جہاں انقلاب کا الاؤ روشن نہیں ہے۔

ذکیہ : امی جب ہمارے گروہ کے آدمی ابا کا ذکر کرتے ہیں تو مجھے شرم آنے لگتی ہے۔

عمارہ: بعض لوگ صدمے سے شکست کھا کر اپنے حواس کھو دیتے ہیں۔ ان کے ضمیر کا شعلہ بجھ جاتا ہے اور کچھ لوگ انتقام پر اتر آتے ہیں اور جب تک انتقام نہ لے لیں، صبر نہیں کرتے۔ تیرے بھائی کی شہادت نے تیرے باپ کو انتہائی طور پر ناامید کر دیا ہے اور ان کے اندر کی آگ بجھ گئی ہے۔

(دور گولیاں چلنے کی آواز)

ذکیہ : آج پھر بے درد یہودی غریبوں کی جان لے رہے ہیں۔

عمارہ: اور دیکھو، ادھر دھواں پھیل رہا ہے۔

ذکیہ : نہ جانے کس غریب کے گھر کو آگ لگائی گئی ہے۔

عمارہ: ہر جگہ خون اور آگ ہے۔ ہمارا فلسطین جل رہا ہے' پامال ہو رہا ہے' تباہ ہو رہا ہے۔

(دروازے پر دستک)

ذکیہ : کوئی دروازے پر دستک دے رہا ہے۔

عمارہ: تم ادھر چلی جاؤ۔ میں دیکھتی ہوں۔

(فاطمہ آتی ہے)

فاطمہ : کیا مجھے اس گھر میں پناہ مل سکتی ہے؟

عمارہ: ..... تم .....؟

فاطمہ : میں فاطمہ ہوں۔

عمارہ: اندر آجاؤ۔

ذکیہ : میرے ساتھ آیئے۔

فاطمہ : یہودی سپاہیوں نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ بچ کر بھاگتی ہوئی ادھر آگئی ہوں۔

(ذکیہ فاطمہ کو دوسرے دروازے کے پاس لے جاتی ہے)

ذکیہ : اس زینے پر قدم رکھیے اور نیچے اتر جایئے۔ روپوش ہونے کے لیے یہ اچھی جگہ ہے۔

فاطمہ : ممکن ہے وہ لوگ ادھر آئیں اور میرے بارے میں پوچھیں۔

ذکیہ : آپ بالکل بے فکر ہو جائیں وہ آئیں گے تو ہم ان کی باتوں کا جواب دے لیں گے۔

(ذکیہ اور فاطمہ سیڑھیوں سے نیچے اتر جاتی ہیں)

عمارہ دروازہ بند کر دیتی ہے۔

عمارہ: (مدھم لہجے میں) ذکیہ!

ذکیہ : (نیچے سے) جی امی!

عمارہ: اب نکل آؤ۔

(ذکیہ واپس آجاتی ہے)

سلمان : (باہر سے) عمارہ! دروازہ کھولو!

ذکیہ : امی آپ ابا سے بالکل نہ کہیں کہ فاطمہ یہاں چھپی ہوئی ہے۔

عمارہ: تمھارے ابا کو یہ بات کیوں کر بتائی جا سکتی ہے؟

(سلمان آتا ہے)

سلمان : آج تو یہودی ہمارے محلے کو میدان جنگ بنا دینا چاہتے ہیں۔ چاروں طرف مسلح سپاہی گھوم رہے ہیں۔ مجھے انھوں نے آگے جانے سے روک دیا ہے۔ یہ سیاہی کیسی ہے ہمارے گھر کے اوپر؟

عمارہ: دھوئیں کے بادلوں کی ہے۔

سلمان : آگ اور خون کا کھیل ہر جگہ کھیلا جا رہا ہے۔

(دروازے پر ایسا شور جیسے اس پر مکّے برسائے جا رہے ہیں)

اوہ خدائے قدوس! میرے ننگ و ناموس کی حفاظت کر! عمارہ، ذکیہ کو لے کر دوسرے کمرے میں چھپ جاؤ۔

(عمارہ دوسرے دروازے کے پیچھے چلی جاتی ہے بیرونی دروازے پر دستک کا شور دو چند ہو جاتا ہے)

کون ہے؟

کیپٹن فروغی : (گرج کر) دروازہ کھولو۔

سلمان : کھولتا ہوں۔

(سلمان جا کر دروازہ کھولتا ہے۔ یہودی کیپٹن فروغی آتا ہے)

کیپٹن فروغی : دروازہ کھولنے میں اتنی دیر کیوں لگا دی ہے؟

سلمان : کیپٹن صاحب! میں معمر آدمی ہوں۔ ضعیف انسان شور سن کر گھبرا جاتا ہے۔

کیپٹن فروغی : میں کیپٹن فروغی ہوں۔

سلمان : مجھے معلوم ہے۔

کیپٹن فروغی : کیسے معلوم ہے؟

سلمان : یہ نہ پوچھیے میرے بچے کو آپ ہی لے گئے تھے۔

کیپٹن فروغی : تم اس پاگل جبار کے باپ ہو جسے اس روز قتل کیا گیا تھا۔

سلمان : مجھے بہت افسوس ہے کہ میرے بچے نے ایک غیر مناسب حرکت کی تھی۔

کیپٹن فروغی : وہ ان بیوقوف لوگوں کے ساتھ مل گیا تھا جو جا بجا تخریبی سرگرمیوں میں اس ملک کا امن و امان تباہ کر رہے ہیں مگر ہم امن و امان کے ایک ایک دشمن کو کیفر کردار تک پہنچا دیں گے اور ان گھروں کو جلا کر خاکستر کر دیں گے، جہاں ایسے گمراہ لوگ رہتے ہیں یا پناہ لیتے ہیں۔ سلمان!

سلمان : جی کیپٹن۔

کیپٹن فروغی : معلوم ہوتا ہے تم نے اپنا لختِ جگر کھو کر کوئی سبق نہیں سیکھا۔

سلمان : میں نے آج تک کسی قسم کی سیاسی سرگرمی میں حصہ نہیں لیا۔ میں ایک معلم ہوں۔ میری ساری زندگی بچوں کو تعلیم دیتے ہوئے گزری ہے۔ میں نے کبھی مسلمان اور یہودی طلبہ میں کوئی فرق رَوا نہیں رکھا کیپٹن فروغی۔

کیپٹن فروغی : میں خوب جانتا ہوں تم جیسے معلموں کو۔ فریب دینے کی کوشش

مت کرو۔ جس مجرم کو تم نے ابھی ابھی پناہ دی ہے، اسے فی الفور نکال کر باہر لے آؤ۔

سلمان: کیپٹن! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ میرے گھر میں کوئی نہیں آیا۔

کیپٹن فروغی: کوئی نہیں آیا! سچ کہہ رہے ہو؟

سلمان: برب کعبہ سچ کہہ رہا ہوں۔ میں نے اپنے شاگردوں کو ہمیشہ سچ بولنے کی تلقین کی ہے۔ کیپٹن میں خود کس طرح -------

کیپٹن فروغی: بکو نہیں۔ نکالو اسے میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔

سلمان: میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں کیپٹن! صبح سے اب تک آپ کے سوا یہاں کوئی نہیں آیا۔

کیپٹن فروغی: فاطمہ یہاں نہیں آئی!

سلمان: فاطمہ کون؟

کیپٹن فروغی: اسے اپنے گھر میں پناہ دی ہے اور معصومیت سے کہہ رہے ہو کہ فاطمہ کون ہے۔ نکالو اسے۔ ساتھ لے کر باہر آؤ ورنہ مجھے اپنی کارروائی کرنا ہوگی۔ تمھیں بیس ثانیے دیے جاتے ہیں۔ مجرمہ کو نکال کر میرے حوالے کر دو۔ اس کے بعد میں کچھ نہیں سنوں گا۔

سلمان: میں آپ کو کس طرح یقین دلاؤں کہ یہاں کوئی نہیں آیا۔

کیپٹن فروغی: تو گویا مجھے مجبور کر رہے ہو کہ اپنی کارروائی کروں (بلند آواز سے) نعمان اور حاکم! اندر آؤ۔

(دو یہودی سپاہی تیزی سے اندر آجاتے ہیں)

کیپٹن فروغی: جاؤ سارے گھر کی خوب تلاشی لو۔

سلمان: کیپٹن صاحب! اندر کوئی نہیں میری بیوی ہے اور بچی ہے۔

کیپٹن فروغی: میں دیکھتا ہوں کون ہے اور کون نہیں ہے۔ نعمان! جاؤ۔

(نعمان اور حاکم دروازے کے پیچھے چلے جاتے ہیں)

سلمان : آیئے میں آپ کو اندر لے چلتا ہوں۔

کیپٹن فروغی : تم یہاں سے نہیں جا سکتے، رک جاؤ۔

سلمان : آپ زیادتی کر رہے ہیں کیپٹن! ایک امن پسند شہری کو پریشان کر رہے ہیں۔ میں نے اپنی ساری زندگی ایک اصول پر عمل کر کے گزاری ہے اور وہ اصول ہے گوشہ نشینی۔

کیپٹن فروغی : تم اپنی گوشہ نشینی ہی سے دوسروں کو دھوکا دیتے ہو۔

(نعمان اور حاکم عمارہ اور ذکیہ کو لے کر آتے ہیں)

نعمان : یہ دیکھیے کیپٹن۔

سلمان : یہ میری بیوی ہے اور یہ میری بچی ہے۔

نعمان : دونوں دیوار سے لگی ہوئی تھیں۔ ہمیں دیکھ کر یہ لڑکی پیچھے چلی گئی مگر میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی اسے دیکھ لیا تھا۔

حاکم : یہی وہ مجرمہ ہے جسے ہم تلاش کر رہے تھے۔

سلمان : یہ میری بچی ذکیہ ہے میری صرف یہی ایک اولاد ہے۔ اس کے بھائی کو آپ لے گئے ہیں۔

کیپٹن فروغی : جیسا بھائی ویسی بہن! دونوں بہن بھائی اس فتنہ گر گروہ میں شامل تھے، جسے تم لوگ "الفتح" کی تنظیم کہتے ہو۔ مجھ سے غلطی ہوئی اس زمانے میں اسے بھی گرفتار کر لینا چاہیے تھا۔ اس نے اب تک ہمیں بہت نقصان پہنچایا ہے۔

سلمان : میری ذکیہ کیا نقصان پہنچا سکتی ہے، یہ تو ایک معصوم بچی ہے۔

کیپٹن فروغی : ذکیہ......؟

سلمان : جی ہاں اس کا نام ذکیہ ہے۔

کیپٹن فروغی : ذکیہ نہیں فاطمہ' فاطمہ

حاکم : یہی فاطمہ ہے۔

سلمان : ہرگز نہیں۔ آپ اس سے اس کا نام پوچھ لیں۔ اس کی کتابیں دیکھ لیں۔ ہر جگہ اس کا نام ذکیہ بنت سلمان غنی پائیں گے۔ ملاحظہ فرمائیے' اس کی یہ کتاب۔

(سلمان ایک کرسی سے کتاب اٹھا کر کیپٹن فروغی کو دیتا ہے۔ کیپٹن فروغی کتاب کو دیوار پر دے مارتا ہے۔ ہلکا سا شور)

کیپٹن فروغی : مجھے دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہو ــــ لڑکی!

ذکیہ : جی!

کیپٹن فروغی : تمھارا نام کیا ہے؟

(ذکیہ خاموش رہتی ہے)

کیپٹن فروغی : خاموش کیوں ہو؟ بتاؤ تمھارا نام کیا ہے؟

ذکیہ : فاطمہ!

کیپٹن فروغی : فاطمہ (زور سے قہقہہ لگا کر) سنا تم نے فریب کار معلم۔

سلمان : ذکیہ یہ تم کیا کہ رہی ہو؟ تمھیں کیا ہو گیا ہے؟

کیپٹن فروغی : اس نے اپنا صحیح نام بتایا ہے۔ تم اسرائیلی کیپٹن فروغی کو دھوکا نہیں دے سکتے۔ میں جانتا ہوں کہ دل کی سچائی کو دل کی گہرائیوں سے کس طرح کھینچ کر باہر لایا جا سکتا ہے۔

(وحشیانہ قہقہہ) کہتا ہے اس کا نام ذکیہ ہے مَردُود' پیرِ فرتُوت۔

سلمان : میں بالکل سچ کہ رہا ہوں۔ یہ ذکیہ ہے۔ یہ اس کا پیدائشی نام ہے۔ آج تک ہم اسے اسی نام سے پکارتے رہے ہیں۔ یہ میری بیٹی ذکیہ ہے۔

کیپٹن فروغی : میں کہتا ہوں اب مجھے فریب مت دو۔ میں جس لڑکی کی تلاش میں اتنے دنوں سے سرگرداں تھا، وہ آج میرے ہاتھ آگئی ہے۔

سلمان : کیپٹن! مجھے خدائے موسیٰ کی قسم یہ ذکیہ ہے۔

کیپٹن فروغی : ایک طرف ہو جاؤ۔ نعمان اور حاکم! اس لڑکی کے دونوں ہاتھ زنجیروں سے باندھ دو اور لے چلو۔

(دونوں سپاہی ذکیہ کے ہاتھ زنجیروں سے باندھنے لگتے ہیں)

سلمان : ظالمو! یہ نہ کرو! یہ میری بچی ذکیہ ہے۔ تم نے پہلے میرے لخت جگر کو گرفتار کر کے شہید کر دیا تھا اور اب میری بچی کو لیے جا رہے ہو۔ کچھ تو خدا کا خوف کرو۔ فاطمہ کوئی اور لڑکی ہے یہ نہیں ہے۔ میں ہر قسم کھانے کو تیار ہوں۔

کیپٹن فروغی : نعمان! جلدی کرو۔ لے چلو فی الفور۔

سلمان : نہیں تم میری بچی کو نہیں لے جا سکتے۔ تم میری بچی کو ۔۔۔۔

کیپٹن فروغی : اسے دھکا دے کر پرے گرا دو۔ کیا شور مچا رہا ہے۔

سلمان : اف میرے خدا۔ کیپٹن فروغی! میری بچی کو مت لے جاؤ۔

(کیپٹن اور سپاہی ذکیہ کو بیرونی دروازے کی طرف لے جاتے ہیں)

کیپٹن : (سلمان کو دھکا دے کر) جا اپنے گھر جا کر غائب ہو جا ورنہ میرے غضب کی آگ تمہیں بھی جلا کر خاکستر کر دے گی۔

(سب دروازے سے باہر نکل جاتے ہیں)

سلمان : (دور سے) کیپٹن فروغی! خدارا میری بات تو سنو۔ یہ فاطمہ ہرگز نہیں ہے۔ ذکیہ ہے! آہ ظالم!

عمارہ : (اندرونی دروازے کے پاس جا کر) فاطمہ!

(فاطمہ آتی ہے)

فاطمہ : کیا وہ لوگ آ کر جا چکے ہیں؟

عمارہ: ہاں بیٹی! وہ آ کر چلے گئے ہیں۔

فاطمہ : آپ کو تو کچھ نہیں کہا؟

عمارہ: انھیں کہنے سے کون روک سکتا ہے۔

فاطمہ : وہ، آپ کی بیٹی کہاں ہے؟

عمارہ: کہیں نہ کہیں تو ہو گی ہی۔

فاطمہ : کیا مطلب؟

عمارہ: وہ لوگ اسے لے گئے ہیں۔

فاطمہ : کیوں؟

عمارہ: اس نے کہا تھا میں فاطمہ ہوں۔

فاطمہ : اس نے کہا تھا میں فاطمہ ہوں۔ یہ کیا غضب کیا اس نے؟

عمارہ: اس نے جو کچھ کیا بالکل درست کیا۔ اس نے اپنے بھائی کی وصیت پر عمل کیا ہے۔ جب وہ آخری بار اس گھر سے جا رہا تھا تو اس نے تمھارا حلیہ بتا کر کہا تھا کہ اگر اس حلیے اور فاطمہ نام کی ایک لڑکی کبھی یہاں آئے اور پناہ مانگے تو اسے ہر حالت میں پناہ دینا۔ اس مقصد میں تمھیں جان بھی قربان کرنے کی ضرورت پیش آئے تو ہچکچانا نہیں۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے میری بچی بالکل نہیں ہچکچائی۔ ذرہ برابر خوفزدہ نہیں ہوئی۔ جاؤ! بیٹی جاؤ۔ اس واقعے کا کوئی خیال نہ کرو۔ میں نے اپنے بیٹے اور میری بچی نے اپنے بھائی کی آخری آرزو پوری کی ہے۔

(فصیلِ شب)

سوالات

۱۔ "فلسطین ہمارا ہے، ہم فلسطین کے ہیں"۔ یہ جملہ کس نے اور کس موقع پر کہا؟

۲۔ بے رحم یہودی فوجیوں نے فلسطینی معلم سلمان غنی کے جواں سال بیٹے سہیل کو موت کی نیند کیوں سلا دیا تھا؟

۳۔ ذکیہ نے اپنے شہید بھائی کی آرزو کیسے پوری کی؟

۴۔ فاطمہ کون تھی اور اس نے معلم سلمان غنی کے مکان پر آکر پناہ کیوں طلب کی؟

۵۔ اس ڈرامے کا خلاصہ اپنے الفاظ میں تحریر کیجیے۔

○☆○☆○☆○☆○☆○

ہاجرہ مسرور
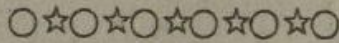
(۱۷جنوری ۱۹۲۹ء)

ایک کہانی بڑی پرانی

بڈھے نوکر نے دروازے میں سے سرنکال کر پھر کچھ کہنا چاہا — "اُفوہ بھئی' بہت سن لیں تمھاری باتیں۔ میرا دماغ نہ کھاؤ۔ میرے گھر رہنا ہے تو جیسا میں کہوں وہی کرنا ہوگا ورنہ —" دروازہ بند ہوتے دیکھ کر وہ چپ ہوگئیں ان کے ہاتھ لرز رہے تھے غصے سے یا شدید سردی سے۔ کھڑکی کے شیشوں پر سے پرانی ساڑھی سے بنا ہوا پردہ بھی ہٹا ہوا تھا۔ پھر بھی کہر کے مارے ہوئے سورج کی روشنی میں کمرہ اندھیرا لگ رہا تھا۔ انھوں نے پلاسٹک کی سلائیوں پر اون کے پھندوں کو آنکھوں کے قریب لاکر گننا شروع کیا۔

"بیگم صاحب" بڈھے نوکر نے کمرے کا دروازہ پھر کھولا اور اندر آگیا۔ اب اس کے ہاتھ میں چادر میں بندھی گٹھڑی تھی۔

"پھر جانے کی دھمکی دے رہے ہو بخشو میاں۔ تم سمجھتے ہو میرے ہاتھوں میں دم نہیں۔ پھر تم ہو کس کام کے! جیسا پکاتے ہو خوب معلوم ہے۔ میں نہ دیکھوں تو بھلا کوئی پیٹ بھر کر کھا سکتا ہے۔ بازار سے سَودا سُلف لا دیا اور بچوں کو اسکول سے لے آئے تو سمجھتے ہو گھر کے سارے کام نمٹ گئے۔ سارا دن تو میں ہی مرتی کھپتی ہوں گھر کے کاموں میں — واہ اچھی دھمکیاں ہیں جانے کی"۔

دھپ سے گٹھڑی فرش پر پھینک کر بخشو میاں اکڑوں بیٹھ گئے اور گٹھڑی کی گرہ کھول دی۔

"لو دیکھ لو کچھ لے کر نہیں جا رہے تمھارے گھر سے' بعد میں نہ کہنا۔" "بس بس دیکھ لیا' ہاں یہ سویٹر رکھ دو' میں نے نیا بن کر تمھیں دیا تھا۔ تمھیں ہماری پروا نہیں تو ہمیں بھی نہیں۔ اب جو یہاں کام کرے گا وہ پہنے گا اسے —۔ ہونہہ کتنا

ہی خیال کرو تمہارا کوئی فائدہ نہیں۔ ناقدرے ہو ـــــ" وہ بے حد چڑ چڑا کر بولتی گئیں۔ لیکن جب بڈھا نوکر گٹھڑی باندھ کر سچ مچ چل پڑا تو انھیں ایک دم شدید کمزوری کا احساس ہوا اور گھبراہٹ سے کھانسی اٹھنے لگی۔ کھانستے کھانستے ان کے دل میں نوکر کے لیے رحم کی ایک لہر سی اٹھی۔ انھوں نے گرم لحاف ایک طرف الٹا اور سویٹر اٹھا کر دروازے کے باہر صحن میں اچھال دیا۔

"بخشو یہ لے جاؤ اپنا سویٹر۔ ایک دفعہ جو دے دیا سو دے دیا ـــــ" اور پھر وہ کھلے دروازے میں کھڑی رہ گئیں۔ بڈھے نوکر کے لیے جیسے ان کا دل پگھلنے لگا۔ جی چاہا اسے روک لیں، منالیں۔ اب یہ اس عمر میں کہاں محنت کرے گا۔ یہ بے چارہ تو ان کی شادی سے پہلے ان کے میاں کے پاس تھا۔ تنخواہ بھی کیا لیتا تھا؟ بس پان سگریٹ کا خرچ، کھانا کپڑا، دوا علاج اور سر پر چھت اس کے لیے بہت۔ عجیب سادھوؤں اور تیاگیوں جیسا رویہ تھا اس کا ـــــ ناراض ہوتا تو کچھ دن کے لیے اپنی گٹھڑی لے کر چلا جاتا۔ دو چار گھروں میں رہ کر اور وہاں سے بھی روٹھ کر پھر یہیں واپس آجاتا ہے ـــــ بے چارہ! مگر وہ سوچتی رہیں۔ کچھ کہ نہ سکیں۔ کھانسی ایسی منہ بھر کر آئی کہ وہ غسل خانے کی طرف دوڑیں۔ کھانس کر تھوکا تو بلغم پر خون کی سرخ دھاری چمکی۔ گھڑ گھڑا کر جیسے چلتی ریل گاڑی پٹڑی پر رک گئی۔ کانوں میں انجن سنسنانے لگا۔ انھوں نے ذہن کی کھڑکی سے جھک کر دیکھا وہی سینی ٹوریم والا اسٹیشن۔

وہ گھبرا کر پلٹیں اور لحاف میں خوفزدہ بچے کی طرح بیٹھ گئیں اور پھر اون سلائیاں نظر آئیں تو کچھ یوں تیزی سے بننے لگیں جیسے اون کے یہ پھندے ان کے آوارہ خیالات کو بھی جکڑ لیں گے۔ اونہہ زکام ہے۔ زکام بگڑ گیا ہے شاید، ایسے میں گلے سے خون آجاتا ہے۔ مگر میں اتنی چڑ چڑی کیوں ہو گئی ہوں؟ شاید۔ بخار ہے! انھوں نے ایک خوب گہری سانس لی جو ان کے ہونٹوں اور ٹھوڑی پر لو کے جھونکے کی طرح لگی۔ اون اور سلائیاں تپائی پر ڈال کر وہ اٹھیں اور الماری کھول کر کچھ ڈھونڈنے لگیں۔ نہ جانے عورتیں اپنی چیزیں اس قدر بند کر کے کیوں رکھتی ہیں؟ تالے والی الماری اور اس کے اندر بند ڈبے۔ آخر الماری کے ایک کونے میں بیکار کپڑوں تلے

ٹین کا وہ ڈبا مل گیا، جس میں ان کی مرحومہ ماں کی یادگار چاندی کی سرے دانی کے ساتھ تھرمامیٹر بھی رکھا تھا۔ انھوں نے کانپتے ہاتھوں سے تھرمامیٹر نکالا اور ایک دو بار جھٹک کر منہ میں رکھ لیا ـــــ بند آنکھوں کے سامنے سے، دھڑکتے ہوئے دل پر بھاری بھاری قدم پر رکھتے گیلن سی چھوتے وہ سارے دن گزرنے لگے جن میں وہ اپنے میاں اور بچوں سے دور سینی ٹوریم کے جنرل وارڈ میں پڑی تھیں۔ جہاں سارے وقت ان کا ذہن بچوں اور شوہر کے لیے طرح طرح کے وسوسے بنتا رہتا۔

خدا جانے اب جوتے بھی کیسے بننے لگے ہیں کہ چاپ بھی نہیں سنائی دیتی ـــــ وہ پشت پر آ کر کھنکھارے تو آنکھوں کے ساتھ منہ بھی کھل گیا اور تھرمامیٹر زمین پر ٹپک پڑا۔

"میں نے کہا زکام ہو دیکھوں بخار تو نہیں کم بخت ٹوٹ گیا۔ نیک شگون ہے ـــــ" وہ بے فکری دکھا رہی تھیں۔ سوچ رہی تھیں جب انھیں پروا ہی نہیں تو کیوں اپنا دکھڑا روؤں۔

"بخشو میاں کو پھر نکالنے کی کوشش ہے، وہ تو میں دفتر نہیں گیا تھا جو روک لیا۔" انھوں نے بے تعلقی سے کھڑکی کے باہر دیکھتے ہوئے کٹیلے لہجے میں کہا۔

"میں نے تو نہیں نکالا کسی کو۔ خود گٹھڑی باندھ لائے ـــــ" وہ بھی اسی طرح بولیں جیسے کسی اور سے کہہ رہی ہوں۔ دو دن پہلے کے جھگڑے کے بعد یہی صورت حال تھی۔ جھگڑے تو اب بار بار ہی ہوتے۔

"شام کو کچھ لوگ آئیں گے بخشو میاں ـــــ بازار سے سموسے لے لینا۔ درجن بھر۔ گھر میں تو کوئی ڈھنگ کی چیز بن نہیں سکتی۔ چائے ہی ٹھیک بنا سکو تو بنا لینا"۔

انھوں نے باورچی خانے کا دروازہ کھول کر کہا اور پلٹ کر دوسرے کمرے میں جانے لگے۔

"واہ میری بھی تو کوئی عزت ہے۔ اب ان کی خوشامدیں ہوں گی تو اور

میرے سر پر ناچیں گے۔ جیسے بخشو میاں ہی تو یہ گھر چلا رہے ہوں۔ اپنی جان کھپا دی اور یہ صلہ ملا ہے مجھے ـــــ" وہ زور زور سے بولتی میاں کے پیچھے آئیں۔ مگر وہ میز پر سے دفتر کی فائلیں اٹھا کر باہر نکل گئے۔ میاں نے باہر اسکوٹر نہیں اسٹارٹ کیا۔ جیسے ان کے ذہن پر لات ماری ہو۔ ایسی لات جس سے ان کے دماغ کے سارے کل پرزے چل پڑے۔

"خدا سمجھے!" وہ کرسی پر بیٹھ کر پُھسر پُھسر رونے لگیں۔

"ہمیشہ وہی چاہیں گے جو میں نہ چاہوں۔ ہمیشہ مجھے ذلیل کریں گے۔ دوسروں کے سامنے ـ،، انھوں نے دوپٹے سے ناک پونچھی اور دل کھول کر رونے لگیں۔ نیم تاریک ٹھنڈے کمرے میں گرم گرم آنسوؤں سے انھیں بڑی طمانیت کا احساس ہوا۔

"یہ دیکھو یہ جھاڑ پونچھ کی ہے بخشو نے حضور کے کمرے کی۔" انھوں نے جیسے میاں کو مخاطب کیا اور روتی ہوئی اٹھیں اور میز کی سطح پر جمی ہوئی گرد کی تہ کو انگلیوں سے صاف کیا اور پھر جھنجلا کر انھوں نے اپنے دوپٹے کے پلو سے ہی سارا فرنیچر پونچھ ڈالا۔

"لو ذرا دیکھو' اگر میں اس وقت دھیان نہ دیتی تو یوں ہی خاک جمی رہتی پھر جو آتا میری صحت کے قصے لے بیٹھتا۔ ہمدردیاں جتاتا"۔ طنطنے میں انھوں نے کمرے کی صفائی کر ڈالی۔ بانس لا کر چھت کا جالا لے ڈالا۔ مگر روشن دان میں لگے چڑیا کے گھونسلے سے آنکھ بچا گئیں۔ کم بخت چڑیوں نے نہ جانے کب روشن دان کی ذرا سی کھلی درز پا کر تنکے پھنسا لیے اور اب تو اس میں بچے چوں چوں کر رہے تھے۔ ان کے میاں نے بھی بخشو کو ہدایت کر دی تھی کہ اب گھونسلا نہ چھیڑنا ورنہ بددعا لگے گی چڑیوں کی۔ گھونسلے کو نظر انداز کر کے انھوں نے پردے جھٹک جھٹک کر دھول نکالی۔ ابھی چند ہفتے پہلے ہی تو انھوں نے گھر کے خرچ میں سے پیسہ پیسہ بچا کر یہ اچھے خاصے مہنگے پردے سلوائے تھے۔ اب بچت کوئی سیکڑوں تو تھی نہیں۔ یہی انڈوں میں، گوشت میں' دودھ میں ڈنڈی مار لیتیں۔ ڈاکٹر نے انھیں انڈا مکھن روز کھانے کی ہدایت کی تھی، مگر

وہ یہ چیزیں کھاتی رہتیں اور پردے نہ بنتے تو وہ اور بیمار نہ ہو جاتیں۔ ڈاکٹر نے یہ بھی تو کہا تھا کہ خوش رہا کرو۔ گھر بنا تو خوشی ہوئی اب نئے گھر میں سب پرانی چیزیں تو اچھی نہیں لگتیں۔ اس لیے ایک پردہ ہی کیا یہ میز' یہ کرسیاں' یہ صوفہ بھی تو انھوں نے ہی خریدا تھا۔ یہ کمرہ تو انھیں اتنا عزیز تھا کہ بچوں کو یہاں گھسنے نہ دیتیں مگر یہ بڑے میاں بخشو ہیں کہ انھیں چیزوں کی اہمیت اور قدر کا پتا ہی نہیں۔

بڑی دیر تک وہ کھانس کھانس کر کمرے کی صفائی کرتی رہیں۔ کرسیوں کی ترتیب بدل ڈالی۔ دیواروں پر لگی بچوں' میاں اور اپنی تصویریں گیلے کپڑے سے پونچھیں اور پھر تصویر کے سامنے دیر تک کھڑی رہیں۔ سب جھوٹ تھوڑا ہی کہتے ہیں کہ میں خوبصورت ہوں۔ انھوں نے مسکرا کر سوچا۔ انھیں اپنی تصویر دیر تک دیکھنے سے بڑی طمانیتِ اور اعتماد محسوس ہوا۔

جب وہ دوبارہ اپنے کمرے میں آئیں تو انھیں خیال آیا کہ سویٹر تو بُنا ہی نہیں۔ بس اسکا گلا ہی تو بننا رہ گیا تھا۔ وہ دوبارہ بننے بیٹھ گئیں۔ جو آئیں گے دیکھیں گے کہ بے چارہ پپو کیسا پرانا گھسا سویٹر پہنے ہے۔ بے چارہ بچہ! کتنے دن لگ گئے تین سوئٹروں میں۔ وہ بنتی گئیں اور ذہن میں پھندے سے کھلتے گئے۔

"میں شاید بہت چڑچڑی ہو گئی ہوں۔ پرسوں خواہ مخواہ ہی تو ان کی جلی کٹی باتوں کا جواب اس طرح دینے لگی۔ پتا نہیں کیوں میں جب سے بیمار ہوئی ہوں' سمجھتی ہوں وہ میرے نہیں رہے۔ ہر بات میں میری کاٹ کرتے ہیں۔ اب آج ہی بخشو میاں کا معاملہ دیکھو میں نے کہا جاتے ہو جاؤ۔ انھوں نے حکم دیا "رکو" ذرا میرا خیال نہیں انھیں۔" ذلت کے خیال سے آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"مر جاؤں گی تو چھٹی ہو جائے گی۔ پھر قدر ہو گی میری' میاں جی کو۔" ہاتھ روک کر بہتے آنسوؤں کو پلو سے پونچھنے سے پہلے سرخ سویٹر پر آنسوؤں کے چند قطرے گر گئے۔ "ہائے اللہ توبہ!" انھوں نے سویٹر جلدی سے سینے سے لگا لیا۔ میں مر جاؤں گی تو میرے دونوں بیٹوں کا کیا ہو گا۔ بھوکے پھریں گے تو باپ کو خبر نہ ہو گی۔ ننگے پھریں گے تو کسی کو خیال نہ آئے گا۔ وہ جو مثل ہے باپ لکھیا نہیں بھلا' ماں پنہاری بھلی ——"

توبہ بچوں کے اس انجام کے تصور سے ہی وہ کانپ اٹھیں۔

"دونوں بچے اسکول سے لانے کا وقت ہو رہا ہے۔ جانے بخشو نے کچھ پکایا بھی یا نہیں۔ ارے آج تو وہ پیسے بھی دے کر نہیں گئے۔ غصہ میں بھول ہی گئے، حضور والا ــــ" وہ گھبرا کر اٹھیں۔

ایک بار پھر الماری کھلی۔ ڈبے کھلے اور خاصی ریز گاری مل گئی۔ انھوں نے باورچی خانے میں جھانکا۔ ریز گاری بخشو میاں کو دے کر جلدی سے انڈے لانے کو کہا۔ اور خود انڈے کا سالن بنانے کے لیے پیاز کاٹنے بیٹھ گئیں۔

سر میں دھمک سی ہو رہی تھی، اور کھانسی بدستور اٹھ رہی تھی۔ کھانا پک گیا۔ بچے اسکول سے آگئے۔ چھوٹے پپو نے کھانا کھا کر خوشی خوشی نیا سویٹر پہن لیا۔ بخشو میاں بازار سے سموسے بھی لے آئے۔

جب شام کو ان کے میاں آئے تو وہ نیند میں پسینے سے نہا چکی تھیں۔ نہ جانے کب سو گئی تھیں اور اب باہر کا دروازہ کھٹکھٹایا جا رہا تھا۔ انھوں نے اٹھنا چاہا مگر اٹھا نہیں جا رہا تھا۔ انھیں صحن میں میاں کے رشتے کی پھوپی اور ان کی پولیو سے لنگڑی بیوہ بیٹی کی آوازیں سنائی دینے لگیں اور پھر پڑوسن خالہ اور ان کے شوہر کے بولنے کی جانی پہچانی آوازیں آنے لگیں۔

"ہاں تو یہ ہیں ہماری قسمت کے مہمان۔ مجھے معلوم تھا جب لڑیں گے تو منصفی کے لیے ان ہی لوگوں کو بلائیں گے اور وہ ان کے کلرک دوست بھی تو آئیں گے ہاں میں ہاں ملانے ــــ"

دوسرے کمرے میں ان کے میاں بول رہے تھے۔

"دیکھ لیجیے! مزاج۔ صبح سے بتا دیا تھا کہ آپ لوگ آئیں گے۔ مجھ سے ناراض تو دنیا سے ناراض ــــ"

اپنے میاں کا فقرہ پورا ہونے سے پہلے وہ کمرے میں حاضر ہو گئیں۔ وہی چھلکتی سی نیم وا آنکھیں، بخار سے تمتمایا ہوا رنگ۔ سموسوں کی پلیٹ ان کے ہاتھ میں

تھی۔ آؤ بیٹھو بی بی۔ بخشو میاں لے آئیں گے چائے وائے۔۔۔" پھوپی دیوان پر ایک طرف کھسک گئیں۔

بخشو میاں! ارے پھوپی شکر کیجئے وہ تو میں گھر میں موجود تھا ورنہ یہ تو اسے کبھی کا دھکا دے چکی تھیں۔ میاں نے بڑے جوش سے سبھوں کو اطلاع دی اور داد طلب نظروں سے دیکھنے لگے۔

اور وہ بمشکل خود کو چیخ کر بولنے سے روک سکیں۔

"آپ کو تو معلوم ہے پھوپی۔ بخشو میاں کی عادتیں۔جب چاہیں رہیں جب چاہیں گٹھڑی باندھ کر نکل جائیں"۔وہ آہستہ سے بولیں۔

"ہاں یہ بات تو ہے۔ خدا لگتی کہوں گی کہ ایک دفعہ تمھارے ہاں سے روٹھ کر میرے گھر بھی تو ڈیرہ ڈالا تھا۔ تو ہفتہ نہیں رہے کہ خود ہی روٹھ کر کہیں اور چلے گئے۔بس بے چارے بخشو بوڑھے ہو گئے بہت اور پھر بیٹا یہ نوکروں کا۔۔۔"

پھوپی بخشو میاں کے قصے میں الجھ گئیں۔ ادھر بخشو میاں اپنے بچے کھچے دانت نکالے چائے کی کشتی اندر رکھنے آگئے۔

چائے پیالیوں میں ڈالتے ہوئے وہ سوچ رہی تھیں "کتنے دن سے چائے کی ٹرالی لینے کو جی چاہتا ہے مگر ریزگاری اتنی نہیں جمع ہونے پاتی۔جب دیکھو مہنگائی کا رونا روتے رہتے ہیں اور گھر کا روزانہ خرچ دینا بھول جاتے ہیں۔"

سب مہمان چائے پینے اور سموسے چکھنے لگے۔ کمرے میں پیالیوں اور چمچوں کی آواز چھاگئی۔ اچانک کمرے میں ایک چڑیا روشن دان کے شیشے سے ٹکرائی۔ انھوں نے آنکھ اٹھاکر دیکھا جالے اتارتے ہوئے روشن دان کی درز شاید بالکل بند ہو گئی تھی اور چڑیا جو اندر آگئی تھی باہر نہیں نکل پارہی تھی۔

"پوچھئے' آج پھر پوچھیے ان سے ۔۔۔" میاں نے پھوپی کو صحیح پٹڑی پر ڈالنے کی کوشش کی۔

"دوسروں سے پچھواتے ہیں کبھی خود بھی تو پوچھا ہوتا۔" وہ نہیں بولنا

چاہتی تھیں پر بول پڑیں۔

"اے لو بیٹی! ہم دوسرے ہو گئے ہم تو اپنا سمجھ کر آجاتے ہیں"۔ رشتے کی پھوپی برا مان کر منہ بسورنے لگیں۔

"ارے نہیں پھوپی میں ایسی بات نہیں کہ رہی۔ میں تو ان سے کہ رہی ہوں آپ کے بھتیجے سے ـــــ" انھوں نے کپکپا کر پرانی گرم چادر اپنے گرد زور سے لپیٹ لی جیسے چادر تلے خدا جانے کیا کیا چھپا رہی ہوں۔

"تمھیں کیا نہیں پوچھا۔ تمھارے پاس کیا نہیں؟ تمھیں کیا سڑک پر بٹھا رکھا ہے؟ شکر نہیں کرتیں نئے مکان میں بیٹھی ہو۔ تمھیں کھانے کو نہیں ملتا؟ پہننے کو کپڑا نہیں؟ دوا علاج نہیں ہوتا؟ اور کیا پوچھوں بتاؤ نا"۔ میاں کی آواز بلند ہونے لگی۔ ہاں ہاں بیٹی جو کہنا ہے کہو۔" پڑوسن خالہ کے شوہر نے رُسان سے کہا۔

"گھر کے طعنے رات دن سنتی ہوں جیسے گھر انھوں نے بنوایا ہو کھڑے ہو کر۔ ارے میں نہ ہوتی تو یہ گھر بنتا؟ اپنا پیٹ کاٹا' اپنا جی مارا۔ پیسہ پیسہ دانتوں سے پکڑا جب یہ گھر بنا ہے۔ میں نے تو اپنے پراویڈنٹ کا پیسہ بھی اسی میں ڈالا۔ چھ تولے سونے کا سیٹ تھا میرے جہیز کا' وہ بھی بیچ کر اسی میں لگا دیا۔" وہ بولتی چلی گئیں۔

"سن لیا آپ لوگوں نے؟ اتنی چھچھوری طبیعت ہے ان کی۔ آج کھُلیں سب کے سامنے۔ ہم نے انھیں کھلایا پہنایا۔ دوا علاج کے لیے رات دن کی بیمار آج یہ زیور اور روپے کا طعنہ دے رہی ہیں۔ کیا میں نے تم سے روپیہ زیور مانگا تھا؟ قسم کھا کر کہو. بچوں کے سر کی"۔ میاں آگ بگولا ہو گئے۔

"ہر بات کا غلط مطلب نکالتے ہیں۔ میں تو کہ رہی تھی میں نے اس گھر کے لیے آپ کے لیے سب ہی قربان کر دیا اور آپ ہیں کہ میری ذرا پُروا نہیں۔ میں نے آپ کے کہنے پر اپنی دس سال کی اسکول ٹیچری بھی چھوڑی شادی کے بعد"۔ وہ بھی بولتی گئیں۔

"ارے بی بی نیک بخت عورتیں اپنے گھر کے لیے ایسا ہی کرتی ہیں۔" بوڑھے کلرک نے کہنا شروع کیا۔ "میری بیٹی تو ـــــ"

کلرک نے کہنا شروع کیا۔ "میری بیٹی تو ـــــ"

کلرک کی بیٹی کی قربانیوں کی فہرست لمبی تھی۔ جسے وہ اپنے کھولاؤ میں نہیں سن رہی تھیں وہ تو کمرے میں موجود چڑیا کی طرح ہراساں تھیں جو اب باہر کی راہ نہ پاکر بار بار سب کے سروں پر اڑ رہی تھی۔

گھر میں بھی آئیں گے تو جیسے دفتر میں بیٹھے ہیں۔ کبھی گھر کا حال پوچھا دو برسوں میں۔ جب سے میں بیمار ہوئی تو۔" ان کی آواز بھرّا گئی۔

"ہاں ہاں اور خوب فیل ا مچاؤ۔ آنسو تو تمھاری پلکوں پر دھرے رہتے ہیں۔ جب گھر میں آؤ منہ سوجا ہوا دیکھو۔" وہ تڑخ کر بولے اور بولتے چلے گئے: "کبھی تم نے پوچھا کہ میرا کیا حال ہے؟ میری کیا پریشانیاں ہیں؟ دفتر کے کیا حالات ہیں؟ مکان کا قرض سر پر چڑھا ہوا ہے۔ صاحب! یہ تو چاہتی ہیں کہ گھر میں بیٹھا ان کا منہ دیکھتا رہوں ان کے قصیدے پڑھتا رہوں"۔ وہ بولتے گئے تو وہ ایک دم چیخ اٹھیں۔

"دیکھیے حد ہوتی ہے؟ بس کیجیے۔ یہ قصیدے پڑھیں گے میرے؟" انھوں نے آنسو ضبط کیے۔

"دیکھا آپ لوگوں نے؟ دیکھا۔ سیدھی بات ہے یہ مجھ سے بیزار ہو گئی ہیں۔ میں ٹکٹ لے آیا ہوں ریل کا۔ یہ دو ایک مہینے اپنی بہن کے پاس رہ آئیں۔ کراچی میں سردی بھی نہیں۔ بچوں کو پھوپی آپ سنبھال لیجیے گا"۔ میاں نے قصہ تمام کیا اور ایک سموسا اٹھا کر دانتوں سے کترنے لگے۔

"میں کیوں جاؤں کسی کے گھر اپنا گھر چھوڑ کر؟ اپنے بچے چھوڑ کر؟ اور پھر چھوٹی بہن کی سسرال میں؟ یہ بھی خوب رہی۔ میرا بھائی ہوتا تو شاید جانے کا ٹھکانا ہوتا"۔ وہ ایک دم پھپھک کر رو پڑیں۔

"اے ٹھیک تو کہہ رہی ہے یہ۔ بھائی باپ کے گھر جانا تو ٹھیک ہوتا ہے مگر بہن کی سسرال میں تو ـــــ" پڑوسن خالہ بول پڑیں۔

ا۔ جھوٹ موٹ کا رونا

"یہ مجھ سے جان چھڑانا چاہتے ہیں۔ میں نے ان کے لیے کیا نہیں کیا۔ ہانڈی سے اچھی بوٹیاں ان کو دیں۔ گھی کا تار ان کے برتن میں ڈالا۔ ان کے کپڑے دھوئے' استری کی' جوتے پالش کیے۔ ارے ہم نے تو کبھی کوئی جمعدارنی بھی صفائی کے لیے نہیں رکھی۔ میں نے گھر کے خرچ میں سے پیسہ پیسہ جوڑا اور اس گھر پر خرچ کیا۔ کیا کچھ نہیں کیا؟ بچے پالے' کبھی بچوں کی بیماری آزاری میں نہیں کہا کہ دفتر سے چھٹی لو اور اب کہہ رہے ہیں کہ میں چاہتی ہوں یہ گھر بیٹھ کر میری صورت تکیں۔ ارے کبھی تو پوچھیں کہ مرتی ہو یا جیتی ہو؟" "تمھارا کیا حال پوچھیں سدا کی بیمار" میاں منہ لٹکا کر بولے۔

"میں سدا کی بیمار تھی؟ اللہ حد ہے جھوٹ کی بھی۔ میں تو تمھارے گھر آکر بیمار ہوئی۔ بس کیا کیا کہوں؟ ڈاکٹر نے نہیں کہا تھا کہ ناقص غذا اور غم والم سے یہ بیماری ہوتی ہے۔" وہ تڑپ کر زور زور سے رونے لگیں۔

سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔ سردی کا غروب ہوتا سورج بھی ایک بادل کے ٹکڑے کے پیچھے چھپ گیا اور کمرے میں اندھیرا بڑھ گیا۔ چڑیا اب کمرے میں بے تابی سے اڑی اور پھر روشن دان کے شیشے سے ٹکرا گئی۔

"تم کتنا کتنا بیمار ہوئے میں نے کبھی کسی سے نہیں کہا۔ کسی سے فریاد نہیں کی۔ ڈاکٹر کہتا تھا کہ تمھاری خاندانی بیماری تم میں اور بچوں میں —" وہ بین کر رہی تھیں کہ میاں کھڑے ہو گئے "خبردار جو خاندان کی بات کی' زبان کھینچ لوں گا۔"

دیکھ لیجیے اب خود جو چاہیں کہیں سب کے سامنے۔" وہ زور زور سے رونے لگی۔

"اے بھابی! شریف عورتوں کی آواز گھر سے باہر نہیں جانا چاہیے"۔ پولیو زدہ نند نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا مگر وہ اس وقت اپنے آپے میں نہ تھیں۔ انھوں نے وہ ہاتھ جھٹک دیا۔

"اچھی شرافت ہے یہ ساری دنیا کو سنائیں اور میں نہ بولوں۔ سن لیجیے یہ مجھے بوجھ سمجھتے ہیں' ان کا جی بھر گیا ہے مجھ سے' میری ہر بات انھیں بری لگتی ہے۔ اور میں نے ان کے لیے کیا نہیں کیا۔" وہ اسی طرح روتے ہوئے بین کرتی رہیں۔

"بھابی اب بھیا ٹکٹ لائے ہیں تو دو چار دن کو کراچی ——" پولیو زدہ نند نے سمجھانا چاہا۔

"میں نہیں جاؤں گی اپنی ہنسی اڑوانے۔ میں اپنے بچوں کو نہیں چھوڑ کر جا سکتی"۔

"میں کہتا ہوں۔ سامان باندھو ٹکٹ ضائع جائے گا' جلدی۔" وہ اب کی دھیمی آواز میں مستحکم لہجے میں بولے۔

"نہیں جاؤں گی۔ جانا ہے تو آپ بھی چلیے' بچے بھی چلیں۔" وہ اسی ہسٹریائی انداز سے کہے گئی۔ اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں اور آنسو تھے کہ منہ دھو رہے تھے اچھا تو پھر۔ میاں کی کیفیت بالکل آتش بازی کے انار جیسی ہو گئی جس کو دیا سلائی دکھادی گئی ہو۔ "تو پھر میں تم کو طلاق دیتا ہوں۔ طلاق ——"

اور جیسے انار کے سارے جلتے پھول ان پر برس گئے۔ پھر بھی نہ جانے کیسے ان کا کانپتا ہوا ہاتھ بے اختیار آگے بڑھا۔ درمیانی گول میز جیسے انھیں نظر نہیں آ رہی تھی وہ میز پر اوندھ گئیں اور جانے کیسے انھوں نے میاں کی پتلون کا پائنچا مضبوطی سے مٹھی میں جکڑ لیا اور کچھ کہنے کی کوشش میں ہانپنے لگیں۔ آنکھوں اور ناک سے بہتا پانی' کھلے ہونٹ' اور اجڑے بالوں میں چمکتے سفید بال وہ اس عالم میں کیسی بدصورت لگ رہی تھیں۔ سب نے نظریں جھکالیں۔ میاں منہ پھیر کر کھڑے ہو گئے۔ پڑوسن خالہ نے اپنے آنسو خشک کیے بغیر بڑا زور لگا کر انھیں میز پر سے اٹھایا اور تلے کے کام والی بوسیدہ چادر ان کے سر پر ڈال دی۔

"جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اب ان سے تمھارا پردہ واجب ہے"۔ پڑوسن خالہ کے شوہر نے بمشکل کھنکھار کر بھاری آواز میں کہا اور سر جھکایا تو ان کی گہری سانس

سے اللہ نکلا۔ انھیں رشتے کی پھوپی نے بٹھا دیا کہ گر نہ پڑیں۔ مگر وہ اپنی کلائی میں پڑی سونے کی تار جیسی دو چوڑیاں کھسوٹ کر اتارنے لگیں۔

"کیا یہ چوڑیاں آپ کے گھر کی ہیں جو اتار رہی ہیں؟" بوڑھے کلرک نے میاں سے سوال کیا۔

"جی مگر جو دے دیا سو دے دیا۔ ان سے کہیے چوڑیاں پہنے رہیں"۔ میاں نے مدھم آواز میں کہا۔

"لیکن وہ تو جیسے کچھ سن ہی نہیں رہی تھیں۔ چوڑیاں اتار کر میز پر ڈال دیں اور پھر کانپتے ہاتھوں سے کانوں میں پڑی چھوٹی چھوٹی بالیاں بھی اتار کر چوڑیوں کے بیچ میں رکھ دیں۔ مگر یہ بالیاں تو ان کے جہیز کی تھیں۔ پھر وہ کانپتی ہوئی کھڑی ہوئیں اور سر پر سے تلے کے کام والی چادر بھی اتار کر میز پر ڈال دی اور خاموشی سے دروازہ کھول کر دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔

"ہے ہے بے چاری کا لڑکوں پر بھلا کیا حق۔ ارے کوئی بیٹی ہی پیدا ہوئی ہوتی تو یوں اکیلی نہ نکلتی گھر سے۔!"۔ پڑوسن خالہ نے سوچا اور اپنی آنکھیں اور ناک پونچھتی دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔

اب کمرے میں خاموشی اور سردیوں کی شام کا اندھیرا اتر رہا تھا۔ میاں نے ہاتھ بڑھا کر بجلی کا بلب روشن کیا تو چڑیا ہر طرف اڑنے اور روشن دان کے شیشے سے ٹکرانے لگی۔ میاں نے چڑیا کو دیکھا اور پھر باہر کھلنے والا دروازہ کھول دیا کہ چڑیاں گھونسلے تک پہنچنے کا راستہ خود تلاش کر لیتی ہیں۔

(سب افسانے میرے)

سوالات

۱۔ مالکن نے بخشو میاں کی گٹھڑی سے پہلے تو نیا سویٹر نکلوا لیا اور کچھ لمحوں کے بعد اسے واپس کر دیا۔ کیوں؟

۲۔ گھر میں بخشو میاں کس تنخواہ پر کام کرتے تھے؟

۳۔ بخشو میاں کا گھر والوں کے ساتھ رویہ کیسا تھا؟

۴۔ مالکن جب سینی ٹوریم کے جنرل وارڈ میں داخل تھیں تو ان کا دل گھر میں کیوں اٹکا رہتا تھا؟

۵۔ مالکن نے کمرے کا جالا اتارتے وقت چڑیوں کے گھونسلے کو کیوں نہ اتارا؟

۶۔ عورت کو اپنا گھر کس قدر عزیز ہوتا ہے؟ اس سبق میں سے دو مثالیں دیجیے۔

۷۔ میاں نے مہمانوں کو بخشو میاں کے متعلق کیا اطلاع دی؟

۸۔ چڑیا کمرے سے باہر کیوں نکل نہیں پا رہی تھی؟

۹۔ "ارے میں نہ ہوتی تو یہ گھر بنتا؟" اس جملے کی وضاحت کیجیے۔

۱۰۔ کیا میاں کا اپنی بیوی کو طلاق دینا جائز تھا؟ اگر نہیں تو کیوں؟

۱۱۔ میاں نے چوڑیاں لینے سے کیوں انکار کیا؟

۱۲۔ ہاجرہ مسرور نے اس افسانے میں ہمارے کس معاشرتی المیے کو موضوع بنایا ہے؟

○☆○☆○☆○☆○☆○

ڈاکٹر سید عبداللہ

(۱۹۰۶ء۔ ۱۹۸۶ء)
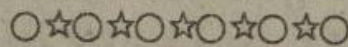
عُلومِ قدِیمہ کی اِفادِیّت ہمارے زمانے میں

عِلم کی عام تحصیل بذاتِ خود بھی ایک مقدس فریضہ ہے مگر علم کے سلسلے میں بعض مخصوص ذمہ داریاں بھی ہوتی ہیں جن کا بار ان قوموں کو اٹھانا پڑتا ہے جن سے کوئی خاص علم منسوب یا وابستہ ہوتا ہے ـــــ اس کا ثبوت ہر ملک اور قوم کی پرانی اور موجودہ تاریخ سے مہیا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کے ہر ملک میں دوسرے عام علوم کے ساتھ ساتھ اقوام اپنے مخصوص علوم کے تحفظ و فروغ ان کے مطالعہ و تشریح کا فریضہ بھی ادا کر رہی ہیں۔

مسلمانوں کے یہ خاص علوم تین طرح کے ہیں :

اول : دینی علوم، دوم بمعاون علوم، سوم : عام علوم

دینی علوم میں قرآن اور حدیث بنیادی علوم ہیں۔ بعض لوگ فقہ، کلام اور تصوف کو بھی ان میں شامل سمجھتے ہیں مگر بعض کی رائے میں یہ علوم معاون ہیں، اصل نہیں۔ نواب صدیق حسن خان نے ابجد العلوم میں یہی رائے ظاہر کی ہے۔

عُلومِ معاوِن، وہ علوم ہیں جن کی مدد سے دینی علوم خصوصاً قرآن و حدیث کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ان کی تین شاخیں ہیں۔ ان کی ایک شاخ عربی زبان اور ادب کا علم ہے۔ ان کا مقصد جاحظ کی رائے میں عربی زبان و ادب کی صحیح استعداد پیدا کرنا ہے۔ ان میں اہم صرف و نحو، علمِ اِشتقاق، علمِ لغت ہیں جنھیں بعد میں تقویت ملی جن کی تدوین میں مسلمانوں نے گذشتہ اقوام کے عُلوم سے بھی استفادہ کیا۔ اس کے علاوہ مسلمانوں نے جمالیاتی فنون کو بھی اپنے خاص ذوق اور مشرب کے مطابق ترقی دی۔ ان میں فنِ تعمیر، علمِ بیان، معانی و بلاغت، تخلیقی انشا کے عمدہ نمونے اور تدریج کی کتابیں بھی علمِ ادب کے دائرے میں شامل ہو کر عُلومِ معاوِن میں شامل ہو گئیں۔

علوم معاون کی دوسری شاخ تفسیر، اصولِ تفسیر اصولِ حدیث، فقہ، اصولِ فقہ، علمِ کلام اور تصوف کا نظری علم ہے۔

علومِ معاون کی تیسری شاخ الٰہیات ہے۔ یہ علوم اس وقت ترقی پذیر ہوئے جب بنو عباس کے زمانے میں دین کو یونانی علوم کی روشنی میں دیکھنے کا رواج ہوا۔

ان بنیادی علوم کے علاوہ مسلمانوں کے مشاہداتی اور تجرباتی علوم بھی ہیں جن کی تحریک دین کے ماحول سے پیدا ہوئی۔ ان میں ایک سرچشمہ تحریک رسول پاکؐ کی ذات ہے اور دوسرا سرچشمہ قرآنِ مجید کی تعلیمات ہیں۔ عشقِ رسولؐ کے جذبے سے پہلے حدیث، پھر سیرت ـــ اور اسی کے زیرِ اثر تاریخ نگاری، سوانح نگاری اور تذکرہ نگاری کی ایک لامثال تحریک نمودار ہوئی جس میں انسانی شخصیت کا وہ اعتراف ہوا جو بعد میں یورپ کی انسانیاتی تحریک کی صورت میں سامنے آیا۔ پھر قرآنِ مجید نے مشاہدۂ کائنات اور تسخیر کائنات پر جو زور دیا اس سے تاریخ، جغرافیہ، بحریات، طب، علم الادویہ، ریاضی، ہندسہ، فلاحت، ہیئت، نجوم جیسے علوم کو تقویت ملی جن کی تدوین میں مسلمانوں نے گزشتہ اقوام کے علوم سے بھی استفادہ کیا۔ اس کے علاوہ مسلمانوں نے جمالیاتی فنون کو بھی اپنے خاص ذوق اور مشرب کے مطابق ترقی دی ـــ ان میں فنِ تعمیر، نقاشی، خطاطی اور ان کے بعد موسیقی اور مصوّری اور کتبہ نویسی اور فنِ سکہ نگاری کو بھی ترقی ہوئی۔

یہ سب علوم عربی اور فارسی میں موجود ہیں اور انگریزوں کے آنے سے پہلے مدارس ومکاتب میں جو نصاب رائج تھے، ان کا مقصد انہی علوم کا احاطہ عبور تھا۔ مسلمانوں کے علوم کی قدروقیمت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ یورپ میں احیائے علمی کی تحریک انہی کے زیرِ اثر بیدار ہوئی۔ عرصۂ دراز تک مسلمانوں کے علوم یورپ کی یونیورسٹیوں میں پڑھائے جاتے رہے، جن کی علمی اہمیت کا پُرزور اعتراف مستشرقین نے اپنی کتابوں میں کیا ہے۔

انیسویں صدی میں انگریزی حکومت کے زیرِ اثر پرانی تعلیم کم رواج ہو گئی اور عُلومِ اسلامی کی افادیت کا سوال موضوعِ بحث بن گیا اور اس مسئلے پر طویل مباحثے

ہوئے جن کا نتیجہ ماسوا اس کے کچھ نہ نکلا کہ علوم بے رواج ہوتے چلے گئے۔ افسوس ہے کہ اس زمانے کے پیچیدہ ماحول میں ان کے متعلق جو بحث بھی ہوئی، اس میں وقتی ہیجان اور ہنگامی نفسیاتی فضا کا اثر غالب نظر آتا ہے۔ ہماری تعلیم مستقلاً "دو کیمپوں میں تقسیم ہو گئی۔ ہماری تعلیمی روایت کا تسلسل ٹوٹ گیا ـــــ اور دونوں طرف غلط تفاخر و پندار اور بے جا طرف داری و تعصب کی فضا ابھر آئی۔ چنانچہ پرانے درس کے معتقد اپنے نصاب کے زائد المیعاد اجزا سے بھی یوں چمٹے رہے گویا ان کے نصاب کا ایک ایک لفظ وحی والہام کی سی تقدیس رکھتا ہے ـــــ اور دوسری طرف نئی تعلیم کے حامل تعلیم قدیم کے ہر پہلو کو حقیر، گھٹیا اور زائد المیعاد سمجھ کر اس سے بالکل قطع تعلق کر بیٹھے ـــــ اور انصاف یہ ہے کہ اس دَور کشاکش میں اگر چند بوریا نشین مقہوری اور ذلت کے احساس کے باوجود ان کی حفاظت پر قائم نہ رہتے تو اسلامی علوم اب تک بالکل ناپید ہو چکے ہوتے۔ بہرحال علوم کی یہ امانت اب پاکستان کو ملی ہے ـــــ اور پاکستان میں تہذیبی و فکری احیاء کے مقصد کے پیشِ نظر آج ہمارے سامنے سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ اس علمی سرمائے کے سلسلے میں ہمیں کرنا کیا ہے؟ اس کی ہمیں کیا ضرورت ہے اور کتنے حصے کی ضرورت ہے۔۔؟

میں ان سب سوالوں کا جواب پاکستان کے مخصوص عقائد کے نقطہ نظر سے بھی دوں گا اور عام علمی نقطہ نظر سے بھی ـــــ سب سے پہلے، ان علوم کے تحفظ و ترقی کی ضرورت اس لیے ہے کہ دین کے تمام سرچشمے انہی علوم میں ہیں۔ قرآن اور حدیث ہمارے دینی تصورات کا منبع ہیں ـــــ اور فقہ و کلام میں ہمارے دینی اور شرعی فکر سے متعلق ایسا مواد ملتا ہے جو پاکستان میں احیائے جدید کے سلسلے میں بغایت مفید امدادی کام انجام دے سکتا ہے۔ پاکستان میں دین ہی قومی زندگی کی مسلمہ اساس ہے ـــــ اور یہ صرف "مجبوری کا نام صبر" نہیں بلکہ اس کی بنیاد ہمارے اس ایمان و یقین پر ہے کہ دین اسلام اپنی نہایت کے اعتبار سے انسانیت کے مستقبل کے لیے ناگریز ذریعہ تکمیل و وسیلۂ نجات ہے اور یہی وہ نظریہ زندگی ہے جو اس سائنسی دَور میں دنیا کو ایک مکمل نظامِ عقائد اور ایک مکمل نظامِ عمل دے سکتا ہے۔ یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ اس نئے تجربے کو عملی صورت دینے کے لیے قدرت نے ہمیں منتخب کیا ہے۔ پاکستان

فکری لحاظ سے دَور جدید کا شاید سب سے بڑا مہم آفرین تجربہ ہے۔

اس گذارش سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ دین کا مطالعہ پاکستان کی ملّی بنیادوں کے استحکام کی پہلی شرط ہے۔ اور قرآن، حدیث، فقہ اور متعلقہ امدادی علوم کی تحصیل و تدریس اور ان میں محققانہ بالغ نظری کی شان پیدا کرنا اور اس کے لیے مناسب انتظام کرنا ہمارے مقدس فرائض میں شامل ہے۔

علوم قدیم کی ضرورت ایک اور وجہ سے بھی ہے — یہ معلوم ہے کہ مسلمانوں کے علوم کی ابھی تک کوئی مکمل تاریخ نہیں لکھی گئی۔ اور مغربی مستشرقین نے جو قابلِ قدر کام کیا ہے، اس کے لیے ہم ان کے شکر گزار تو ہیں مگر ان کی تصانیف اور تاریخوں کو کامل اور مکمل نہیں سمجھا جا سکتا۔ اسلامی علوم کی جامع تاریخ لکھنا دراصل مسلمان اقوام کا فرض ہے مگر یہ کام ماہرین کے بغیر ممکن نہیں — ایسے ماہرین اب تقریباً ناپید ہیں، — اور لازمی ہے کہ پرانے علوم کی سب شاخوں کی تدریس و تحصیل کا کسی ادارے یا اداروں میں مکمل انتظام ہو تاکہ ان علوم کے ماہرین کی ایک جماعت (خواہ وہ محدود ہی کیوں نہ ہو) ہمیشہ ہم میں موجود رہے اور ہماری علمی روایت کو زندہ رکھے۔

علوم عربی کا مطالعہ عام علمی نقطہ نظر سے بھی لازمی معلوم ہوتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ مشاہداتُ و تجربات کی دنیا اگرچہ بہت ترقی کر چکی ہے مگر انسانی جستجو ابھی ختم نہیں ہوئی۔ علم کی دنیا میں ہر روز نئے نئے انکشافات ہوتے رہتے ہیں اور ان کو دیکھ کر یہ بات محسوس ہوتی ہے کہ بعض حقائق جن کو دنیا جدید ترین علمی تجلّی کا درجہ دے رہی ہے، ان کے متعلق مسلمان علما اپنے خاص انداز میں مدتوں پہلے اشارہ و بحث کر چکے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں کہ اگر مسلمانوں کے علوم کا غائر اور محققانہ مطالعہ ہوتا رہے تو اغلب ہے کہ ان علوم کی مدد سے وہ گم گشتہ حکمت آسانی سے انسانوں کے قبضے میں آجائے جو مسلمان علما کی تصانیف میں پردۂ گمنامی میں مستور ہے۔ اس سے یہ فائدہ ہو گا کہ نئے مغربی علما تحصیل حاصل میں وقت صرف کرنے کی بجائے دریافت کی اگلی منزلوں کی طرف متوجہ ہو سکیں گے۔ قصہ مختصر یہ کہ علوم قدیم یا بالفاظ صحیح علوم پاکستان کے تہذیبی عقائد اور عام علمی افادے کے نقطہ نظر سے ایک ایسا قیمتی

اور پر منفعت ورثہ ہے جس سے ہمیں بلکہ تمام اقوامِ عالم کو بہت کچھ حاصل ہو سکتا ہے۔

(تعلیمی خطبات)

سوالات

۱۔ علومِ معاون سے کیا مراد ہے اور ان کے حصول کا مقصد کیا ہے؟

۲۔ علومِ معاون کی کتنی اقسام ہیں؟ ہر ایک کی مختصر وضاحت کیجیے۔

۳۔ مسلمانوں کے مشاہداتی اور تجرباتی علوم کا سرچشمہ کیا ہے؟ ماضی کے مسلمانوں نے ان سرچشموں سے کس حد تک فیض اٹھایا؟

۴۔ آج کے دور میں مسلمانوں کے قدیم علوم کی کیا افادیت ہے؟

۵۔ اس مضمون کا خلاصہ اپنے لفظوں میں تحریر کیجیے۔

۶۔ سیاق و سباق کے حوالے سے مندرجہ ذیل اقتباسات کی تشریح کیجیے۔

(الف) علم کی عام تحصیل ------- ادا کر رہی ہیں۔

(ب) ان بنیادی علوم ------- فنِ سکہ نگاری کو بھی ترقی ہوئی۔

(ج) قرآن اور حدیث ------- مہم آفرین تجربہ ہے۔

(د) علومِ عربی کا مطالعہ ------- متوجہ ہو سکیں گے۔

○☆○☆○☆○☆○☆○

غلام عباس

(۱۹۰۹ء - ۱۹۸۲ء)

بہروپیا

یہ اس زمانے کی بات ہے جب میری عمر بس کوئی تیرہ چودہ برس کی تھی۔ ہم جس محلے میں رہتے تھے وہ شہر کے ایک بارونق بازار کے پچھواڑے واقع تھا۔ اس جگہ زیادہ تر درمیانے طبقے کے لوگ یا غریب غربا ہی آباد تھے۔ البتہ ایک پرانی حویلی وہاں ایسی تھی جس میں اگلے وقتوں کی نشانی کوئی صاحبزادہ صاحب رہا کرتے تھے۔ ان کے ٹھاٹ تو کچھ ایسے امیرانہ نہ تھے مگر اپنے نام کے ساتھ "رئیسِ اعظم" لکھنا شاید وہ اپنا فرض منصبی سمجھتے تھے۔ ادھیڑ عمر بھاری بھرکم آدمی تھے۔ گھر سے باہر ذرا کم ہی قدم نکالتے، ہاں ہر روز تیسرے پہر حویلی کے احاطے میں اپنے احباب کے جھرمٹ میں بیٹھ کر گپیں اڑانا اور زور زور سے قہقہے لگانا ان کا دل پسند مشغلہ تھا۔

ان کے نام کی وجہ سے اکثر حاجت مند، یتیم خانوں کے ایجنٹ اور طرح طرح کے چندہ اگاہنے والے ان کے دروازے پر سوالی بن کر آیا کرتے۔ علاوہ ازیں جادو کے پروفیسر، رمال، نجومی، نقال، بھاٹ اور اسی قماش کے دوسرے لوگ بھی اپنا ہنر دکھانے اور انعام اکرام پانے کی توقع میں آئے دن ان کی حویلی میں حاضری دیا کرتے۔

جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں، ایک بہروپیا بھی طرح طرح کے روپ بھر کر ان کی حویلی میں آیا کرتا۔ کبھی خاکی کوٹ پتلون پہنے، چمڑے کا تھیلا گلے میں ڈالے، چھوٹے چھوٹے شیشوں اور نرم کمانیوں والی عینک آنکھوں پر لگائے چٹھی رساں بنا، ہر ایک سے بیرنگ خط کے دام وصول کر رہا ہے۔ کبھی جٹا دھاری سادھو ہے۔ لنگوٹ کسا ہوا، جسم پر بھبوت رمائی ہوئی، ہاتھ میں لمبا سا چمٹا، سرخ سرخ آنکھیں نکال نکال "بم مہا دیو!

کا نعرہ[1] لگا رہا ہے۔ کبھی بھنگن کے روپ میں ہے جو سرخ لہنگا پہنے، کمر پر ٹوکرا، ہاتھ میں جھاڑو لیے، جھوٹ موٹ پڑوسنوں سے لڑتی بھڑتی آپ ہی آپ بکتی جھکتی چلی آ رہی ہے۔

میرے ہم سبقوں میں ایک لڑکا تھا مدن۔ عمر میں تو وہ مجھ سے ایک آدھ برس چھوٹا ہی تھا مگر قد مجھ سے نکلتا ہوا تھا۔ خوش شکل بھولا بھالا، مگر ساتھ ہی بچوں کی طرح بلا کا ضدی۔ ہم دونوں غریب ماں باپ کے بیٹے تھے۔ دونوں میں گہری دوستی تھی۔ اسکول کے بعد کبھی وہ میرے محلے میں کھیلنے آ جاتا، کبھی میں اس کے ہاں چلا جاتا۔

ایک دن سہ پہر کو میں اور مدن صاجزادہ صاحب کی حویلی کے باہر سڑک پر گیند سے کھیل رہے تھے کہ ہمیں ایک عجیب سی وضع کا بوڑھا آدمی آتا دکھائی دیا۔ اس نے مہاجنوں کے انداز میں دھوتی باندھ رکھی تھی، ماتھے پر سیندور کا ٹیکا تھا۔ کانوں میں سنہری بالے، بغل میں ایک لمبی سی سرخ بہی داب رکھی تھی۔ یہ شخص حویلی کے پھاٹک پر پہنچ کر پل بھر کو رکا، پھر اندر داخل ہو گیا۔

میں فوراً جان گیا۔ یہ حضرت سوائے بہروپیے کے اور کون ہو سکتے تھے۔ مگر مدن ذرا ٹھٹکا۔ اس نے بہروپیے کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں نے ذرا چھیڑنے کو پوچھا: "مدن جانتے ہو ابھی اس حویلی میں کون گیا ہے؟"

"ہاں کیوں نہیں۔"

"بھلا بتاؤ تو؟"

"کوئی مہاجن تھا۔"

"یہاں کیوں آیا؟"

"میں کیا جانوں۔ تمہارے اس رئیسِ اعظم نے کچھ قرض ورض لیا ہو گا اس سے ـــــ"

"ارے نہیں پگلے، یہ تو بہروپیا ہے، بہروپیا!"

---

[1] ہندوؤں کا نعرہ۔ مہادیو کی جے، مہادیو کا بول بالا ہو، مہادیو ہماری مدد کرو وغیرہ۔

"بہروپیا؟" مدن نے کچھ حیرانی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "بہروپیا کیا ہوتا ہے؟"

"ارے تم نہیں جانتے۔ یہ لوگ طرح طرح کے روپ بھر کر امیر امرا کو اپنا کمال دکھاتے ہیں اور ان سے انعام لیتے ہیں۔"

"تو کیا یہ شخص ہر روز آتا ہے؟"

"نہیں، ہفتے میں بس ایک دو بار۔ روز روز آئے تو لوگ پہچان جائیں بہروپیوں کا کمال تو بس اسی میں ہے کہ ایسا سوانگ رچائیں کہ لوگ دھوکا کھا جائیں اور سچ سمجھنے لگیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ کسی شہر میں دو تین مہینے سے زیادہ نہیں ٹکتے۔

"کیا ان کو ہر دفعہ انعام ملتا ہے؟"

"نہیں تو۔ یہ جب پندرہ بیس مرتبہ روپ بھر چکتے ہیں تو آخری بار سلام کرنے آتے ہیں۔ بس یہی وقت انعام لینے کا ہوتا ہے۔"

"بھلا کتنا انعام ملتا ہوگا انھیں؟"

"کچھ زیادہ نہیں۔ کہیں سے ایک روپیہ، کہیں سے دو روپے اور کہیں کچھ بھی نہیں۔ یہ رئیسِ اعظم اگر پانچ روپے بھی دے دیں تو بہت غنیمت جانو۔ بات یہ ہے کہ آج کل اس فن کی کچھ قدر نہیں رہی۔ اگلے وقتوں کے امیر لوگ تو اس قسم کے پیشے والوں کو اتنا اتنا انعام دے دیا کرتے تھے کہ انھیں مہینوں روزی کی فکر نہ رہتی تھی۔ مگر آجکل تو یہ بیچارے بھوکوں مر رہے ہوں گے اور ——"

میں کچھ اور کہنے کو ہی تھا کہ وہی بہروپیا مہاجن بنا ہوا حویلی کے پھاٹک سے نکلا۔ مدن جو کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر چونک پڑا۔ بہروپیا ہماری طرف دیکھ کر مسکرایا اور پھر بازار کی طرف چل دیا۔

بہروپیے کا پیٹھ موڑنا تھا کہ مدن نے اچانک میرا ہاتھ زور سے تھام لیا اور دھیمی آواز میں کہنے لگا:

"سلیم آؤ اس بہروپیے کا پیچھا کریں اور دیکھیں کہ وہ کہاں رہتا ہے۔ اس کا گھر کیسا ہے۔ اس کا کوئی نہ کوئی میک اپ روم تو ہوگا ہی۔ شاید اس تک ہماری رسائی

ہو جائے۔ پھر میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ اپنی اصلی صورت میں کیسا لگتا ہے۔"

"مدن دیوانے نہ بنو" میں نے کہا "نجانے اس کا ٹھکانا کدھر ہے۔ ہم کہاں مارے مارے پھریں گے۔ نجانے ابھی اس کو اور کن کن گھروں میں جانا ہے۔"

مگر مدن نے ایک نہ سنی۔ وہ مجھے کھینچتا ہوا لے چلا۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اس کے مزاج میں طفلانہ ضد تھی۔ ایسے لوگوں کے سر پر جب کوئی دھن سوار ہو جائے تو جب تک اسے پورا نہ کر لیں نہ خود چین سے بیٹھتے ہیں نہ دوسروں کو چین لینے دیتے ہیں۔ ناچار میں اس کی دوستی کی خاطر اس کے ساتھ ہو لیا۔

یہ گرمیوں کی ایک شام تھی۔ کوئی چھ کا عمل ہو گا۔ اندھیرا ہونے میں ابھی کم سے کم ڈیڑھ گھنٹا باقی تھا۔ میں دل ہی دل میں حساب لگانے لگا۔ ہمارا علاقہ شہر کے وسط میں ہے۔ یہاں پہنچتے پہنچتے اگر بہروپیے نے آدھے شہر کا احاطہ بھی کر لیا تو بھی آدھا شہر باقی ہے، جہاں اسے اپنے فن کی نمائش کے لیے جانا ضروری ہے۔ چنانچہ اگر زیادہ نہیں تو دو گھنٹے تو ضرور ہی ہمیں اس کے پیچھے پیچھے چلنا پڑے گا۔

وہ تیز قدم اٹھاتا ہوا ایک سے دوسرے بازار میں گزرتا جا رہا تھا۔ راستے میں جب کوئی بڑی حویلی یا کسی مکان کا دیوان خانہ نظر آتا تو وہ بلا تکلف اندر داخل ہو جاتا اور ہمیں دو تین منٹ باہر اس کا انتظار کرنا پڑتا۔ بعض بڑی بڑی دکانوں میں بھی اس نے حاضری دی مگر وہاں وہ ایک آدھ منٹ سے زیادہ نہیں رکا۔

شفق کی کچھ کچھ سرخی ابھی آسمان پر باقی تھی کہ ان حاضریوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ کیونکہ بہروپیا اب شہر کے دروازے سے باہر نکل آیا تھا اور فصیل کے ساتھ ساتھ چلنے لگا تھا۔

ہم نے اب تک بڑی کامیابی سے اپنے کو اس کی نظروں سے اوجھل رکھا تھا۔ اس میں بازاروں کی ریل پیل سے ہمیں بڑی مدد ملی تھی۔ مگر اب ہم ایک غیر آباد علاقے میں تھے جہاں اکا دکا آدمی ہی چل پھر رہے تھے۔ چنانچہ ہمیں قدم قدم پر دھڑکا تھا کہ کہیں اچانک وہ گردن پھیر کر ہمیں دیکھ نہ لے۔ بہرحال ہم انتہائی احتیاط کے ساتھ

اور اس سے خاصی دُور رہ رہ کر اس کا تعاقُب کرتے رہے۔

ہمیں زیادہ چلنا نہ پڑا۔ جلد ہی ہم ایک ایسے علاقے میں پہنچ گئے جہاں فصیل کے ساتھ ساتھ خانہ بدوشوں اور غریب غربا نے پھونس کے جھونپڑے ڈال رکھے تھے۔ اس وقت ان میں سے کئی جھونپڑوں میں چراغ جل رہے تھے۔ بہروپیا ان جھونپڑوں کے سامنے سے گزرتا ہوا آخری جھونپڑے کے پاس پہنچا جو ذرا الگ تھلگ تھا۔ اس کے دروازے پر ٹاٹ کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ جھونپڑے کے باہر ایک ننھی سی لڑکی جس کی عمر کوئی تین برس ہو گی اور ایک پانچ برس کا لڑکا زمین پر بیٹھے کنکریوں سے کھیل رہے تھے۔ جیسے ہی انھوں نے بہروپیے کو دیکھا وہ خوشی سے چلّانے لگے "ابا جی آگئے! ابا جی آگئے" اور وہ اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئے۔ بہروپیے نے ان کے سروں پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔ پھر وہ ٹاٹ کا پردہ سرکا کر بچوں سمیت جھونپڑے میں داخل ہو گیا۔ میں نے مدن کی طرف دیکھا۔

"کہو اب کیا کہتے ہو"؟

"ذرا رکے رہو۔ وہ ابھی مہاجن کا لباس اتار کر اپنے اصلی روپ میں باہر نکلے گا۔ اتنی گرمی میں اس سے جھونپڑے میں کہاں بیٹھا جائے گا"۔

ہم نے کوئی پندرہ بیس منٹ انتظار کیا ہو گا کہ ٹاٹ کا پردہ پھر سرکا اور ایک نوجوان آدمی ململ کی دھوتی کرتا پہنے، پٹیاں سر پر جمائے دوپلی ٹوپی ایک خاص انداز سے ٹیڑھی رکھے، جھونپڑے سے باہر نکلا۔ بوڑھے مہاجن کی سفید مونچھیں غائب تھیں اور ان کے بجائے چھوٹی چھوٹی سیاہ مونچھیں اس کے چہرے پر زیب دے رہی تھیں۔

"یہ وہی ہے" مدن چلّا اٹھا۔ "وہی قد وہی ڈیل ڈول"

اور جب ہم اس کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے تو اس کی چال بھی ویسی ہی تھی جیسی مہاجن کا پیچھا کرنے میں ہم نے مشاہدہ کی تھی۔ میں اور مدن حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ اب کے اس نے یہ کیسا روپ بھرا؟ اس وقت وہ کن لوگوں کو اپنے بہروپ کا کمال دکھانے جا رہا ہے۔

وہ شخص کچھ دیر فصیل کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ پھر ایک گلی میں ہوتا ہوا دوبارہ شہر کے اندر پہنچ گیا۔ ہم بدستور اس کے پیچھے لگے رہے۔ وہ بازار میں چلتے چلتے ایک پنواڑی کی دکان پر رک گیا۔ ہم سمجھے کہ شاید پان کھانے رکا ہے مگر نہ تو اس نے جیب سے پیسے نکالے اور نہ پنواڑی نے اسے پان ہی بنا کر دیا۔ البتہ ان دونوں میں کچھ بات چیت ہوئی جسے ہم نہیں سن سکے۔ پھر ہم نے دیکھا کہ پنواڑی دکان سے اتر آیا اور بہروپیا اس کی جگہ گدی پر بیٹھ گیا۔

پنواڑی کے جانے کے بعد اس دکان پر کئی گاہک آئے۔ جن کو اس نے سگریٹ کی ڈبیاں اور پان بنا بنا کر دیے۔ وہ پان بڑی چابکدستی سے بناتا تھا جیسے یہ بھی کوئی فن ہو۔ ہم کوئی آدھے گھنٹے تک بازار کے نکڑ پر کھڑے یہ تماشا دیکھتے رہے۔ اس کے بعد ایک دم ہمیں سخت بھوک لگنے لگی اور ہم وہاں سے اپنے اپنے گھروں کو چلے آئے۔

اگلے روز اتوار کی چھٹی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ صبح آٹھ نو بجے تک سو کر کل کی تکان اتاروں گا۔ مگر ابھی نور کا تڑکا ہی تھا کہ کسی نے میرا نام لے لے کر پکارنا اور دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ نیچے گلی میں جھانک کر دیکھا تو مدن تھا۔ میں پیچ و تاب کھاتا سیڑھیوں سے اترا۔

"اسلم جلدی سے تیار ہو جاؤ۔" اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا:

"کیوں کیا بات ہے؟"

"جلدی کرو کہیں بہروپیا صبح ہی صبح گھر سے نہ چل دے۔"

"بھئی تم بھی کمال کرتے ہو۔ اب اس کا خیال چھوڑ دو مدن۔ پھر رات تم نے اسے دیکھ بھی تو لیا تھا۔"

"واہ میں نے بہروپیے کو تھوڑا ہی دیکھا تھا' وہ تو پنواڑی تھا۔"

اور اس نے مجھے ایسی التجا بھری نظروں سے دیکھا کہ میرا دل فوراً پسیج گیا۔ جب ہم کبھی دوڑتے کبھی تیز تیز قدم اٹھاتے فصیل کی طرف جا رہے تھے تو مدن نے مجھے بتایا کہ

رات بھر وہ بہروپیے کو خواب میں طرح طرح کے روپ میں دیکھتا رہا۔ پھر صبح کو چار بجے کے قریب آپ ہی آپ اس کی آنکھ کھل گئی اور اس کے بعد پھر اسے نیند نہ آ سکی۔

ابھی سورج نکلنے نہیں پایا تھا کہ ہم بہروپیے کے جھونپڑے کے پاس پہنچ گئے۔ پچھلی رات ہم اندھیرے میں اس علاقے کا صحیح جائزہ نہ لے سکے تھے۔ مگر اب دن کی روشنی میں ان جھونپڑوں کے مکینوں کی غربت اور خستہ حالی کا بخوبی اندازہ ہو گیا۔ بہروپیے کے جھونپڑے پر ٹاٹ کا جو پردہ پڑا ہوا تھا' اس میں کئی پیوند لگے تھے۔

ہم دو تین بار اس کے جھونپڑے کے سامنے سے گزرے۔ ہر بار ہمیں اندر سے بچوں کی آوازیں' دو ایک نسوانی آوازوں کے ساتھ ملی ہوئی سنائی دیں۔ اخر کوئی دس منٹ بعد ایک شخص بوسیدہ سا تہمد باندھے' بنیان پہنے' ایک ہاتھ میں گڑوی تھامے جھونپڑی سے بر آمد ہوا۔ اس کی ڈاڑھی مونچھ صاف تھی' سانولا رنگ۔ اس کو دیکھ کر اس کی عمر کا صحیح اندازہ کرنا مشکل تھا۔ وہ شخص آگے آگے اور ہم پیچھے پیچھے کچھ دور فصیل کے ساتھ ساتھ چلے۔ آگے ایک باڑا آیا جس میں کچھ گائیں بھینسیں کھونٹوں سے بندھی ہوئی تھیں۔ وہ شخص اس باڑے کے اندر چلا گیا اور میں اور مدن باہر ہی اس کی نظروں سے اوجھل ایک طرف کھڑے ہو گئے' جہاں سے اس کی حرکات و سکنات کو ہم بخوبی دیکھ سکتے تھے۔ اس نے ایک بھینس کو پچکارا' پھر وہ زمین پر بیٹھ کر اس کے تھنوں کو سہلانے لگا۔ اس کو دیکھ کر ایک بڈھا جو بھینسوں کے پاس ایک چارپائی پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا' اٹھا اور ایک بڑی سی بالٹی لے آیا۔ اب اس شخص نے بھینس کو دوہنا شروع کر دیا۔ ہم اگرچہ اس سے کچھ دور کھڑے تھے مگر دودھ کی دھاروں کی آواز دھیمی دھیمی سن سکتے تھے۔

جب وہ ایک بھینس کو دوہ چکا تو دوسری کی طرف گیا' پھر تیسری کی طرف۔ اس کے بعد گایوں کی باری آئی اور اس نے دو تین گایوں کو بھی دوہا' جن کے دودھ کے لیے بڈھے نے ایک اور بالٹی لا کر رکھ دی تھی۔ اس کام میں کوئی ایک گھنٹا صرف ہوا۔ بڈھے نے اس کی گڑوی کو دودھ سے بھر دیا' جسے لے کر وہ باڑے سے نکل آیا۔ ہم پہلے ہی وہاں سے کھسک لیے۔ جب وہ ذرا دور چلا گیا تو میں نے مدن کو چھیڑنے کے

لیے کہا:

"لو اب تو حقیقت کھل گئی تم پر۔ چلو اب گھر چلیں۔ ناحق تم نے میری نیند برباد کی۔"

"مگر بھیا وہ بہروپیا کہاں تھا' وہ تو گوالا تھا گوالا۔ آؤ تھوڑی دیر اور اس کا پیچھا کریں

میں نے مدن سے زیادہ حیل وحجت کرنا مناسب نہ سمجھا۔ ہم کچھ دیر ادھر ادھر ٹہلتے رہے۔ ہم نے اس کا ٹھکانا تو دیکھ ہی لیا تھا' اب وہ ہماری نگاہوں سے کہاں چھپ سکتا تھا۔ جب ہمیں اس کے جھونپڑے کے پاس گھومتے آدھ گھنٹا ہو گیا تو ہمیں ایک تانگہ فصیل کے ساتھ والی سڑک پر تیزی سے ادھر آتا ہوا دکھائی دیا۔ یہ تانگہ بہروپیے کے جھونپڑے کے پاس پہنچ کر رک گیا۔ اس میں کوئی سواری نہ تھی۔ جو شخص تانگا چلا رہا تھا اس نے تانگے کی گھنٹی پاؤں سے دبا کر بجائی۔ اس کی آواز سنتے ہی ایک آدمی جھونپڑے سے نکلا جس نے کوچوان کا سا خاکی لباس پہن رکھا تھا۔ اس کو دیکھ کر تانگے والا تانگے سے اتر پڑا اور یہ شخص تانگے میں آبیٹھا اور راسیں تھام گھوڑے کو بڑی مہارت سے ہانکنے لگا۔ جیسے ہی تانگا چلا پہلے شخص نے پکار کر کہا:

"تانگا ٹھیک دو بجے اڈے پر لے آنا"

دوسرے شخص نے گردن ہلائی۔ اس کے بعد ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہ تانگا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

میں اور مدن یہ ماجرا دیکھ کر ایسے حیران رہ گئے کہ کچھ دیر تک ہماری زبان سے ایک لفظ تک نہ نکلا۔ آخر مدن نے سکوت توڑا:

"چلو یہ تو معلوم ہو ہی گیا کہ یہ شخص دو بجے تک کیا کرے گا۔ اتنی دیر تک ہمیں چھٹی ہو گئی۔ اب ہمیں ڈھائی تین بجے تک یہاں پہنچ جانا چاہیے۔"

میں نے کچھ جواب نہ دیا۔ سچ یہ ہے کہ اس بہروپیے کے معاملے سے اب خود مجھے بھی بہت دلچسپی پیدا ہو گئی تھی اور میں اس کی اصلیت جاننے کے لیے اتنا ہی

بے تاب ہو گیا تھا جتنا کہ مدن۔

ہم لوگ کھانے پینے سے فارغ ہو کر تین بجے سے پہلے ہی پھر بہروپیے کے جھونپڑے کے آس پاس گھومنے لگے۔ جھونپڑے کے اندر سے بچوں اور عورتوں کی آوازوں کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی کسی مرد کی آوز بھی سنائی دے جاتی تھی۔ اس سے ہم نے اندازہ کر لیا کہ بہروپیا گھر واپس پہنچ گیا ہے۔

ہمیں زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا اور اب کے بہروپیا ایک اور ہی دھج سے باہر نکلا۔ اس نے لمبا سیاہ چغہ پہن رکھا تھا۔ سر پر کالی پگڑی جو بڑی خوش اسلوبی سے باندھی گئی تھی۔ گلے میں رنگ برنگی تسبیحیں، ترشی ہوئی سیاہ ڈاڑھی، شانوں پر زلفیں بکھری ہوئیں۔ اس نے بغل میں لکڑی کی ایک سیاہ صندوقچی داب رکھی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ آج اس نے ایک صوفی درویش کا سوانگ بھرا ہے۔ مگر ابھی کل ہی تو وہ مہاجن کے روپ میں شہر کا دورہ کر چکا تھا اور کوئی نیا روپ بھرنے کے لیے اسے دو تین دن کا وقفہ درکار تھا، پھر آج کس لیے اس نے یہ وضع بنائی ہے؟ اس سوال کا ہمارے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ چنانچہ ہم چپکے چپکے اس کے پیچھے پیچھے چلتے رہے۔

وہ شخص جلد جلد قدم اٹھاتا ہوا شہر میں داخل ہوا۔ وہ کئی بازاروں میں گزرا مگر وہ خلاف معمول کسی حویلی یا دکان پر نہیں رکا۔ معلوم ہوتا تھا آج اسے اپنے فن کا مظاہرہ کرنے اور داد پانے کا کچھ خیال نہیں۔

تھوڑی دیر میں ہم جامع مسجد کے پاس پہنچ گئے، جو شہر کے بیچوں بیچ واقع تھی اور جس کے آس پاس ہر روز تیسرے پہر بازار لگا کرتا تھا اور اتوار کو تو وہاں بہت ہی چہل پہل رہا کرتی تھی۔ میلہ سا لگ جاتا تھا۔ پھیری والے ہانک لگا لگا کر طرح طرح کی چیزیں بیچتے تھے۔ بچوں کے سلے سلائے کپڑے، چُنریاں، ٹوپیاں، کنگھیاں، چٹلے، ازار بند، عطر، پھلیل، اگربتی، کھٹمل مارنے کا پوڈر، مٹھائیاں، چاٹ علاوہ ازیں تعویز گنڈے والے، جڑی بوٹی والے اور ایسے ہی پیشے والے اپنی انوکھی وضع اور اپنی مخصوص صدا سے اس بازار کی رونق بڑھاتے تھے۔

ہمارا بہروپیا بھی خاموشی سے ان لوگوں میں آ کر شامل ہو گیا۔ اس نے اپنی

سیاہ صندوقچی کھول کر دونوں ہاتھوں میں تھام لی۔ اس صندوقچی میں بہت سی چھوٹی چھوٹی شیشیاں قرینے سے رکھی تھیں۔ اس نے کچھ شیشیاں صندوقچی کے ڈھکنے پر بھی جما دیں۔ پھر بڑے گھمبیر لہجے میں صدا لگانی شروع کر دی :

"آپ کی آنکھوں میں دھند ہو، لالی ہو، خارش ہو، ککرے ہوں، بینائی کمزور ہو، پانی ڈھلکتا ہو، رات کو نظر نہ آتا ہو تو میرا بنایا ہوا خاص سرمہ "نین سکھ" استعمال کیجیے۔ اس کا نسخہ مجھے مکہ شریف میں ایک درویش بزرگ سے دستیاب ہوا تھا۔ خدمت خلق کے خیال سے بہت ہی کم قیمت رکھی گئی ہے۔ یعنی صرف چار آنے فی شیشی۔ یہ سرمہ اسم بامسمی ہے۔ اس کے لگاتے ہی آنکھوں میں ٹھنڈک پڑ جاتی ہے۔ آیئے ایک سلائی لگوا کر آزمائش کر لیجیے۔ اس کے کچھ دام نہیں۔

سرمہ مفت نظر ہوں میری قیمت یہ ہے
کہ رہے چشمِ خریدار پہ احساں میرا

میں اور مدن حیرت زدہ ہو کر بہروپیے کو دیکھنے لگے۔ ہمیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آتا تھا۔ مگر اس نے سچ مچ سرمہ فروشی شروع کر دی تھی۔ دو تین آدمی اس کے پاس آکھڑے ہوئے اور اس سے باری باری آنکھوں میں سرمہ لگوانے لگے۔

ہم جلد ہی وہاں سے رخصت ہو گئے۔ ہم نے بہروپیے کو اس کے اصلی روپ میں دیکھنے کا خیال چھوڑ دیا۔

(کَن رَس)

سوالات

۱۔ مختصر جواب دیجیے۔

(الف) "رئیسِ اعظم" کا دل پسند مشغلہ کیا تھا؟

(ب) حویلی میں انعام اکرام پانے کی توقع میں عموماً کس قسم کے لوگ آیا کرتے تھے؟

(ج) مدن نے جب بہروپیے کو پہلے پہل دیکھا تو کیا خیال کیا؟

(د) کسی بہروپیے کا کمال کس بات میں ہے؟

(ہ) مدن نے بہروپیے کا پیچھا کرنا کیوں چاہا؟

(و) بہروپیا کس جگہ رہتا تھا؟

(ز) بہروپیے نے سرمہ بیچنے والے درویش کا سوانگ بھرا تو وہ کیا صدا لگا رہا تھا؟

(ح) دونوں دوستوں نے بہروپیے کو اصل روپ میں دیکھنے کا خیال کیوں چھوڑ دیا؟

۲۔ دونوں دوستوں نے بہروپیے کو کس کس روپ میں دیکھا اور ان میں سے اس کی اصل شخصیت کا گمان انھیں کب ہوا؟

۳۔ مندرجہ ذیل محاورات کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

گپیں اڑانا، روپ بھرنا، مارے مارے پھرنا، دل پسیجنا، دھن سوار ہونا، ریل پیل ہونا، پیچ و تاب کھانا، ہانک لگانا، سکوت توڑنا۔

۴۔ اس افسانے کا خلاصہ تحریر کیجیے۔

۵۔ مصنفین عام طور پر اپنی نگارشات میں محض دلچسپی بڑھانے اور آسانی کی خاطر واحد متکلم کا صیغہ استعمال کرتے ہیں اور یہ ہرگز ضروری نہیں ہوتا کہ افسانے وغیرہ کے واقعات کا ان کی ذات کے ساتھ کچھ تعلق بھی ہو۔ اس افسانے میں بھی بیشتر یہی صیغہ استعمال ہوا ہے آپ تلاش کر کے ایسے دس جملے لکھیے۔

○☆○☆○☆○☆○☆○

ڈاکٹر سید اسلم

قَلْبْ

"دل کی بیماری اُسّی سال کی عمر سے قبل ہمارا اپنا قصور ہے، نہ یہ مشیت ایزدی ہے اور نہ تقاضائے فطرت۔" (پال وہائٹ)

(مشہور امریکی طبیب قلب)

زمانہ قدیم سے انسانی جسم میں دل کی اہمیت مُسَلَّم ہے، اس لیے ارسطو نے دل کی حرکت کو زندگی سے تعبیر کیا تھا۔

دل جسم کے سب سے زیادہ مضبوط پٹھوں کا مجموعہ ہے۔ جن ریشوں اور رباط سے اس کی ساخت ہوئی ہے وہ دبیز اور آپس میں گتھے ہوئے ہیں اور ایک دوسرے میں پیوست ہو کر ایک جان ہو گئے ہیں۔ اس شیرازہ بندی کی وجہ سے سارے کا سارا دل ایک دفعہ دھڑکتا ہے۔ اگر کسی سبب سے یہ ریشے کمزور ہو جائیں تو پھر دل بھی کمزور ہو جاتا ہے۔ دل ایک زور آور پمپ ہے اور دل کی طاقت پر دوران خون کی قوت اور سرعت کا دارومدار ہے۔ یہ جاننے کے لیے کہ پٹھے کس طرح کے ہوتے ہیں، پنڈلیوں اور بازوؤں کے پٹھوں کو دیکھا جا سکتا ہے۔

دل کا حجم دو بند مٹھیوں سے کم اور ایک مٹھی سے بڑا ہوتا ہے۔ اس کی شکل بیضوی، انڈے کی طرح اور وزن تقریباً ڈھائی سو گرام ہے یعنی ایک اچھے وزن کے آم کے برابر۔ دل سینے کے وسط میں قدرے بائیں طرف واقع ہے۔ اس کے سامنے سینے کی ہڈی، بائیں طرف پسلیاں، دونوں طرف پھیپھڑے، عقب میں ریڑھ کی ہڈی اور نیچے کی طرف اس پردے نے سہارا دے رکھا ہے جو سینے کو پیٹ سے علیحدہ کرتا ہے۔

جو لوگ دبلے اور لمبے ہوتے ہیں، ان کا دل بھی لمبوترا اور مختصر وسعت کا ہوتا ہے اور جو لوگ وسیع الجثّہ ہوتے ہیں، ان کا دل بھی اچھی خاصی ضخامت کا ہوتا ہے۔

دل چار حجروں والا کھوکھلا گھر ہے۔ بیرونی اطراف سے ایک پتلے غلاف میں لپٹا ہوا ہے۔ اندرونی سطح پر نرم' ملائم مخملیں استر چسپاں ہے۔ دل کو ایک پتلے مگر سخت پردے نے درمیان سے دو حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے' ایک داہنا حصہ اور دوسرا بایاں حصہ۔ داہنی طرف وہ گدلا اور نیلا خون ہے جو سارے جسم کا دورہ کر کے آیا ہے اور اب پھیپھڑوں میں جا کر صاف ہو گا۔ بائیں طرف وہ صاف اور لال خون ہے جو پھیپھڑوں سے صاف ہو کر آکسیجن کی آمیزش کے بعد آتا ہے اور اب سارے جسم کا یہاں سے دورہ شروع کرے گا۔ درمیانی پردہ کی وجہ سے یہ دونوں خون ایک دوسرے میں نہیں ملتے۔ دل کے بالائی اور زیریں حجروں کے درمیان صمام نصب ہیں۔ یہ صمام یک طرفہ دروازے ہیں' جن کے راستہ سے خون کی روانی ایک سمت رہتی ہے اور خون واپس نہیں آسکتا' الاّ یہ کہ یہ دروازے ڈھیلے ہو کر خراب ہو جائیں۔ یہ صمام وقفہ وقفہ سے کھلتے اور بند ہوتے رہتے ہیں۔ دل کے بالائی حجرے ذرا پیچھے کی طرف واقع ہیں اور یہ دل کی دہلیز ہیں کہ خون سب سے پہلے جب دل میں داخل ہوتا ہے تو ان میں آتا ہے۔ ان کی دیواریں پتلی ہیں۔ اس کے برعکس دل کے زیریں حجرے ذرا آگے کی طرف واقع ہیں اور ان کی دیواریں دبیز اور مضبوط ہیں کیونکہ یہ خون کو خارج کرتے ہیں۔ اس طرح دل کے چار حجرے :

داہنا بالائی' داہنا زیریں اور بایاں بالائی' بایاں زیریں ہیں۔

دل کے صمام نہایت مضبوط ہوتے ہیں اور ساری عمر کام دیتے ہیں۔ ان کے کھلنے اور بند ہونے کی جو دھک دھک آواز آتی ہے وہ طبیب کو آلہ کی مدد سے "لب ڈب" کی طرح سنائی دیتی ہے۔ لب' پہلی آواز ہے اور ڈب' دوسری آواز۔ اس طرح دل کی عموماً دو آوازیں ہوتی ہیں' گو شاعر بغیر کسی مدد کے بھی یہ آوازیں سننے کا دعویٰ کرتے ہیں :

بے واسطہ، گوش ولب از راہِ دل و چشم
بسیار سخن بود کہ گفتیم و شنیدیم[1]

---

[1] ایسی بہت سی باتیں تھیں جو ہم نے اپنے ہونٹوں اور کانوں کے تعلق کے بغیر' دل اور آنکھوں کے راستے سے کہیں اور سنیں۔

دل ہر طرف سے بند ہے اور اس کا باہر سے کوئی تعلق نہیں سوائے ان رگوں کے جو دل کے داہنے اور بائیں حصوں سے نکلتی اور داخل ہوتی ہیں، جن کے راستے سے گدلا خون دل میں آتا ہے اور صاف خون سارے جسم میں پہنچتا ہے۔ دل کی دو حالتیں ہوتی ہیں: ایک سکڑنے کی اور دوسری ڈھیلا پڑنے کی۔ جب دل سکڑتا ہے تو خون دل سے خارج ہوتا ہے اور یہ حالت دل کے کام کی ہے۔ جب دل ڈھیلا پڑتا ہے تو خون دل میں داخل ہوتا ہے اور یہ حالت دل کے آرام کی ہے۔

سارے جسم کا گدلا اور ناصاف نیلگوں خون دو نیلی شہ رگوں کے راستے داہنے بالائی حجرہ میں داخل ہوتا ہے، پھر داہنے درمیانی صمام سے گذر کر داہنے زیریں حجرہ میں پہنچتا ہے۔ یہاں سے دوسری رگ اس کو پھیپھڑوں میں لے جاتی ہے، جہاں یہ ہوا کے قرب میں آتا ہے، آکسیجن کی آمیزش ہوتی ہے اور کاربن ڈائی اکسائیڈ جو فضلہ ہے، وہ خارج ہوتی ہے اور اب خون کا رنگ لال ہو جاتا ہے۔ پھیپھڑوں سے دوسری چار رگیں خون کو بائیں بالائی حجرہ میں پہنچاتی ہیں، جہاں سے بائیں درمیانی صمام سے گذر کر بائیں زیریں حجرہ میں داخل ہوتا ہے۔ یہاں سے لال شہ رگ کے ذریعے سارے جسم میں خون کی رسد پہنچتی ہے۔ اس لال شہ رگ سے سب سے پہلے جو رگیں خون لے کر نکلتی ہیں وہ دل کی لال کارونری [1] رگیں ہیں۔ یہ دل کو خون سے سیراب کرتی ہیں۔ یہ دلچسپ بات ہے کہ دل سب سے پہلے خون اپنے لیے وصول کر لیتا ہے، یعنی شروع ہی میں حقِ خدمت لے لیتا ہے۔ جس طرح کسی عمارت کا مالک دروازہ پر گذرنے والوں سے زرِ معاوضہ قبول کر لے۔ خون کا ابتداء میں زور اور دباؤ بھی زیادہ ہوتا ہے۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ دل کے دونوں بالائی حجروں میں خون ایک وقت میں داخل ہوتا ہے اور جب یہ حجرے خون سے لبریز ہو جاتے ہیں تو دونوں درمیانی صمام کھل جاتے ہیں اور خون زیریں حجروں میں پہنچ جاتا ہے۔ جب یہ بھی لبریز ہو جاتے ہیں تو ان زیریں حجروں کی طاقتور دیواریں زور سے سکڑتی ہیں، درمیانی صمام بند ہو جاتے ہیں اور دل سے نکلنے والی رگوں میں خون کا اخراج ہونے لگتا ہے، جن کے صمام اب

---

[1] Coronary

کھل گئے ہیں۔

جب خون لال رگ کے آخری سرے پر پہنچتا ہے تو یہاں یہ باریک مہین نسوں میں داخل ہوتا ہے۔ یہ نسیں انتہائی پتلی ہوتی ہیں اور ان کی دیواریں باریک۔ یہ نسیں ہمارے جسم کی بافتوں کے چھوٹے خانوں (خلیوں) میں داخل ہوتی ہیں اور وہاں رزق و آکسیجن پہنچاکر فضلہ اور کاربن ڈائی آکسائیڈ لے کر واپس آجاتی ہیں۔ ان کے پتلے ہونے کی وجہ سے تبادلہ بہ آسانی ہو جاتا ہے اور پھر سب آپس میں مل کر چھوٹی نیلی رگیں بناتی ہیں جو بالآخر بڑی نیلی رگیں ہو کر دل کے داہنے حصہ میں خون پہنچاتی ہیں۔ اس طرح یہ دورانِ خون جاری رہتا ہے جو کہ ایک ختم نہ ہونے والا سلسلہ ہے' جس میں خون مستقل طواف کی حالت میں رہتا ہے۔

اس طرح دل دو دریاؤں کا سنگم ہے۔ ایک دریا نیلا ہے جو غلیظ خون لے کر داہنے دل میں آتا ہے اور صفائی کے لیے پھیپھڑوں میں بھیج دیا جاتا ہے۔ دوسرا دریا صاف اور لال ہے جو پھیپھڑوں سے صاف ہو کر آتا ہے اور بائیں دل سے گزر کر سارے جسم کو سیراب کرتا ہے اور اس طرح غذا پہنچاتا ہے۔ اس طرح یہ دونوں دریا آغوش در آغوش چلتے ہیں اور بالآخر لال دریا اپنے اختتام کے قریب باریک نسوں کے واسطے سے نیلے دریا سے مل کر دائرے کو مکمل کر دیتا ہے۔

دل سے سارے جسم کو خون کی ترسیل ہوتی ہے اور ضرورت کے مطابق خون کی رسد' روانی' دباؤ اور مقدار میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ اس کمی بیشی کو اِعْتِدال پر رکھنے کے لیے متعدد عوامل کام کرتے ہیں' جن میں دل کے پٹھوں کی مضبوطی' دل کے صمام کی کارکردگی' رگوں میں خون سمانے کی گنجائش اور خون کی اپنی مقدار اہم ہیں۔ لیکن اصل فیصلہ کُن بات دل کے پٹھوں کی قوت ہے۔ ایک دن میں رگوں میں اس قَدَر گردش کر لیتا ہے جس قَدَر ستّر بیرل میں ہوتا ہے اور محنت کے وقت یہ مقدار چودہ بیرل فی گھنٹا ہو جاتی ہے۔

اگر جسم کو باغ تصور کیا جائے تو دل کی حیثیت اس سرچشمہ کی ہو گی جس کے ذریعہ سے باغ کی سیرابی ہوتی ہے اور یہ سیرابی ان نالیوں کے ذریعہ ہوتی ہے جو سارے

جسم میں پھیلی ہوئی ہیں۔ زمانہ کی دستبرد سے یہ سرچشمہ ' اس کی نالیاں اور اس کے دوسرے حصے خراب ہو سکتے ہیں۔

دل اس پمپ کی طرح ہے جو سارے گھر کو گرم پانی مہیا کرتا ہے۔ اس کو اپنا کام سرانجام دینے کے لیے خود توانائی کی ضرورت ہوتی ہے جو کارونری رگوں کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔ دو کارونری رگیں دل کو خون پہنچاتی ہیں' جن کی رسد بوقت ضرورت دوگنی تگنی بھی ہو جاتی ہے۔ یہ اضافہ اس وقت ہوتا ہے جب دل کا کام بڑھتا ہے۔ یوں تو دل ہر وقت کام کرتا ہے لیکن جب کام کی زیادتی ہوتی ہے مثلاً: بس کے لیے دوڑنا' کھیلنا' بوجھ سرکانا' کھانا کھانا' غصہ کرنا۔ ان سب باتوں سے دل کا کام بڑھ جاتا ہے اور دل کو اس وقت زیادہ خون کی رسد چاہیے۔ اگر کارونری رگیں درست ہیں تو یہ رسد مہیا ہو جائے گی ورنہ بقدر ضرورت خون نہیں پہنچ سکے گا اور دل درد کی وجہ سے کراہے گا۔

دل جیسا زور آور پمپ ایسے مضبوط خمیر سے بنا ہے جو خوش قسمتی سے آسانی سے ٹوٹتا پھوٹتا نہیں۔ چونکہ اس کی ساخت دوسرے پٹھوں سے مختلف ہے اس لیے یہ دوسرے پٹھوں کے مقابلہ میں زیادہ مضبوط اور اس کو کام بھی سب سے زیادہ اور مسلسل کرنا پڑتا ہے۔

دل بظاہر ایک چھوٹا سا عضو ہے لیکن اس کو جس قدر اور جس نوعیت کا کام کرنا پڑتا ہے وہ محیرّ العقول ہے اور کوئی مستری آج تک ایسی صنّاعی کا نمونہ پیش نہیں کر سکا جو ایسی پائدار اور عمدہ کام کرنے والی مشین کا مقابلہ کر سکے۔ اس میں ہنگامی حالت سے نمٹنے کی صلاحیت بھی ہے اور اگر کسی وجہ سے اس میں نقص پیدا ہو جائے تو کام کرتے کرتے آپ سے آپ اپنی مرمت بھی کر لیتا ہے اور کام کے دوران میں بذریعہ خون اپنی غذا بھی حاصل کرتا رہتا ہے' لیکن غذا کارونری رگوں کے راستہ آنی چاہیے۔ اس کے اپنے حجروں میں جو خون ہے' دل اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ اگر دل یہ خون استعمال کر سکتا تو کبھی بھی حملہ قلب نہیں ہوتا۔

دل ایک منٹ میں تقریباً ستر دفعہ دھڑکتا ہے۔ یہ رفتار کم سے کم پچاس فی

منٹ اور زیادہ سے زیادہ نوے فی منٹ ہوتی ہے۔ بچوں میں دل سو سے ایک سو بیس دفعہ فی منٹ دھڑکتا ہے۔ چھوٹے دل بہ نسبت بڑے دل کے زیادہ تیز رفتاری سے دھڑکتے ہیں مثلاً جانوروں میں ان کی دھڑکن مختلف ہے کہ ہاتھی کا دل ایک منٹ میں پچیس دفعہ دھڑکتا ہے لیکن ایک چوہے کا دل ایک منٹ میں سات سو دفعہ۔ جب دل دھڑکتا ہے تو سینے پر ہاتھ رکھنے سے اس کی دھڑکن محسوس ہوتی ہے لیکن عموماً دل کے دھڑکنے کا احساس نہیں ہوتا' سوائے ان نوجوانوں کے جو بے چین اور مضطرب ہوں۔

دل کی دھڑکن لال رگوں میں بھی محسوس کی جاتی ہے اور کلائی پر نبض بن جاتی ہے' جو زمانہ قدیم سے بیماری کی تشخیص کے لیے محسوس کی جاتی رہی ہے۔ نبض کے معائنہ کے لیے اپنی داہنی دو انگلیوں کو بائیں کلائی پر اندرونی طرف رکھیں تو دل کی ہر دھڑکن کے ساتھ نبض پھڑکتی ہوئی معلوم دے گی اور اس طرح فی منٹ نبض کی رفتار معلوم کی جاسکتی ہے۔ مشقت اور جذباتی ہیجان کے وقت یہ رفتار بڑھ جاتی ہے۔ بخار کی حالت اور بعض دوسرے امراض میں بھی رفتار بڑھ جاتی ہے۔ جب دل تیزی سے دھڑکتا ہے تو اس کو زیادہ خوراک کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر آپ دوڑ لگائیں اور پھر اپنی نبض کو شمار کریں تو معلوم ہو گا کہ اس کی رفتار تیز ہو گئی ہے۔ چونکہ مشقت کی حالت میں جسم کے خلیوں کو زیادہ آکسیجن اور رزق کی ضرورت ہے اس لیے دل تیز رفتاری سے دھڑک کر یہ خوراک جسم کو پہنچاتا ہے اور ساتھ میں خلیوں سے بذریعہ خون فضلہ کا اخراج بھی ہوتا ہے۔

دل کے متعلق یہ عام غلط فہمی ہے کہ اس کو آرام کا وقت نہیں ملتا۔ اگر بغور دیکھا جائے تو دل چوبیس گھنٹے میں صرف آٹھ گھنٹے کام کرتا ہے۔ یہ بات گو تعجب خیز معلوم ہوگی لیکن بالکل صحیح ہے۔ اگر دل کی رفتار ایک منٹ میں ساٹھ دفعہ ہو تو دل ایک سیکنڈ میں ایک دفعہ دھڑکے گا تو اس وقت کے ایک تہائی وقفہ میں تو یہ سکڑتا ہے جو اس کا اصل کام ہے اور دو تہائی وقفہ میں یہ ڈھیلا پڑتا ہے۔' جو اس کا آرام ہے۔ اس طرح چوبیس گھنٹے میں ایک تہائی وقت (آٹھ گھنٹے) کام کا ہے اور دو تہائی (سولہ گھنٹے) آرام کا ہے۔ جب دل کی رفتار تیز ہو تو آرام کا وقت کم ہو جاتا ہے۔ اس طرح جو

دل تیز ہوتے ہیں وہ جلدی تھک جاتے ہیں۔ اس لیے آہستہ خرام دل بہ نسبت تیز خرام کے بہتر ہوتے ہیں۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ پہلوانوں اور ورزش کرنے والوں کے دل کی رفتار آہستہ ہوتی ہے اور مشقت کے وقت بھی زیادہ سرپٹ نہیں ہو جاتی' جو ان کے لیے مفید ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ ورزش کے عادی نہیں ہیں انھیں اگر کبھی خلافِ معمول مشقت کرنا پڑ جائے تو دل کی رفتار بے قابو ہو جاتی ہے۔ یہ ہمیشہ سے معلوم ہے کہ جذباتی ہیجان میں دل کی رفتار بڑھ جاتی ہے۔

ایک حکایت ہے کہ قابوس والئ گورگان کا بھتیجا ایک پُراَسرار مرض میں مبتلا ہو گیا تھا' جو کسی طبیب کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ شیخ الرئیس بوعلی سینا سے اس کو دیکھنے کی درخواست کی گئی۔ بوعلی سینا نے بیمار کے معائنہ کے بعد ایک ایسے شخص کو بلایا جو شہر سے واقف تھا اور اس سے کہا کہ اس شہر کے محلوں کے نام لینا شروع کرے۔ اس دوران میں بوعلی سینا مریض کی نبض شمار کرتا رہا۔ ایک محلّہ کے نام پر پہنچ کر بوعلی سینا نے کہا کہ اب اس محلّہ کی گلیوں اور کوچوں کے نام لو۔ پھر ایک خاص گلی کے نام کے بعد کہا کہ اب اس کوچہ کے رہنے والوں کے نام بتاؤ۔ ایک خاص اہل خانہ کا جب نام آیا تو کہا کہ اس گھر کے رہنے والوں کے نام بتائے جائیں۔ اس دوران میں بوعلی سینا نبض بھی شمار کرتا رہا اور مریض کے چہرہ کے تغیرات پر بھی نظر رکھتا رہا۔ جب ایک خاص نام آیا' جو ایک خاتون کا تھا تو بوعلی سینا نے محسوس کیا کہ مریض کے دل کی رفتار بہت تیز ہو گئی۔ یہ مریض اس کے عشق میں گرفتار تھا۔ اس کیفیت کا اظہار عندلیب شادانی کے اس شعر سے ہوتا ہے:

• بے نیازانہ برابر سے گذرنے والے
تیز کچھ قلب کی رفتار ہوئی ہے کہ نہیں

یعنی جذبات کا اثر جسم کے اعضاء پر اور یہ "نفسی جنسی" بیماریاں آج ایک وسیع موضوع ہیں۔ جس طرح جسم کے دوسرے اعضاء پر بڑھاپا آتا ہے اور تھکن طاری ہوتی ہے' اسی طرح دل پر بھی ہوتی ہے۔ لیکن یہ عجائبات میں سے ہے کہ ایک آدمی ستر سال زندہ رہے تو دل چار کھرب دفعہ دھڑکے گا اور اس دوران میں دس کروڑ

گیلن خون کا اخراج کرے گا یعنی دل کی تین دھڑکنوں میں ایک پیالی خون خارج ہوتا ہے اور سخت محنت کی جائے تو فی گھنٹا چودہ بیرل خارج ہو گا۔

دل کی دھڑکن تابع ہے ایک برقی رو کے، جو دل کے عصبی مرکز قدم ساز سے نکل کر دل کے ریشہ ریشہ تک پھیل جاتی ہے۔

دل کی دھڑکن کو قابو میں رکھنے کے لیے دل کے داہنے بالائی حجرہ میں ذرا اوپر کی طرف دل کا عصبی مرکز یا قدم ساز واقع ہے۔ یہ عصبی بافت کی چھوٹی سی گومڑی ہے، جہاں سے برقی رو نکل کر بالائی حجروں پر اس طرح پھیلتی ہے جیسے چٹیل میدان پر پانی بہا دیا جائے۔ یہاں سے جو پیغام روانہ ہوتا ہے وہ دوسرے مرکز میں وصول ہوتا ہے۔ یہ مرکز ثانی بالائی اور زیریں حجروں کے سنگم پر واقعہ ہے، یہاں سے مہین مہین تاروں کے راستہ جو زیریں حجروں کے عضلات میں پیوست ہیں یہ برقی لہریں دل کے زیادہ تر حصوں میں پہنچ جاتی ہیں اور یہی برقی لہریں برقی تقطیع قلب کی بنیاد ہیں کہ ان برقی لہروں کو ایک مخصوص کاغذ پر نقش کر لیا جاتا ہے۔ دل کا دھڑکنا، قدم ساز کی کارکردگی، اعصاب کے نظم اور ہارمون کے اثر پر منحصر ہے اور دل صورت حال کے لحاظ سے تیز اور آہستہ ہوتا رہتا ہے۔ لیکن دل ہی صرف ایسا عضو ہے جو بغیر کسی عصبی نظم کے بھی آپ سے آپ دھڑکتا ہے اور یہ بات آج سے دو ہزار سال قبل اسکندریہ کے طبیبوں کے علم میں تھی کہ اگر دل کو جسم سے علیحدہ کر کے سب اعصاب قطع کر دیئے جائیں لیکن خون کی رسد برقرار رکھی جائے تو دل دھڑکتا رہے گا۔

(قلب)

سوالات

۱۔ خالی جگہوں کو پُر کیجیے۔

(الف) دل کی بیماری اسی سال کی عمر سے قبل ہمارا اپنا قصور ہے، نہ یہ ——— ہے اور نہ ———

(ب) جو لوگ دبلے اور لمبے ہوتے ہیں، ان کا دل بھی ——— اور ——— کا ہوتا ہے۔

(ج) جو لوگ وسیع الجثہ ہوتے ہیں، ان کا دل بھی ــــــــ کا ہوتا ہے۔

(د) دل کے ــــــــ نہایت مضبوط ہوتے ہیں اور یہ ــــــــ کام دیتے ہیں۔

(ہ) اس میں ــــــــ میں نمٹنے کی صلاحیت بھی ہے۔

(و) دل کی دھڑکن لال رگوں میں بھی محسوس کی جاتی ہے اور کلائی پر ــــــــ بن جاتی ہے۔

(ز) یہ ہمیشہ سے معلوم ہے کہ جذباتی ہیجان میں دل کی رفتار ــــــــ جاتی ہے۔

(ح) ان برقی لہروں کو ایک مخصوص کاغذ پر ــــــــ کر لیا جاتا ہے۔

۲۔ مختصر جواب دیجیے۔

(الف) عام طور پر دل کا حجم اور وزن کس قدر ہوتا ہے؟

(ب) کن حالتوں میں دل پر کام کا بوجھ بڑھ جاتا ہے؟

(ج) دل ایک منٹ میں عموماً کتنی بار دھڑکتا ہے؟ یہ رفتار کس حد تک کم و بیش ہو سکتی ہے؟

(د) نوخیز بچوں کے دل کی رفتار کتنی ہوتی ہے؟

(ہ) بو علی سینا نے نبض کے ذریعے مرض کی تشخیص کیسے کی؟

(و) خون کی ترسیل کو اعتدال پر رکھنے کے لیے کون کون سے عوامل کام کرتے ہیں؟

(ز) سخت محنت کی کیفیت میں دل سے خارج ہونے والے خون کی مقدار کس قدر ہوتی ہے؟

(ح) ستّر سال میں دل تقریباً کتنی بار دھڑکتا ہے اور اس مدت میں اس سے خارج ہونے والے خون کی مقدار کتنی ہوتی ہے؟

۳۔ دل کی ساخت اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

۴۔ دل کس طرح کام کرتا ہے؟

○☆○☆○☆○☆○☆○

خدیجہ مستور

(۱۹۲۸ء - ۱۹۸۲ء)

پاکستان بن گیا

(آدم جی ادبی انعام یافتہ ناول "آنگن" قیامِ پاکستان کے بعد لکھے جانے والے ناولوں میں ممتاز مقام کا حامل ہے۔ "آنگن" میں ہندوستان کے ایک مسلمان گھرانے کی زندگی کے حالات بیان ہوئے ہیں اور اس امر کا تجزیہ کیا گیا ہے کہ افراد کی زندگیوں پر گردوپیش میں رونما ہونے والے سماجی اور سیاسی واقعات کا گہرا اثر ہوتا ہے۔اس کے علاوہ ناول میں مسلمان اشراف گھرانوں میں گھریلو زندگی کی جھلک ' طبقہ نسواں کی جذباتی زندگی اور دوسرے کرداروں کی نفسیات کو مہارت سے پیش کیا گیا ہے۔ناول کا موضوع تقسیم سے ذرا پہلے اور تقسیم سے بعد کا وہ مختصر زمانہ ہے جب جنوبی ایشیا کے مسلمان ہجرت کرنے یا نہ کرنے کی کشمکش میں مبتلا تھے اور ملک کے طول وعرض میں جابجا انسانی خون ارزاں ہو گیا تھا۔)

پاکستان بن گیا۔ لیگی راہ نما کراچی دارالحکومت جا چکے تھے۔ پنجاب میں خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ بڑے چچا اس صدمے سے جیسے نڈھال ہو گئے تھے۔ بیٹھک میں بیماروں کی طرح وہ ہر ایک سے پوچھتے رہتے: "یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ کیا ہو گیا؟ یہ ہندو مسلمان ایک دم ایک دوسرے کے ایسے جانی دشمن کیسے ہو گئے؟ یہ انھیں کس نے سکھایا ہے؟ ان کے دل سے کس نے محبت چھین لی؟"

جب وہ یہ سب کچھ عالیہ سے پوچھتے تو وہ ان کا سر سہلانے لگتی۔ "بڑے چچا آپ آرام کیجیے' آپ تھک گئے ہیں بڑے چچا۔" اور بڑے چچا اس طرح آنکھیں بند کر لیتے جیسے خون کی ندی ان کی آنکھوں کے سامنے بہ رہی ہو۔

"زمانے زمانے کی بات ہے' وہ بھی زمانہ تھا جب ہندو اپنے گاؤں کے

مسلمانوں پر آنچ آتے دیکھتے تو سر دھڑ کی بازی لگا دیتے اور مسلمان ہندو کی عزت بچانے کے لیے اپنی جان نچھاور کر دیتا' ایسا بھائی چارہ تھا کہ لگتا ایک ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے ہیں' پر اب کیا رہ گیا' دونوں کے ہاتھوں میں خنجر آگیا ہے"۔ کریمن بوا فساد کی خبریں سن سن کر ٹھنڈی آہیں بھرا کرتیں۔ اپنے شہر میں فساد تو نہ ہوا تھا مگر سب کی جانوں پر بنی رہتی' پتا نہیں کب کیا ہو جائے۔

"کہاں ہو گا میرا شکیل؟" بمبئی میں فساد کی خبر سن کر بڑی چچی بلکنے لگیں۔

" تمھارا پاکستان بن گیا جمیل' تمھارے ابا کا ملک بھی آزاد ہو گیا' پر میرے شکیل کو اب کون لائے گا؟"

"سب ٹھیک ہو جائے گا اماں' وہ خیریت سے ہو گا۔ یہ فساد وساد تو چار دن میں ختم ہو جائیں گے"۔ جمیل بھیا ان کو سمجھاتے مگر ان کا چہرہ فق رہتا۔

شام سب لوگ خاموش بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ ماموں کا خط آگیا۔ انھوں نے اماں کو لکھا تھا کہ انھوں نے اپنی خدمات پاکستان کے لیے وقف کر دی ہیں اور وہ جلد ہی جا رہے ہیں۔ "اگر آپ لوگوں کو چلنا ہو تو فوراً جواب دیجیے اور تیار رہیے۔"

"بس ابھی تار دے دو جمیل میاں' ہماری تیاری میں کیا لگے گا' ہم تو بس تیار بیٹھے ہیں۔ ہے! اپنا بھائی ہے بھلا ہمیں اکیلا چھوڑ کر جا سکتا ہے"؟ مارے خوشی کے اماں کا منہ سرخ ہو رہا تھا۔

جمیل بھیا نے اس طرح گھبرا کر سب کی طرف دیکھا جیسے فسادی ان کے دروازے پر پہنچ گئے ہوں "مگر آپ کیوں جائیں گی چھوٹی چچی؟ آپ یہاں محفوظ ہیں۔ میں آپ کے لیے اپنی جان دے دوں گا۔" انھوں نے آج بڑی مدت بعد عالیہ کی طرف دیکھا' کیسی سفارشی نظریں تھیں مگر عالیہ نے اپنی آنکھیں جھکا لیں۔

"میں نہ جاؤں تو کیا ہندوؤں کے نگر میں رہوں' پاکستان میں اپنوں کی تو حکومت ہو گی' پھر میں اپنے بھائی کو چھوڑ کر ایک منٹ بھی زندہ نہیں رہ سکتی' واہ۔"

مارے خوشی کے اماں سے نچلا نہ بیٹھا جا رہا تھا۔

"عالیہ جانے پر راضی نہیں ہوگی چھوٹی چچی' وہ نہیں جائے گی' وہ جا ہی نہیں سکتی۔" جمیل بھیا نے جیسے نیم دیوانگی کے عالم میں کہا:

"تم اچھے حق دار آ گئے' کون نہیں جائے گا۔" اماں ایک دم بھرا اٹھیں۔ "تم ہوتے کون ہو روکنے والے؟"

"ضرور جائیے چھوٹی چچی"۔ جمیل بھیا نے سر جھکا دیا اور عالیہ کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ نہیں جا سکتی۔ صدیاں گزر جائیں گی مگر وہ یہاں سے ہل بھی نہ سکے گی۔

"میں ابھی تار کیے دیتا ہوں کہ سب تیار ہیں"۔ جمیل بھیا اٹھ کر باہر چلے گئے۔

عالیہ کا جی چاہا کہ وہ چیخ چیخ کر اعلان کرے کہ وہ نہیں جائے گی' وہ نہیں جا سکتی' اسے کوئی نہیں لے جا سکتا' مگر اس کے گلے میں تو سیکڑوں کانٹے چبھ رہے تھے' وہ ایک لفظ بھی نہ بول سکی' اس نے ہر طرف دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں مگر وہ کیوں رکے' کس لیے' کس کے لیے' اس نے سوچا اور پھر جیسے بڑے سکون سے چھالیہ کاٹنے لگی۔ عالیہ بیگم اگر تم رہ گئیں تو ہمیشہ کے لیے دلدل میں پھنس جاؤ گی۔

"کریمن بوا اگر سب لوگ چائے پی چکے ہوں تو ------" اُسرار میاں نے بیٹھک سے آواز لگائی اور کریمن بوا آج تو ڈائنوں کی طرح چیخنے لگیں ------ "ارے کوئی تو اس اسرار میاں کو بھی پاکستان بھیج دو۔ سب چلے گئے' سب چلے جائیں گے مگر یہ کہیں نہیں جاتا"۔

بیٹھک میں اُسرار میاں کے کھانسنے کی آواز آئی اور پھر خاموشی چھا گئی۔

"کیا تم سچ مچ چلی جاؤ گی چھوٹی دلہن؟" بڑی دیر تک چپ رہنے کے بعد بڑی چچی نے پوچھا۔

"ظاہر ہے کہ چلی جاؤں گی"۔ اماں نے رکھائی سے جواب دیا۔

"یہ گھر تمھارا ہے چھوٹی دلہن ' مجھے اکیلے نہ چھوڑ دو"۔ بڑی چچی نے

ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں بند کر لیں، شاید وہ تنہائی کے بھوت سے ڈر رہی تھیں۔

عالیہ جیسے پناہ ڈھونڈنے کے لیے اوپر بھاگ گئی۔ دھوپ پیلی پڑ کر سامنے کے مکان کی اونچی دیوار پر چڑھ گئی تھی۔ ہائی اسکول کے احاطے میں بسیرا لینے والے پرند مسلسل شور مچائے جا رہے تھے۔

کھلی فضا میں آکر اس نے اطمینان کی سانس لی اور مسافروں کی طرح ٹہل ٹہل کر سوچنے لگی کہ اب آگے کیا ہو گا' شاید اچھا ہی ہو' وہ یہاں سے جا کر ضرور خوش رہے گی..

جب وہ نیچے اتری تو سب اپنے اپنے خیالوں میں مگن بیٹھے تھے' صرف کریمن بوا جانے کس بات پر بڑبڑا رہی تھیں اور پھرتی سے روٹیاں پکاتی جا رہی تھیں۔

جمیل بھیا کہاں گئے' اب تک کیوں نہیں آئے' عالیہ نے سونی کرسی کی طرف دیکھا۔ جانے یہ سرپھرا آدمی اسے یاد کرے گا یا بھول جائے گا۔ اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔

لالٹین کی بتی خراب تھی اس لیے اس میں سے دو لَویں اٹھ رہی تھیں اور ایک طرف سے چمنی سیاہ ہو گئی تھی۔ مدھم روشنی میں اماں' بڑی چچی اور کریمن بوا کے چہرے بگڑے بگڑے لگ رہے تھے۔

جمیل بھیا گھر میں داخل ہوئے اور اپنی کرسی پر بیٹھ گئے۔ "میں تار کر آیا ہوں چھوٹی چچی۔" انھوں نے دھیرے سے کہا۔

"تم اتنی دیر تک باہر نہ رہا کرو' شام سے گھر آجایا کرو' جانے کب یہاں بھی گڑبڑ ہو جائے"۔ بڑی چچی نے کہا۔

"رہنا تو پڑتا ہے' مسلمان ڈرے ہوئے ہیں' انھیں سمجھانا ہے کہ وہ یہاں ڈٹ کر رہیں اور یہاں کی فضا کو پر امن رکھیں' گھر میں بیٹھ کر تو کام نہ چلے گا۔"

"توبہ اب ملک آزاد ہو گیا تو یہ کام شروع ہو گئے' خیر مجھے کیا' تم نے تار پر پتا ٹھیک لکھا تھا نا؟" اماں نے پوچھا۔

"آپ اطمینان رکھیں، پتا ٹھیک تھا۔"

"خیر سے ہم تو پاکستان جا رہے ہیں، مگر اب تم اپنے گھر کی فکر کرو جمیل میاں، کیا بری حالت ہو چکی ہے، اپنی ماں کی طرف بھی دیکھو"۔ اماں نے ہمدردی سے بڑی چچی کی طرف دیکھا۔

"کون جا رہا ہے پاکستان؟" بڑے چچا نے صحن میں قدم رکھتے ہی بوکھلا کر پوچھا۔ انھوں نے اماں کی باتیں سن لی تھیں۔

"میں اور عالیہ جائیں گے، اور کسے جانا ہے"۔ اماں نے تڑاق سے جواب دیا۔

"کوئی نہیں جا سکتا، میری اجازت کے بغیر کوئی قدم نہیں نکال سکتا، کس لیے جاؤ گے پاکستان؟ یہ ہمارا ملک ہے، ہم نے قربانیاں دی ہیں، اور اب ہم اسے چھوڑ کر چلے جائیں؟ اب تو ہمارے عیش کرنے کا وقت آ رہا ہے"۔ بڑے چچا سخت جوش میں تھے۔

"ماشاء اللہ آپ بڑے حق دار بن کر آ گئے، نہ کھلانے کے نہ پلانے کے، کون سا دکھ تھا جو یہاں آ کر نہیں جھیلا، میرے شوہر کو بھی آپ ہی نے چھین لیا، آپ ہی نے انھیں مار ڈالا۔ میری لڑکی کو یتیم کر دیا اور اب حق جتا رہے ہیں۔" مارے غصے کے اماں کی آواز کانپ رہی تھی۔

"کریمن بوا میرا کھانا بیٹھک میں بھجوا دو"۔ بڑے چچا سر جھکا کر بیٹھک میں چلے گئے۔

"کیا آپ چلنے سے پہلے بڑے چچا کو یہی بدلہ دینا چاہتی ہیں؟ بڑے چچا نے کسی کو تباہ نہیں کیا، بڑے چچا نے کسی کو دعوت نہیں دی تھی کہ آؤ اور میرا ساتھ دو۔ آپ آج اچھی طرح سن لیں کہ مجھے بڑے چچا سے اتنی ہی محبت ہے جتنی ابا سے تھی۔" عالیہ نے کھانا چھوڑ دیا اور ہاتھ دھو کر بیٹھک میں چلی گئی، اماں کیا کہتی رہ گئیں اس نے ذرا بھی نہ سنا۔

"کیا تم سچ مچ جا رہی ہو بیٹی؟"

"ہاں بڑے چچا' اماں جو تیار ہیں۔" اس نے بے بسی سے جواب دیا۔

"یہ انگریز جاتے جاتے بھی چال چل گیا' لوگوں کو گھر سے بے گھر کر گیا' پھر بھی تم مت جاؤ بیٹی' اپنی ماں کو سمجھا لو' اب تمھارے سکھ کا زمانہ آ گیا ہے"۔

"بڑے چچا میں تو اماں کا واحد سہارا ہوں' میں انھیں کس طرح چھوڑ دوں' وہ ضرور جائیں گی مگر آپ کو نہیں معلوم کہ یہ گھر چھوڑ کر میں کس طرح تڑپوں گی' آپ ـــــ آپ تو ـــــ" وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر سسکنے لگی۔

"چھوٹی دلہن کو مجھ سے سخت نفرت ہے' ٹھیک ہے' میں نے تم لوگوں کے لیے کچھ بھی نہ کیا' مگر اب وقت آیا تھا کہ اس گھر میں پہلی سی شادمانی لوٹ آتی' مجھے بڑی اچھی ملازمت دی جا رہی ہے' پھر دکانوں کو چلانے کے لیے دس پندرہ ہزار کی امداد بھی ملنے کی توقع ہے' میں چھوٹی دلہن کی سب شکایتیں رفع کر دوں گا" ـــــ انھوں نے عالیہ کو پیار سے تھپکا ـــــ "کیا گھر میں تیل ختم ہو گیا ہے؟ لالٹین کی روشنی مدھم ہوتی جا رہی ہے' اب ان شاء اللہ تھوڑے دنوں میں بجلی کا کنکشن بحال کرا لوں گا اور اب تم ایم اے میں داخلہ کیوں نہ لے لو۔ میرا خیال ہے کہ تم کو اگلے سال ضرور داخل کرا دوں۔"

عالیہ کا کلیجہ کٹ رہا تھا۔ آنسو پونچھ کر وہ خاموش بیٹھی رہی۔ جی ہی جی میں گھٹ رہی تھی مگر ایک لفظ بھی نہ بول سکی۔ خدا آپ کو سکھ دے بڑے چچا' خدا آپ کے سارے سہانے خواب پورے کرے ـــــ وہ دل ہی دل میں دعا مانگ رہی تھی۔ وہ بڑے چچا سے کس طرح کہتی کہ وہ تو یہاں سے خود بھاگ جانا چاہتی ہے۔

اُسرار میاں بیٹھک میں داخل ہونے کے لیے پٹ کھول رہے تھے۔ عالیہ اٹھ کر صحن میں آ گئی۔

اماں اور بڑی چچی جانے کیا باتیں کر رہی تھیں۔ جمیل بھیا اب تک کرسی پر بیٹھے انگلیاں مروڑ رہے تھے۔ وہ ایک لمحے تک آنگن میں کھڑی رہی اور پھر اوپر چلی

گئی۔

شبنم سے بھیگی ہوئی رات بڑی روشن ہو رہی تھی۔ چاند جیسے وسط آسمان پر چمک رہا تھا اور روز کی طرح آج بھی قریب کی کسی چھت پر گراموفون ریکارڈ بج رہے تھے۔ "تری گٹھڑی میں لاگا چور، مسافر جاگ ذرا"۔

وہ آہستہ آہستہ ٹہلنے لگی کیسی عجیب سی حالت ہو رہی تھی، جیسے سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیت کسی نے چھین لی ہو۔ کیا یہ میں ہوں؟ "اس نے اپنے آپ سے پوچھا اور پھر اپنی آواز سن کر حیران رہ گئی ------ حد ہے دیوانگی کی، وہ کس سے پوچھ رہی تھی۔

ٹہلتے ٹہلتے وہ ایک بار مڑی تو جمیل بھیا بت کی طرح بے حس و حرکت کھڑے تھے۔ وہ اور تیزی سے ٹہلنے لگی۔ اب یہ کیا کہنے آئے ہیں۔ انھوں نے اپنا وعدہ بھلا دیا۔

"کیا سچ مچ تم نے جانے کا فیصلہ کر لیا ہے"؟ انھوں نے دھیرے سے پوچھا۔

"ہاں"! اس نے ٹہلتے ہوئے جواب دیا۔

تم یہاں سے جا کر غلطی کرو گی۔ تم نے ایک بار کہا تھا نا کہ دور رہ کر یادیں بہت اذیت ناک ہو جاتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تم وہاں خوش نہ رہو گی"۔

"میں ہر جگہ خوش رہوں گی۔ مگر آپ نے تو وعدہ کیا تھا کہ آپ مجھ سے کبھی کچھ نہ کہیں گے۔"

"میں کیا کہہ رہا ہوں؟"

"کچھ نہیں۔"

"تم میری مقروض ہو، یاد رکھنا کہ تم کو یہ قرض چکانا ہو گا"۔ وہ جانے کے لیے مڑے۔ "تم وہاں خوش رہو گی نا؟" انھوں نے رک کر پوچھا۔

وہ چپ رہی۔ جمیل بھیا تھوڑی دیر کھڑے رہے اور پھر چلے گئے اور اس

نے محسوس کیا کہ اس وقت وہ سب کچھ کھو بیٹھی ہے۔

بڑی دیر تک یوں ہی ٹہلنے کے بعد جب وہ تھک گئی تو چچی کو خط لکھنے بیٹھ گئی اسے یہاں سے جانے کی اطلاع دینی تھی۔

یہ رات پہاڑوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے' کوئی اسے گزار دے۔ کوئی صبح ہونے کا پیغام سنا دے۔ اسے صبح ہونے کا انتظار ہے۔ صبح وہ چلی جائے گی اور اس کرب سے نجات حاصل کر لے گی۔

سب بول رہے ہیں' باتیں کر رہے ہیں' پھر بھی کیسا سناٹا چھایا ہوا ہے۔ چاند کی کون سی تاریخ ہے۔ اب تک چاند نہیں نکلا۔ چھالیہ کاٹتے کاٹتے عالیہ نے سب کی طرف دیکھا جمیل بھیا سب کی باتوں سے بے نیاز اپنی کرسی پر بیٹھے ایک ہی شعر گنگنائے جا رہے تھے:

مجھے اور زندگی دے کہ ہے داستاں اُدھوری
مِری موت سے نہ ہوگی مِرے غم کی ترجمانی

جمیل بھیا آج سارا دن باہر نہیں نکلے تھے۔ آج ان کو فرصت ہی فرصت تھی۔ جیسے سارے کام ختم ہو گئے اور اب انھیں کچھ بھی نہیں کرنا ہے۔

"بڑی بھابی میں تو جا رہی ہوں مگر آپ میری ایک بات یاد رکھیے گا کہ اگر آپ نے بڑے بھیا اور جمیل میاں کو قابو میں نہ کیا تو آپ کی ساری عمر یوں ہی گزر جائے گی۔ اب تو آزادی بھی مل گئی' اب کون سا بہانہ رہ گیا ہے جو یوں سارا دن دونوں باپ بیٹے آوارہ پھرتے ہیں۔" اماں بڑی چچی کو سمجھا رہی تھیں۔

"مجھے اور زندگی دے کہ ہے داستان ادھوری ---- کہ ہے داستاں ادھوری ----" جمیل بھیا اسی ایک شعر کو رٹے جا رہے تھے۔

اس شعر کو بار بار پڑھ کر وہ کیا جتانا چاہتے ہیں۔ وہ اس سے کیا کہہ رہے ہیں؟ عالیہ کا سروتہ بڑی تیزی سے چھالیہ کاٹنے لگا۔ اللہ میاں اگر اس وقت اسے بہرہ کر دے تو پھر کتنا اچھا ہو۔

"چھوٹی دلہن، ایسا جان پڑتا ہے کہ کلیجہ منہ کو آیا جاتا ہے، بھرا پُرا گھر تھا۔ دیکھتے دیکھتے سب "تڑی بڑی ہو گئے" زمانے زمانے کی بات ہے۔ کوئی کچھ نہیں کر سکتا، قربان جاؤں اس مالک کے جس نے ایک ملک کے دو ملک بنا دیئے، اپنے مسلمانوں کی حکومت ہو گئی، پر ہم اکیلے رہ گئے"۔ کریمن بوا جدائی کے صدمے سے نڈھال ہو رہی تھیں۔

"تم بھی چلو کریمن بوا"۔ اماں نے بڑے خلوص سے کہا۔

"اب تو یہی دعا کریں چھوٹی دلہن کہ اِس گھر سے لاش نکلے میری، آج یہاں سے چلی جاؤں تو مرنے کے بعد مالکن مرحومہ کو کیا منہ دکھاؤں گی، وہ اپنے جیتے جی جہاں بٹھا گئیں وہاں سے کیوں کر پاؤں نکالوں۔"

"سیتا نے رام کی کھینچی ہوئی لکیر سے باہر قدم رکھا تھا تو راون اٹھا لے گیا تھا۔ سیتا نے جیتے جاگتے رام کی حکم عدولی کی تھی، مگر تم کریمن بوا مری ہوئی مالکن کا حکم نہیں ٹال سکتیں۔ پھر بھی سیتا سیتا رہیں اور تم کریمن بوا رہو گی، تم کو کون جانے گا۔ تمھارا قصہ کون لکھے گا۔"

عالیہ نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے کریمن بوا کو دیکھا۔ لالٹین کی مدھم زرد روشنی میں جدائیوں کے دکھ کتنے اجاگر ہو رہے تھے۔

"چھوٹی دلہن اب بھی اپنا فیصلہ بدل دو، مت جاؤ چھوٹی دلہن۔" بڑی چچی کی آواز بھاری ہو رہی تھی۔

"مجھے اور زندگی دے کہ ہے داستاں اُدھوری" ------ جمیل بھیا ساری باتوں سے بے نیاز ہو کر جیسے اس ایک شعر کی کیفیت میں ڈوب کر رہ گئے تھے۔

اللہ کوئی تو اس رات کو گزار دے ورنہ آج وہ اپنی جان سے گزر جائے گی عالیہ نے سَر اُونچا رکھ کر ادھر ادھر دیکھا۔ چاند نکل رہا تھا، آسمان روشن ہوتا جا رہا تھا۔

"چھمی کا خط آیا تھا، اس نے کیا لکھا ہے عالیہ؟" بڑی چچی نے پوچھا۔

"اس نے لکھا ہے کہ پاکستان جانا مبارک ہو، ضرور جائیے۔ اس پاک

سرزمین کو میری طرف سے چومے گا اور مجھے وہاں کی تھوڑی سی مٹی بھیج دیجیے گا۔ میں اسے اپنی مانگ میں لگاؤں گی' میں بدنصیب تو وہاں بھی نہیں جاسکتی اور سب دعا سلام لکھی ہے۔" عالیہ کو جتنا یاد تھا سب سنادیا۔

"اور بھی کچھ لکھا ہے"؟ بڑی چچی نے پوچھا۔

"بس یہی سلام دعا' خط اوپر رکھا ہے۔"

"مری موت سے نہ ہوگی مرے غم کی ترجمانی" ------ جمیل بھیا اب بھی سب سے بے نیاز تھے۔

"جانے ہمارے مسلمانوں کا ملک کیسا ہو گا' مکان بھی مل جائے گا جلدی سے کہ نہیں۔ ہوٹل میں نہ ٹھہرنا چھوٹی دلہن، صحت خراب ہو جائے گی وہاں کے کھانے سے"۔ کریمن بوا کو اب آگے کی فکر ستا رہی تھی۔

"تم پریشان نہ ہو کریمن بوا' میں جاتے ہی خط لکھ دوں گی"۔ اماں نے کہا۔

رات کے بارہ بج رہے تھے۔ رات سرد ہوتی جا رہی تھی مگر سب لوگ بیٹھے تھے عالیہ کا جی چاہ رہا تھا کہ بس اب کسی طرح اوپر بھاگ جائے۔

"اچھا بھئی اب سونے کو چل دیے خدا حافظ ----" جمیل بھیا کرسی سے اٹھ پڑے ----- "مجھے اور زندگی دے -----" وہ کمرے میں چلے گئے۔

بیٹھک کے دروازے کھلے اور بند ہو گئے۔ بڑے چچا ایک ذرا دیر کو بھی اندر نہ آئے۔ عالیہ انتظار کرتی رہ گئی۔

گلی میں آوارہ کتے بھونک بھونک کر رو رہے تھے۔ کاش نیند آجائے! اس کی آنکھوں میں مرچیں سی لگ رہی تھیں ------ ایک دن جب وہ یہاں آئی تھی اور پہلی رات اس کمرے میں گزاری تھی تو ساری رات سو نہ سکی تھی اور آج جب وہ یہاں سے جا رہی ہے تو پھر نیند نے ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ کتنی بہت سی باتیں اس کا کلیجہ نوچ رہی تھیں ------ جمیل بھیا نے اس سے ایک بات بھی نہ کی۔ کیا جاتے جاتے وہ اب اس سے کچھ نہ کہیں گے، کیا اب کچھ کہنے کو باقی نہیں رہ گیا' اللہ، بڑے چچا کیا سوچ رہے

ہوں گے' وہ بڑے چچا کو چھوڑ کر جا رہی ہے۔ اور چھمی خدا کرے اسے پاکستان آنا نصیب ہو جائے۔

جاگتے جاگتے صبح ہو گئی۔ نچلی منزل سے برتنوں کے کھڑکنے اور باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ اس نے کمرے پر ایک وداعی نظر ڈالی اور پھر نیچے آگئی۔

ناشتا تیار تھا' وہ اماں اور بڑی چچی کے ساتھ بیٹھ گئی۔ کمرے کے کھلے دروازوں سے اس نے دیکھا کہ جمیل بھیا اب تک چادر تانے سو رہے تھے۔

حد ہو گئی بے مروتی کی' وہ جا رہی ہے اور ان کی آنکھ بھی نہیں کھلتی' جیسے موت کی نیند آگئی ہے۔ عالیہ کو کیسی ٹھیس لگ رہی تھی ان کے یوں ٹھاٹ سے سونے پر۔ وہ چلی جاتی تو پھر سو لیتے۔

ناشتے کے بعد اماں نے اپنے سارے سامان کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ کپڑوں اور ہلکے پھلکے دو کمبلوں کے سوا تمام سامان چھمی کے کمرے میں بھر دیا گیا تھا کہ جب اچھا وقت آئے گا تو پھر آکر سب کچھ لے جائیں گے۔

"تانگے آگئے ہیں"۔ اسرار میاں نے باہر سے آواز لگائی تو وہ جلدی سے بیٹھک کی طرف بھاگی۔ "کیا آج بڑے چچا بھی سوتے رہیں گے"۔

" تمھارے بڑے چچا تو تڑکے ہی کہیں چلے گئے۔ کہتے تھے کہ کام ہے اور یہ بھی کہتے تھے کہ میں سب کو جاتے نہ دیکھ سکوں گا"۔ کریمن بوا نے بڑی رقت سے بتایا۔

"یہ کہو نا کریمن بوا کہ وقت نہیں تھا جو رخصت کرنے بیٹھے رہتے" ----- اماں نے بڑا سا منہ بنایا۔ "بڑی بھابی' میرا سامان حفاظت سے رکھیے گا' اس کمرے میں تالا لگا دیجیے گا۔" اماں نے ایک بار پھر ہدایت دی۔

اللہ آج کی سیٹیں ریزرو نہ ہوتیں' آج وہ رک سکتی' بڑے چچا سے ملے بغیر وہ کس طرح جا سکتی ہے۔ وہ جیسے تھک کر بیٹھ گئی۔

"اٹھ جاؤ جمیل' تمھاری بہن اور چچی جا رہی ہیں۔ انھیں رخصت تو کرو"

بڑی چچی نے تیسری بار جمیل بھیا کو آواز دی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔

"جلدی کرو کریمن بوا' ہوائی جہاز کسی کا انتظار نہیں کرتا' وقت پر اڑ جائے گا"۔ اسرار میاں نے پھر صدا لگائی۔

"خدا نہ کرے۔ میرا بھائی آج لاہور کے ہوائی اڈے پر انتظار کرے گا' جو ہم لوگوں کو نہ پایا' تو کلیجہ پھٹ جائے گا اس کا"۔۔۔۔اماں نے بوکھلا کر برقع اوڑھ لیا "اب تم بھی جلدی کرو نا"۔۔۔۔انھوں نے جھلا کر عالیہ کی طرف دیکھا جو اب تک بے سدھ سی بیٹھی تھی۔

"بہت وقت ہو رہا ہے' پہلے سے پہنچنا اچھا ہوتا ہے"۔ اسرار میاں کی آواز رکتی ہی نہ تھی۔

"ارے کوئی اس اسرار میاں کو بھی پاکستان بھیج دو۔" کریمن بوا کلیجہ پھاڑ کر رو دیں۔

کریمن بوا اور بڑی چچی اماں سے مل مل کر رو رہی تھیں مگر وہ دم بخود کھڑی رہی اسے تو رونا بھی نہ آرہا تھا۔

"اگر شکیل وہاں ملے تو خط ضرور لکھنا"۔ بڑی چچی نے عالیہ کو لپٹا کر سرگوشی کی "مجھے یاد رکھنا' جاؤ خدا کو سونپا"۔۔۔۔ان کی آواز کانپ رہی تھی۔۔۔۔"ارے اے جمیل اب تو اٹھ جا۔" بڑی چچی نے زور سے پکارا۔

"میں جا رہی ہوں' خود مل لوں گی"۔ عالیہ نے کہا۔

"کیوں مل لو گی؟ وہ تو مارے نفرت کے ملنا نہیں چاہتا"۔ اماں نے تیوریوں پر بل ڈال لیے۔ "بس اب چلو جلدی"۔

"میں جا رہی ہوں' خدا حافظ"۔ عالیہ نے جمیل بھیا کے منہ پر سے چادر کھینچ لی اور پھر جھجک کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ بھیگی اور سوجی ہوئی آنکھوں میں ایک داستان دم توڑ رہی تھی۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں۔ پھر بھی وہ آنکھیں تو اس کی آنکھوں میں گھسی جا رہی تھیں۔

"تم جاتیں کیوں نہیں بے وقوف لڑکی؟ کیا یہی دیکھنے کے لیے مجھے جگانے آئی تھیں؟ خدا حافظ۔" انھوں نے پھر منہ چھپالیا۔

"جلدی چلو عالیہ۔" اماں کی آواز آئی۔ تب عالیہ کو خیال آیا کہ اسے جانا ہے باہر تانگا کھڑا ہے مگر اس کے پاؤں کیوں نہیں اٹھتے، اب وہ جاتی کیوں نہیں اور یہ کمرے میں اتنا اندھیرا کیوں چھا رہا ہے۔

"کریمن بوا جلدی کرو بہت دیر ہو رہی ہے، اور چھوٹی دلہن سے اور عالیہ بی بی سے میری دعا کہہ دو اور کہہ دو کہ میرا کہا سنا معاف کریں اور کہہ دو کہ ــــ" اسرار میاں کی آواز رک گئی۔

"خدا کرے کہ تمھاری زبان تھک جائے اسرار میاں"۔ کریمن بوا نے تڑپ کر دعا مانگی۔

عالیہ سب کچھ سن رہی تھی مگر اس کے پاؤں! ارے کوئی اسے کھینچ کر ہی لے جائے۔ وہ اس کمرے سے تو نکل جائے۔

"تم اس لیے دیر کرا رہی ہو کہ ہوائی جہاز ہم کو چھوڑ کر اڑ جائے۔ میرے بھائی کے ٹکٹوں کے دام غارت جائیں اور وہ ہمیں اس جہاز میں نہ پاکر پاگل ہو جائے ــــ" اماں جانے اور کیا کہتیں کہ عالیہ وحشیوں کی طرح بھاگتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

"آپ کے بھائی اور بھاوج سے اتنا بھی نہ ہوا کہ چار پانچ دن ہماری وجہ سے ٹھہر جاتے، ہمارے ساتھ سفر کر لیتے اور اب ہمارے لیے پاگل ہو جائیں گے، افوہ"! عالیہ زور سے بولی اور پھر بڑی چچی سے لپٹ کر سسکنے لگی۔

(آنگن)

سوالات

۱۔ "پنجاب میں خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی" اس جملے کی وضاحت کیجیے۔

۲۔ ""تم میری مقروض ہو' یاد رکھنا تم کو یہ قرض چکانا ہو گا"۔ یہ الفاظ جمیل نے کس سے اور کیوں کہے؟

۳۔ چھمی نے اپنے خط میں عالیہ کو کیا لکھا تھا؟

۴۔ پاکستان بننے سے پہلے مسلمانوں کے دلوں میں کیا خدشات تھے؟

۵۔ جمیل بھیا اور عالیہ کے کرداروں پر روشنی ڈالیے۔

۶۔ سبق کا خلاصہ اپنے الفاظ میں تحریر کیجیے۔

○☆○☆○☆○☆○☆○

رشید احمد صدیقی

(۱۸۹۲ء۔۱۹۷۷ء)
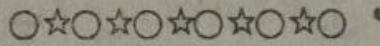
پروفیسر احمد شاہ بخاری (پطرس)

اگر ہم ذہن میں کسی ایسی محفل کا نقشہ جمائیں جہاں تمام ملکوں کے مشاہیر اپنے اپنے شعروادب کا تعارف کرانے کے لیے جمع ہوں تو اردو کی طرف سے ہم بہ اتفاق آرا کس کو اپنا نمائندہ انتخاب کریں گے؟ یقیناً بخاری کو۔ بخاری نے اس قسم کے انتخاب کے معیار کو اتنا اونچا کر دیا ہے کہ نمائندوں کا حلقہ مختصر ہوتے ہوتے معدوم ہونے لگا ہے۔ یہ بات کس وثوق سے ایسے شخص کے بارے میں کہ رہا ہوں جس نے اردو میں سب سے کم سرمایہ چھوڑا ہے لیکن کتنا اونچا مقام پایا۔

تاریخ اور تفصیل میں کون پڑے، اتنا البتہ یاد ہے کہ سب سے پہلے "راوی" میں پطرس کا مضمون "کتے" پڑھا تو ایسا محسوس ہوا جیسے لکھنے والے نے اس مضمون سے، جو درجہ حاصل کر لیا وہ بہتوں کو تمام عمر نصیب نہ ہو گا۔ ظرافت نگاری میں پطرس کا ہمسران کے ہم عصروں میں کوئی نہیں۔ طنز وظرافت آسانی سے ہاتھ آجانے والے لیکن پر پیچ اور خطرناک آلے ہیں۔ ہنسی دل لگی یا طعن تشنیع کسے نہیں آتی۔ لیکن بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ کب ہنسنا چاہیے، کس پر ہنسنا چاہیے، کتنا ہنسنا چاہیے، اور سب سے مشکل یہ کہ کیسے ہنسنا چاہیے۔ انسان ہنسنے والا جانور کہا جاتا ہے اور یہ صحیح معلوم ہوتا ہے بعض اسی طرح ہنستے ہیں۔ ممکن ہے اسی سبب سے بقیہ جانوروں نے ہنسنا چھوڑ دیا ہو۔ بخاری ان رموز سے واقف تھے۔

بخاری کی ظرافت بندھے ٹکے موضوعات، روایتی کرداروں اور لفظی ہیر پھیر سے بے نیاز ہوتی ہے۔ ہر جگہ ہر بات میں انھوں نے خوش طبعی اور زندہ دلی کا پہلو نکالا ہے، "جیسے صحرا کو مسکرا کے گلستان بنا دیا" ہو۔ بخاری کی ظرافت عام طور سے مفرد ہوتی ہے، مرکب نہیں۔ بعض اَطبّا بڑے سے بڑے امراض کا بھی علاج جڑی بوٹیوں سے کرتے ہیں۔ بعض دوسرے معمولی امراض کے لیے مرکب دوائیں مثلاً

معجون، گولیاں، کُشتہ جات تجویز کرتے ہیں۔ علاج دونوں مستند ہیں لیکن اول الذکر زیادہ مشکل ہے اس لیے زیادہ قابلِ تعریف ہے۔ بخاری ظرافت کو ظرافت ہی کے سہارے قائم رکھتے ہیں اور اس سے ہر مقصد حاصل اور ہر مشکل حل کر لیتے ہیں۔ ان کی ظرافت کی تعبیر آتش کے اس شعر سے کی جا سکتی ہے:

آیا تھا بلبلوں کی تدبیر میں، گُلوں نے
ہنس ہنس کے مار ڈالا صیّاد کو چمن میں

ہنس ہنس کے مار ڈالنے کا گر، بخاری کو خوب آتا تھا۔ ظرافت اور ظرافت نگاری کی یہ معراج ہے۔

بخاری فقروں اور لطیفوں کی تجارت نہیں کرتے تھے۔ وہ ہر طرح کی متاع ہر جگہ پیدا کر لیا کرتے تھے، تجارت کے لیے نہیں تواضع کے لیے وہ اپنی تحریر و تقریر میں لطیفوں اور چٹکلوں کے پیوند نہیں لگاتے تھے بلکہ طبّاعی اور زندہ دلی ان کی رگ و پے میں ساری تھی اور طرح طرح سے جلوے دکھاتی تھی۔ وہ لطیفہ خواں نہ تھے، لطیفہ طراز تھے۔ ممکن ہے بخاری سے کبھی کسی کو تکلیف پہنچی ہو لیکن اتنا یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ ان سے ایک ہی لطیفہ دوسری بار یا کئی بار سننے کی کوفت شاید ہی کسی شخص کو ہوئی ہو۔

بخاری کی علمی شہرت، بے اختیار متوجہ کرنے والی شخصیت، حسین و ذہین خدوخال، اجلا اور ستھرا لباس، بے تصنع خرام و قیام، ہر شخص سے اس کے مناسب حال گفتگو، مزے کی بھی، پتے کی بھی، ہر شخص کی نگاہیں پڑتی تھیں لیکن ان کا اپنا انداز یہ تھا کہ مشاہیر کے حلقوں میں یونہی کبھی گھومتے پھرتے نظر آجاتے، جیسے ان پر کرم کرنے نکل آئے ہوں، ورنہ بیشتر عام لوگوں اور اپنے ساتھیوں کے حلقوں میں مگن رہتے تھے۔ بخاری ایسے یوسف تھے جو کبھی بے کارواں نہیں رہے۔ مقالہ پڑھا تو دھوم مچ گئی۔ اردو اور ہندوستان کی دیگر زبانوں کے ادیبوں کے ایک بنیادی مسئلہ کو پہلی بار نہایت وضاحت کے ساتھ پیش کیا گیا تھا، بحث تفصیل سے یاد نہیں۔ انھوں نے کہا:
"ہندوستانی ادیب مادری زبان اور انگریزی کے درمیان معلق ہو کر رہ گئے ہیں۔ یہ دو

رلسانی کشمکش ان کے فکر و نظر کو فطری رنگ میں جلوہ گر ہونے نہیں دیتی۔ وہ اپنی زبان کی پرداخت اور اس کے حسن کے صحیح احساس سے محروم ہوتے جا رہے ہیں۔ دوسری طرف انگریزی ادب کے اصل خدوخال اور مزاج کو اپنانے کے لیے، جس ریاضت و بصیرت کی ضرورت ہے اس کے نہ خوگر ہیں نہ اس سے پورے طور پر آشنا۔ نتیجہ ظاہر ہے، وہ کلاسیکی ادب کی اساسی قدروں کا صحیح عرفان نہیں رکھتے۔ اس لیے جدید ادب کے افکار کو پرکھنے کی صلاحیت سے بیگانہ ہیں۔ ان کا پورا زور ماضی کو سمجھے بغیر اس سے رشتہ توڑنے اور بغیر پرکھے جدید سے رشتہ جوڑنے پر صرف ہو رہا ہے۔"
بخاری کے ان خیالات کو کانفرنس میں بڑی اہمیت دی گئی اور سب کو اس کا احساس ہوا کہ اتنے اہم موضوع پر کتنی فکر انگیز بات کس وضاحت سے کتنے بڑے مبصر نے کہی۔

بڑے سے بڑے ذہنوں سے ٹکر لینے اور محفل پر چھا جانے میں بخاری کا جواب نہ تھا۔ خواہ وہ محفل علم و دانش کے اکابر کی ہو، خواہ بے تکلف احباب اور بے فکروں کی، خواہ سیاسی شاطروں کی۔ بات کوئی ہو، موقع کیسا ہی ہو، بخاری نہ مشتعل ہوتے تھے، نہ مایوس، نہ متفکر، توازن اور تفنن کی فضا برابر قائم رکھتے تھے۔ کبھی برجستہ فقروں سے کبھی اپنے مخصوص قہقہوں سے لیکن اس دوران میں مقصد کی طرف سے کبھی غافل نہ ہوتے اور جہاں تہاں ایسے نکتے پیدا کرتے رہتے کہ حریف کو قائل ہونا پڑتا کہ بخاری سے مفر نہیں۔ مسئلہ زیر بحث کتنا ہی نازک اور پیچیدہ کیوں نہ ہو بخاری اپنی بات بہت کچھ منوا لیتے تھے، کبھی ایک زیرک وکیل کی طرح، کبھی ایک کار آزمودہ جنرل کی مانند۔ حریفوں کو پسپا ہوتے ہی دیکھا، اکثر لاجواب ہو کر، کہیں ہنسی خوشی اور کہیں بے سوچے سمجھے بھی۔

بخاری کا مزاج مغربی نہ تھا، ذہن تھا۔ ان میں اور ان کے بیشتر ساتھیوں میں اردو شعروادب کا ذوق، مشرقی تہذیب کا رکھ رکھاؤ اور طبائع کے اختلاف کے باوجود اپنی قدروں کی بڑی پاسداری ملتی ہے۔ جب تک پطرس لاہور میں انگریزی کے پروفیسر رہے، ان کا اور ان کے رفقا کا اردو شعروادب کی سمت و رفتار پر برابر اچھا اثر پڑتا رہا۔ اس زمانے میں "نیازمندان لاہور" کی آواز ایسی نہ تھی جس کو نظرانداز کرنا آسان

ہوتا۔ نیاز مندوں کے جاے میں بخاری کا انداز قد بے تکلف، پہچانا جا سکتا تھا۔ اپنی بیش بہا غیر معمولی صلاحیتوں کی وجہ سے بخاری لاہور کے تعلیم یافتہ ذہین، ہونہار، نوجوان طبقے کے سرخیل تھے۔ اعلیٰ پائے کی ذہانتوں کا اتنا اچھا اور بڑا اجتماع اس زمانے میں شاید ہی کہیں اور دیکھنے میں آیا ہو۔ بخاری نہ ہوتے تو شاید ایسی مختلف النوع، بے مثل ذہانتوں کا ایک مرکز پر جمع ہونا ممکن نہ ہوتا۔ کبھی کبھی یہ بات بھی ذہن میں آتی ہے کہ اگر بخاری ان رفیقوں کے ساتھ لاہور میں اسی طرح پاؤں توڑ کر بیٹھ گئے ہوتے جیسے سرسید اور ان کے رفقا علی گڑھ میں، تو اردو کی نئی فتوحات کا کیا عالم ہوتا۔

یہ خیال اس لیے ذہن میں آیا کہ تقسیم ملک کے بعد بخاری انگریزی کی پروفیسری پر لاہور واپس آگئے تو اردو کو نئے حالات اور تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے اور قومی عزائم کے مطابق اس کی تنظیم و ترقی کا ایک منصوبہ ان کے ذہن میں تھا۔ یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ بخاری خود، ڈاکٹر تاثیر اور خواجہ منظور حسین اور بعض دوسرے رفقا، یونیورسٹی میں اردو کی اعلیٰ تعلیم کا کام اپنے ہاتھ میں لینے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ کتنی حوصلہ انگیز دور رُس اور گراں قدر یہ اسکیم تھی۔ جو بروئے کار آجاتی تو کیا عجب آگے چل کر عثمانیہ یونیورسٹی مرحوم کا نعم البدل ثابت ہوتی لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا۔ بخاری کا دامن سیاسی کاموں نے بیرونِ ملک کھینچا اور ساتھیوں میں شاید کوئی ایسا نہ تھا جو اس منصوبے کی مشکلات اور نزاکتوں سے عہدہ بر آ ہونے کا حوصلہ رکھتا اور ساتھی نوجوانوں کی قیادت کر سکتا۔

بخاری خطوط بڑے اچھے لکھتے تھے۔ ان کے کتنے اور کیسے دل آویز خط و خال ان خطوط میں جلوہ گر ملتے ہیں۔ اچھے خطوط وہی لکھ سکتا ہے جس کو مکتوب الیہ سے اخلاص اور اپنے پر اعتماد ہو۔ محبت کی سب سے معتبر علامت یہ ہے کہ عاشق اپنے راز محبوب پر ظاہر کرنے لگے۔ اچھے خطوط لکھنے کے لیے یہ رشتہ اتنا ضروری نہیں ہے جتنا اصول ضروری ہے۔ خط لکھنے کا وہ فن ہے جہاں تکلف یا تصنع لکھنے والے کو لے ڈوبتا ہے۔ سیفٹی فرسٹ یا سیلف فرسٹ کے بندے کبھی اچھے خط لکھنے والے نہیں ہو سکتے۔

"آمیزشے کجا گہر پاک او کجا"[1] کا اطلاق خط نگاری کے فن پر بھی ہوتا ہے۔

امریکہ یا کہیں اور سے دوستوں کے نام جو خطوط انھوں نے وقتاً فوقتاً لکھے اور اردو کے رسالوں میں شائع ہوئے، ان کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ ان کی معلومات کتنی وسیع اور جامع، مشاہدہ کتنا تیز، ذہن کتنا زرخیز، تاثرات کتنے گہرے، تخیل کتنا نادرہ کار اور بات کہنے کے انداز میں کتنی شوخی، شیرینی اور تازگی تھی۔ وہ اپنی نجی تحریروں میں کبھی کبھی اپنے سے بھی زیادہ دلکش معلوم ہونے لگتے تھے۔ یہ فن اور شخصیت دونوں کا اعجاز ہے۔

ایک بار میں نے خط لکھا، کچھ روپے بھیج دیجیے کارِ خیر کے لیے درکار ہیں خط ملتے ہی روپے بھیج دیے، توقع سے زائد، میں نے شکریہ کے خط میں لکھا، بخاری صاحب میری طرح بچپن میں آپ نے بھی مجتبائی قسم کی کتاب میں کہیں نہ کہیں ضرور پڑھا ہوگا کہ ایک مسافر کھانا کھا رہا تھا، اتفاق سے کوئی کتا بھوک سے نڈھال پہنچ گیا۔ مسافر نے ایک ہڈی اس کے آگے پھینک دی۔ کچھ دنوں بعد کسی نے مسافر کو خواب میں دیکھا جس نے بتایا کہ مرنے کے بعد قبر میں عذاب کے فرشتے نازل ہوئے اور گرز مارنا چاہتے تو کتے کو دی ہوئی ہڈی سامنے آجاتی اور فرشتے کچھ نہ کر پاتے۔ چنانچہ عذاب واپس لیا گیا۔ مجھے یقین ہے جو رقم آپ نے اس کارِ خیر میں بھیجی ہے وہ آپ کے اب تک گناہوں کے لیے ایسی ہی ثابت ہوگی۔ بخاری نے لکھا: "مژدے کا شکریہ لیکن اس کا بھی تو اندیشہ ہے کہ ہم آپ جب آخرت میں پہنچیں تو شرح مبادلہ زر اتنا خاطر خواہ نہ رہے۔" تفصیل یا یقین سے تو نہیں کہہ سکتا لیکن اتنا محسوس اکثر کیا کہ اس حلقے کے افراد جتنے بخاری کے شیدائی تھے، بخاری ان کے نہ تھے۔ وہ یقیناً ان کو بہت عزیز رکھتے تھے لیکن مقرر خانوں میں ان پر کسی طرح کی ارضی یا سماوی آفت نازل ہوجاتی ہوگی تو مجھے یقین ہے بخاری ان کی مدد کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتے ہوں گے۔ روپے پیسے سے، دوڑ دھوپ سے، تحریر و تقریر سے، لیکن شاید وہ گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ ذہانت، علمیت،

1۔ کہاں یہ آمیزشیں اور کہاں اس کا جوہر پاک

اقتدار اور شہرت کے میدان میں جہاں وہ لاشریک نہ تھے' ان کا کوئی ساتھی یا کوئی اور شرک کا مرتکب ہو۔ بخاری بڑے بت شکن تھے۔ جن کا تقاضا بھی یہی ہے لیکن جہاں وہ خداؤں میں صرف مسلمانوں کے خدا کے قائل تھے وہاں بتوں میں صرف اپنے بت کے اقوامِ متحدہ کے دفتر میں بخاری شبانہ روز اپنے فرائض جس جانفشانی اور قابلیت سے انجام دیتے تھے وہاں کے چھوٹے بڑے اہل کار کو جس طرح اپنا قائل اور گرویدہ رکھتے تھے اور یارانِ باصفا سے ملنا ہو جاتا تھا تو محبت اور بے تکلفی سے پیش آتے تھے' اس کا حال ملاقاتیوں سے معلوم ہوتا رہتا جو ان کی زیرکی اور ذکاوت کے واقعات اس مزے سے بیان کرتے تھے جیسے کوئی افسانہ سنا رہے ہوں کچھ عرصہ سے ان کی صحت گرتی جا رہی تھی جس کے سبب سے خاموش اور دل گرفتہ رہنے لگے تھے۔ اس کے باوجود کبھی کبھی بادِ شمال کا گزر ہو جاتا اور افسردہ کلیاں مہکنے مسکرانے لگتیں۔ کسی نہ کسی طرح وقت نکال کر 'دوستوں کو جمع کر کے سیر کو نکل جاتے' ان کے ساتھ کھانا کھاتے اور ہنس بول کر وقت گزار لیتے جو ان کا ہمیشہ سے محبوب مشغلہ تھا۔ پی۔ ای۔ این کی جے پور کانفرنس کے بعد فاسٹر علی گڑھ آئے تھے۔ فاسٹر بالطبع کم سخن ہیں' چہرے سے علم کا وقار اور عارف کی گہری سوچ نمایاں رہتی ہے۔ چائے پر ایک شام اچھا خاصا اجتماع ہو گیا۔ کہنے لگے ہندوستان آتا ہوں تو ایک بات کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ کتنے اچھے اور ذہین لوگ جن کو یونیورسٹیوں میں ہونا چاہیے یا ادب کی خدمت کرنا چاہیے' کتنی جگہوں پر پائے جاتے ہیں۔ بات کچھ آگے بڑھی تو بولے تم لوگ بخاری کو (جو اس زمانے میں ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل تھے) اپنی یونیورسٹی میں کیوں نہیں مقید کر لیتے؟ موقع ملتا تو میں ان کو کیمبرج میں گرفتار کر لیتا۔ پھر دبی زبان اور غمگین مسکراہٹ سے یہ بھی کہا کہ وہ وہاں سے دیوار پھاند کر نکل جاتے تو میں کیا کر لیتا۔

آج یہ گفتگو یوں یاد آ رہی ہے کہ بخاری نے اپنا آخری پروگرام یہ بنایا تھا کہ اقوامِ متحدہ کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر امریکہ کی کسی یونیورسٹی سے منسلک ہو جائیں گے لیکن اسے کیا کہیے کہ کسی یونیورسٹی کی دیوار میں مقید ہونے اور پھاندنے سے پہلے ہی وہ زندانِ حیات ہی کی دیوار پھاند گئے۔

پروفیسر احمد شاہ بخاری (پطرس) ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے۔ ان کی باتوں اور تحریروں سے بے شمار لوگوں کے دل خوش ہوئے اور ہوتے رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے اتنی بڑی خدمت لی تو یقیناً ان کو اپنی بیکراں نوازشوں سے سرفراز بھی فرمایا ہو گا"۔

(ہم نفسانِ رفتہ)

سوالات

۱۔ مختصر جواب لکھیے۔

(الف) رشید احمد صدیقی کے نزدیک ظرافت اور ظرافت نگاری کی معراج کیا ہے؟

(ب) مصنف نے پہلے پہل بخاری صاحب کا کونسا مضمون پڑھا تھا اور کہاں؟

(ج) پطرس بخاری نے اپنے مقالے میں کیا پیش کیا جس سے ان کی دھوم مچ گئی؟

(د) بخاری صاحب کن خوبیوں کی بنا پر محفل پر چھا جاتے تھے؟

(ہ) رشید احمد صدیقی کے خیال میں اچھا خط لکھنے کے کیا کیا لوازمات ہیں؟

(و) تقسیم ملک کے بعد بخاری صاحب کس حیثیت سے لاہور واپس آئے تھے؟

(ز) مسٹر فاسٹر بخاری صاحب کو کسی یونیورسٹی میں مُقیّد کر لینا کیوں چاہتے تھے؟

۲۔ جملے مکمل کیجیے:

(الف) یہ بات کس وثوق سے ایسے شخص کے بارے میں کہہ رہا ہوں جس نے اردو میں سب سے ------ سرمایہ چھوڑا ہے۔

(ب) بخاری کی ظرافت عام طور سے ------ ہوتی ہے، ------ نہیں۔

(ج) بخاری فقروں اور لطیفوں کی ------ نہیں کرتے تھے۔

(د) بخاری ایسے یوسف تھے جو کبھی ------ نہیں رہے۔

(ہ) لیکن اس کا بھی تو اندیشہ ہے کہ ہم آپ جب آخرت میں پہنچیں تو ------ اتنا خاطر خواہ نہ رہے۔

(و) اس کے باوجود کبھی کبھی ------ کا گذر ہوتا تو افسردہ کلیاں مہکنے مسکرانے لگتیں۔

(ز) کسی یونیورسٹی کی دیوار میں مقید ہونے اور پھاندنے سے پہلے ہی وہ ------ ہی کی دیوار پھاند گئے۔

۳۔ اس سبق کا خلاصہ اپنے الفاظ میں تحریر کیجیے۔

۴۔ مندرجہ ذیل عبارات کی تشریح سیاق وسباق کے حوالے سے کیجیے۔

(الف) ظرافت نگاری میں ------ ان رموز سے واقف تھے۔

(ب) انھوں نے کہا، ہندوستانی ادیب ------ صَرف ہو رہا ہے۔

(ج) بڑے سے بڑے ذہنوں سے ------ بخاری سے مُفر نہیں۔

(د) امریکہ یا کہیں اور سے ------ دونوں کا اعجاز ہے۔

○☆○☆○☆○☆○☆○

شوکت تھانوی

(۱۹۰۴ء - ۱۹۶۳ء)

شاہین بچے

میرے یہاں خدا کے فضل سے تین شاہین بچے ہیں جو آپ کی دعا سے خاک بازی کی تعلیم حاصل کرنے میں شب و روز مصروف ہیں اور اگر سچ پوچھیے تو میں خداوندانِ مکتب کا ممنون احسان ہوں کہ وہ ان شاہین بچوں کو یہی یقین دلائے ہوئے ہیں کہ وہ ممولے ہیں۔ جس طرح اللہ آمین سے ان کو پروان چڑھا کر مکتب جانے کے قابل بنایا گیا ہے اسی طرح مکتب بھی ان کے لیے بسم اللہ کا گنبد بنا ہوا ہے۔ جہاں ان کو خود اڑنا نہیں سکھایا جاتا بلکہ پروں کی گیند اچھالنا سکھایا جاتا ہے۔ چنانچہ یہ تینوں شاہین بچے جب اسکول سے گھر آتے ہیں تو ایک جال تان کر دن چھپے تک بیڈمنٹن کھیلا کرتے ہیں اور وہ پروں والی گیند ان کے درمیان اچھلا کرتی ہے۔ جب تمام شٹل کاک خراب ہو جاتے ہیں تو ان شاہین بچوں کی ماں مجھ سے کہتی ہے کہ :

پھر ان شاہین بچوں کو بال و پَر دے

اور میں تو اسی دن ایک درجن شٹل کاک بازار جاکر خرید لاتا ہوں۔ اور خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ یہ شاہین بچے نہایت محفوظ قسم کا کھیل کھیلتے ہیں، جس میں نہ کوئی جان جوکھم کا معاملہ ہے نہ منہ ٹوٹنے اور سر پھوٹنے کا کوئی اندیشہ۔ اگر بارش ہوگی اور پروں والی گیند کی پرواز میں کوتاہی واقع ہوگی تو یہ شاہین بچے ایک بڑی سی میز پر جال تان کر چھوٹی چھوٹی تھاپیوں سے سلولائڈ[۱] کی ہلکی پھلکی گیند سے ٹیبل ٹینس کھیلتے ہیں جس کو وہ پنگ پانگ[۲] کہتے ہیں۔ یہ کھیل بھی کچھ خطرناک نہیں ہے کہ چوٹ چپٹ کا اندیشہ ہو۔ یا مثلاً کیرم ہے، یہ بھی محفوظ قسم کا کھیل ہے کہ انگلی ذرا بچا کر اسٹرائکر[۳]

۱۔ Celluloid

۲۔ Ping-Pong

۳۔ Striker

چلایا جائے تو کسی قسم کے گزند کا امکان نہیں۔ بڑا شاہین بچہ چونکہ کالج میں پڑھتا ہے لہٰذا وہ کبھی کبھی بلیئرڈ[1] کھیلنے بھی چلا جاتا ہے یا اپنے احباب کو بلا کر جو اتفاق سے سب کے سب شاہین بچے ہیں، تاش وغیرہ کھیل لیتا ہے۔ اس میں نقصانِ مایہ تو ہے بلکہ شماتتِ ہمسایہ[2] بھی ہے۔ مگر یہی کیا کم ہے کہ زندگی کے لیے کوئی خطرہ نہیں۔ اور جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ جان کا صدقہ مال ہے۔ لہٰذا میں اسی کو غنیمت سمجھتا ہوں کہ وہ کھیل کر کچھ ہار جاتا ہے مگر ہاکی اور کرکٹ قسم کے خطرناک کھیل تو نہیں کھیلتا۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ قمار بازی ہے مگر میں کہتا ہوں کہ اس زمانہ میں یہی کیا کم ہے کہ کوئی جان کی بازی نہ لگائے جب تک میں کما رہا ہوں۔

میں اپنے اوپر زمانے کی تمام سختیاں ان ہی شاہین بچوں کے لیے جھیلتا ہوں کہ ان کا بال بیکا نہ ہو۔ جاڑے کی ٹھٹھرا دینے والی راتوں میں لحاف ایسی نعمت کو چھوڑ کر میز پر بیٹھا دماغ کو ان ہی کے آرام کے لیے تو نچوڑا کرتا ہوں کہ ان کے لیے سویٹر سے لے کر چسٹر تک ہر چیز اعلیٰ درجہ کی میسر آسکے اور جب مئی جون کی آگ برسانے والی گرمی انسان کو بھون کر رکھ دیتی ہے۔ میں ان شاہین بچوں کے لیے خس خانہ اور برفاب کو کافی نہیں سمجھتا بلکہ اپنی تکلیف کا خیال کیے بغیر ان سے یہی کہتا ہوں کہ:

تُو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

اور ان کو پہاڑ پر بھیج کر خود اسی جہنم میں بدستور محنت کرتا رہتا ہوں کہ ان کے پہاڑ کے اخراجات برابر بھیجتا رہوں اگر وہ کہتے بھی ہیں: "آپ نہیں چلیں گے پہاڑ پر۔" تو کہہ دیتا ہوں کہ میں تم کو محض اس لیے شاہین بچہ کہتا ہوں کہ تم مجھ کو کرگس ہی سمجھتے رہو۔

میرے یہ شاہین بچے تکلیف اٹھانے کے عادی نہیں ہیں۔ فاقہ تو خیر خدا دشمن پر بھی نہ ڈالے یہ شاہین بچے تو موٹا جھوٹا بھی نہیں کھا سکتے۔ کھانا تو درکنار اگر

1۔ Billiard

2۔ کسی کے نقصان پر خوش ہونا۔ خندہ زنی۔

چائے کا وقت بھی ٹل جائے تو ان کے دشمنوں کی حالت غیر ہو جاتی ہے۔ جمائیاں اور انگڑائیاں لینا شروع کر دیتے ہیں۔ پھر بھی چائے نہ ملے تو درد سر اور اگر درد سر کے بعد بھی چائے میسر نہ آئے تو حرارت، حرارت کے بعد بخار اور پھر بخار تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ہزاروں طرح کا ہوتا ہے۔ لہٰذا طے یہ ہے کہ ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے مگر ان کو وقت پر چائے ضرور ملنا چاہیے۔ پھر چائے بھی نگوڑی ناٹھی[1] قسم کی نہیں، خالی چائے تو کلیجے پر لگتی ہے، تیر کی طرح۔ کچھ نہ کچھ تو چائے کے ساتھ کھانا ہی چاہیے اور اس کچھ نہ کچھ کے ذیل میں کیک، پیسٹری، بسکٹ، مختلف قسم کے پھل سب ہی کچھ آتے ہیں۔ رہ گیا کھانا وہ اگر ان شاہین بچوں کو اچھا نہ ملے گا تو یہ نازونعم میں پلے ہوئے اپنی صحت کیوں کر برقرار رکھ سکیں گے۔ صحت تو خیر روٹی اور سالن سے بھی برقرار رہتی ہے، مگر دل کمزور ہو جاتا ہے۔ یہ محسوس کر کے کہ یہ غریبوں کا کھانا ہے اور امیروں کے دسترخوان پر انواع واقسام کی چیزیں ہوتی ہیں لہٰذا ان شاہین بچوں کو ضعف قلب سے بچانے کے لیے کھانے کا بھی معقول ہی انتظام کرنا پڑتا ہے تاکہ ان کو باپ کے ہوتے ہوئے کبھی یتیمی کا احساس نہ پیدا ہو اور باپ کے گھر کو وہ یتیم خانہ سمجھ کر دل شکستہ نہ ہو جائیں۔

یہ قاعدے کی بات ہے کہ اچھا کھانے والے اچھا پہننا بھی چاہتے ہیں۔ اکثر لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ اپنے لباس میں ہر طرح کا تکلف برتتے ہیں مگر اولاد کو کچھ اس طرح پہناتے اوڑھاتے ہیں کہ وہ کچھ لے پالک یا سوتیلی سی اولاد نظر آتی ہے۔ اس قسم کے بچے ابتدا ہی سے احساسِ کمتری کا شکار ہو کر کرگس زادے تو خیر بن جاتے ہیں مگر شاہین بچے نہیں بن سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اپنے شاہین بچوں کو اپنی اوقات سے زیادہ شاندار لباس بھی مہیا کرتا ہوں اور وہ بھی ایسے تمیزدار ہیں کہ کیا مجال کہ نیلے سوٹ پر براؤن جوتا یا کریم رنگ کے پتلون پر سیاہ بوٹ کو پہن لیں۔ ایسے جامہ زیب بچے آپ کو مشکل ہی نظر آئیں گے۔ میری آنکھوں میں خاک میں نے اس لیے عرض کیا کہ ماں باپ کی نظر سب سے زیادہ اولاد کو لگتی ہے۔ پھر یہ کہ میرے شاہین بچے اس

---

[1] فضول۔ عام سی۔ گھٹی ۔ ناکارہ

قدر نفاست پسند ہیں کہ اگر آپ ان میں سے کسی کی ڈریسنگ ٹیبل دیکھ لیں تو دنگ رہ جائیں۔ کنگھا تو میز پر کیا معنی وہ جیب میں بھی رکھتے ہیں۔ آئینے اور کنگھے کے علاوہ بے شمار شیشیاں ڈبے اور ڈبیاں آپ کو ان کی ڈریسنگ ٹیبل پر بجی ہوئی نظر آئیں گی۔ رات کو لگانے کی کریم الگ ہے، صبح کو لگانے کی اسنو الگ، ناخن تیز کرنے کے اوزار، بالوں میں چھلے بنانے کے کل پرزے، بھنوؤں کا تناسب قائم رکھنے کے لیے بال کی کھال نکالنے والی قینچیاں، لبوں پر لگانے کے لیے خاص قسم کے موم روغن، مختصر یہ کہ ایک دکان سی بجی ہوئی نظر آئے گی اور یہ تمام چیزیں محض اس لیے مہیا کرنی پڑتی ہیں کہ شجرہ تو ان کے گلے میں لٹکایا نہیں جا سکتا، صورت ہی سے شرافت برسائی جا سکتی ہے کہ دیکھنے والے ایک ہی نظر میں بھانپ لیں کہ ہاں یہ ہیں نجیب الطرفین شاہین بچے۔

اس طرح تو ان شاہین بچوں کو پروان چڑھایا گیا ہے اور مرزا صاحب سے جو پوچھا کہ بڑے بچے کو آخر کس کام سے لگایا جائے کالج سے نکلنے والا ہے تو عقل مندی ملاحظہ ہو فرماتے ہیں کہ:

"قبلہ میری تو یہ رائے ہے کہ ایئرفورس میں بھیج دیجیے۔"

ایئرفورس کا نام سن کر ہوش اڑ گئے۔ یعنی ہوائی جہاز کی نوکری چہ خوش؟ عرض کیا: "مرزا صاحب میں نے تو یہ سمجھ کر آپ کی رائے طلب کی تھی کہ آپ ماشاء اللہ خود صاحب اولاد ہیں، اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر مشورہ دیں گے مگر آپ نے تو عجیب بات فرمائی ہے۔"

مرزا صاحب نے اسی استغنا سے فرمایا: "میں نے تو اپنے نزدیک بہترین مشورہ دیا ہے۔ صاحبزادے کی ماشاء اللہ صحت بھی اچھی ہے۔ چشم بدور ہاتھ پیر کے بھی اچھے ہیں۔ ان کے لیے ایئرفورس میں ترقی کے بڑے امکانات ہیں اور اگر سچ پوچھیے تو ہمارے ایئرفورس میں ایسے ہی نوجوانوں کی ضرورت ہے۔"

عرض کیا: "ترقی گئی بھاڑ میں۔ مرزا صاحب ذرا غور تو فرمائیے کہ میں اپنے ہاتھوں اپنے جگر کے ٹکڑے کو بھلا کیوں کر ایئرفورس میں جھونک سکتا ہوں کہ جاؤ بیٹا اپنی جان سے دور، اڑ جاؤ۔ ہے ہے تصور کر کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، طرح

طرح کے ہول آنے لگے ہیں' یہ آپ نے کیا مشورہ دیا ہے؟"

مرزا صاحب نے فرمایا: "لَاحَولَ وَلَاقُوَّۃَ - کس قدر فرسودہ تخیل ہے آپ کا بھی۔ اے جناب اب وہ زمانہ گیا جب ان لاڈلوں کو روئی کے گالوں میں پٹاری کے انگور کی طرح سینت سینت کر رکھا جاتا تھا۔ اب آپ ایک آزاد اور خود مختار ملک کے شہری ہیں"۔ گھبرا کر عرض کیا: "دیکھو بھئی مرزا! اولاد کے معاملے میں تو یہ سیاسی باتیں مجھ سے کرو نہیں۔ مجھے ہوتی ہے الجھن۔ میں سیاست کا بس اتنا ہی قائل ہوں کہ جتنا چاہو مجھ سے چندہ لے لو۔ کوئی مر جائے کالی شیروانی پہنا دو مجھ کو۔ کوئی سیاسی جشن ہو گھر پر چراغاں کرنے کو میں موجود ہوں۔ مگر چندے میں اولاد نہیں دے سکتا۔ یہ آپ نے کیا منہ بھر کہ دیا کہ ایئر فورس میں بھیج دوں"۔

مرزا صاحب پھر بھی قائل نہ ہوئے۔ جوتوں سمیت آنکھوں میں گھُس کر بولے: "بندہ نواز' اب یہ خود نگری اور خود شناسی کا دَور ہے۔ اب قوم کا ہر فرد سپاہی ہے۔ ملت کا ہر نوجوان ملت کے مقدر کا ستارہ ہے۔ اگر آپ اسی طرح شاہین بچوں کو ممولا بنائے رکھیں گے اور شہباز بننے سے روکیں گے تو آخر ہمارا مستقبل کیا ہو گا؟"

الجھ کر عرض کیا: "خیر میں آپ سے بحث تو کرنا نہیں چاہتا' میں تو یہ پوچھ رہا تھا کہ ان کے لیے وکالت اچھی رہے گی یا ڈاکٹری؟"

مرزا صاحب نے فرمایا: "ڈاکٹری بھی اچھی ہے۔ اس وقت ہم کو ڈاکٹروں کی بے حد ضرورت ہے اور اس ضرورت کو پورا کرنا ان بزرگوں کا فرض ہے جو اپنے بچوں کو ڈاکٹری کی تعلیم دلوانے کی استطاعت رکھتے ہیں۔"

عرض کیا: "ڈاکٹری کے فوائد تو میں خود جانتا ہوں۔ نہایت شریف پیشہ ہے اور اگر چل نکلی ڈاکٹری تو دولت قدم بھی چومے گی۔ مگر قباحت یہ ہے کہ صاحبزادے واقع ہوئے ہیں نہایت کمزور دل کے۔ ایک مرتبہ مرغ ذبح ہوتے دیکھ لیا اب سے دور ایک ہفتہ تک بخار آتا رہا' سوتے میں اچھل اچھل پڑتا تھا۔ ڈاکٹری میں چیر پھاڑ کیسے کریں گے۔ اور بھئی سنا ہے کہ لاشوں کو چیرنا پھاڑنا پڑتا ہے۔"

مرزا صاحب نے فرمایا: "جی ہاں یہ تو ہے، مگر اس میں مضائقہ کیا ہے۔"

عرض کیا: "جو مضائقہ ہے، اس کو افسوس یہ ہے کہ تم سمجھ ہی نہیں سکتے۔ بہرحال ڈاکٹری سے تو باز آیا میں۔ رہ گئی وکالت، ویسے تو اس پیشے میں کوئی خرابی نہیں، مگر ایک بات سے ذرا ڈر لگتا ہے کہ اگر خدانخواستہ وکالت نہ چلی اور صاحبزادے بن گئے کچھ لیڈر ویڈر تو میں کیا کروں گا؟"

مرزا صاحب عقل کے ذرا واجبی ہی سے ہیں۔ آنکھیں پھاڑ کر بولے: "تو اور کیا چاہیے، آپ کو، اگر صاحبزادے لیڈر بن جائیں اور ان کو عوام اپنا رہنما تسلیم کر لیں تو اس سے زیادہ آپ کے لیے باعث فخر اور کون سی بات ہو سکتی ہے۔"

سمجھاتے ہوئے عرض کیا: "میاں بات سمجھنے کی کوشش کیا کرو۔ لیڈر کوئی بے وفا ہی نہیں بن جاتا، اس کے لیے بڑے پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں۔ صرف زندہ باد ہی کے نعرے بلند نہیں ہوتے، مردہ باد کے نعرے بھی ہم نے سنے ہیں۔ صرف پھول ہی نچھاور نہیں کیے جاتے، جوتے بھی اچھالے جاتے ہیں۔ خوش آمدید ہی نہیں کہا جاتا، واپس جاؤ بھی کہا جاتا ہے۔ جلوس ہی نہیں نکلتا، کالی جھنڈیاں بھی دکھائی جاتی ہیں۔ خیر یہ سب کچھ بھی سہی، مگر لیڈر بننے کے لیے پولیس کے ڈنڈے بھی کھانا پڑتے ہیں کبھی کبھی اور شیطان کے کان بہرے، جیل میں چکی بھی پیسنا پڑتی ہے۔ بس میں ان ہی باتوں سے ذرا ڈرتا ہوں اور چونکہ میں نے وکیلوں، بیرسٹروں، ہی کو زیادہ تر لیڈر بنتے ہوئے دیکھا ہے لہٰذا وکالت سے کچھ دل کھٹا سا ہو گیا ہے"۔

مرزا صاحب نے گویا تمسخر سے فرمایا: "اس قسم کے اندیشے تو کم و بیش ہر مشغلے میں موجود ہیں، اور یہ نشیب و فراز تو عملی زندگی میں ہر ایک کے لیے موجود ہیں۔ زیادہ محتاط طریقہ تو یہ تھا۔ کہ اس زمانے میں ان صاحبزادوں کو پیدا ہی نہ کیا جاتا"۔

عرض کیا: "خیر اب تو پیدا ہو ہی گئے ہیں، لہٰذا کچھ کرنا پڑے گا۔ میں کہتا ہوں کسی مقابلے کے امتحان میں کیوں نہ بٹھا دوں؟"

مرزا صاحب نے کہا: "بڑا اچھا خیال ہے۔ مگر ان امتحانوں میں بھی اس قسم

کی خطرناک وادیوں سے گزرنا ہی پڑے گا۔ مثلاً پولیس کی ملازمت کو آپ کیا سمجھتے ہیں؟"

کانوں پر ہاتھ رکھ کر عرض کیا: "اجی توبہ کیجیے مرزا صاحب۔ ہتھیلی پر جان لیے پھرتے ہیں یہ بیچارے پولیس والے۔ ایسی بھی سرفروشی کیا کہ انسان واقعی سر کاٹ کر بیچنا شروع کر دے۔ ایک سے ایک خونخوار بدمعاش سے آئے دن سابقہ پڑتا ہے۔ پھر یہ کہ ایسی سخت ڈیوٹی کہ نہ دن کو دن سمجھو نہ رات کو رات۔ صاحب آدھی رات تک تو یہ پولیس والے گشت لگاتے پھرتے ہیں۔ بلوہ ہو جائے تو گولیوں کی بارش میں سینہ تان کر جاؤ۔ ان صاحبزادے نے تو آج تک شب برات کی آتش بازی بھی اپنے ہاتھ سے نہیں چھڑائی' یہ پستول کیوں کر چلائیں گے اور اس قسم کی بے شمار باتیں ہیں جن کو میں مناسب نہیں سمجھتا۔ مثلاً گھوڑے کی سواری کو میں نہایت غلط سمجھتا ہوں یا گھوڑے کی جگہ پر وہ جو موٹر سائیکل آج کل نکلی ہے وہ اور بھی خطرناک۔"

مرزا صاحب نے پھر چٹکیوں میں اڑایا: "اگر پولیس آفیسر ڈولی میں بیٹھا کریں اور وردی میں چوڑیاں بھی ہوں تو غالباً کوئی مضائقہ نہ ہو گا۔"

جل کر عرض کیا: "برادرم! آپ تو خیر مذاق فرما رہے ہیں۔ یہ تو اپنے اپنے دل کی بات ہے۔ میرا دل ایسا مضبوط نہیں ہے کہ اس بچے کے لیے میں ایسی ملازمت کو موزوں سمجھوں جس میں بس بدمعاشوں ہی سے واسطہ پڑے۔ خواہ وہ بدمعاش انسان ہوں یا بدمعاش گھوڑے۔ مجھ کو تو اس کے لیے ایسے مشغلے کی ضرورت ہے جس میں امن وامان کے ساتھ زیادہ نہیں تو بس اتنا پیسہ مل جائے کہ جس طرح کی زندگی میں نے اس کو بسر کرائی ہے' وہ خود بھی بسر کر سکے۔" مرزا صاحب بولے: "بندہ پرور آپ نے تو بچوں کو مرزا پھویا[1] بنا کر رکھ دیا ہے۔ اب وہ زمانہ آگیا ہے کہ مُردوں کو مرد بن کر رہنا پڑے گا۔ وہ گہواروں میں جھولنے کا زمانہ گیا۔ اب آپ ایک آزاد قوم کے فرد ہیں اور قوم کی یہ آزادی اس وقت تک برقرار رہ سکتی ہے جب تک قوم کے ہر فرد میں اس آزادی کے تحفظ کا صرف جذبہ ہی نہیں بلکہ بل بوتا بھی موجود ہے۔ ہر شخص ملت

---

[1] نہایت نازک اندام آدمی' لاغر' دبلا پتلا۔ آرام طلب۔ تن آسان آدمی

کا جانباز سپاہی بن کر رہے گا۔ اب ملت کے افراد موت سے ٹکرا ٹکرا کر زندگی کے حقوق حاصل کریں گے۔ یہ عملِ پیہم کا زمانہ ہے۔ یہ جدوجہد کا دور ہے۔ یہ ہم کو تلافی مافات کا موقعہ ملا ہے اور اگر اس وقت بھی ہمارا یہی عالم رہا جو آپ کا میں دیکھ رہا ہوں تو پھر خدا ہی حافظ ہے ہمارا"۔

عرض کیا: "بھائی جان' آپ تو یہ باتیں کچھ کتابوں کی دنیا کی کر رہے ہیں۔ اس قسم کی باتیں کتابوں میں تو خیر پڑھی جا سکتی ہیں مگر ان پر عمل ذرا مشکل سے ہو سکتا ہے۔"

مرزا صاحب بات کاٹ کر بولے: "عمل کیوں نہیں ہو سکتا ہے۔ آپ کے سامنے ہی مثال موجود ہے کہ میں نے اپنے دو بڑے بچوں کو نیوی میں بھیج دیا ہے' دو چھوٹے بچے ایئر فورس کے لیے تیار کر رہا ہوں۔ آخر ان بچوں کو بھی میں کہیں سے اٹھا تو نہیں لایا تھا' اولاد ہی تو ہیں۔ مگر میں اولاد کے ساتھ جو بہتر سے بہتر سلوک کر سکتا تھا وہ یہی تھا جو میں نے عرض کیا۔"

عرض کیا: "یہ سلوک کیا کہ ان کو جان بوجھ کر ایسے محکموں میں بھیج دیا کہ خدا ہی ان کا حافظ ہے۔ اصل میں یہ بڑی ہی غلطی تھی کہ میں آپ سے مشورہ کرنے بیٹھ گیا۔ جس نے خود اپنے بچوں کے ساتھ یہ سلوک کیا ہو وہ دوسرے کی اولاد کے لیے دل میں کیا درد رکھ سکتا ہے"؟

مرزا صاحب نے پھر بنانے کی کوشش کی: "میری رائے میں تو آپ صاحبزادوں کو ایک ایک دودھ کی شیشی خرید کر ایک ایک کھلائی کے سپرد کر دیں کہ ان کو لوریاں سناتی رہو۔ اس لیے کہ ان ہی کو پاکستان کا امین بننا ہے اور یہی اس آزادی کے محافظ ہوں گے۔" مرزا صاحب تو اسی قسم کی جلی کٹی سنا کر تشریف لے گئے۔ عجیب پتھر دل پایا ہے اس شخص نے بھی۔ مگر اب ہر ایک تو ایسا نہیں ہو سکتا۔ بھلا غور تو کیجیے' وہ بچے دھوپ میں کملا جائیں' جو ٹھنڈی ہوا میں چھینکیں لینے لگیں۔ ان کے لیے آپ تجویز فرماتے ہیں' ایئر فورس' پولیس کی نوکری' فوج اور سپہ گری۔ سبحان اللہ' دروازہ زور سے بند ہو جائے تو وہ اچھل پڑتے ہیں' ننھا سا دل دھڑکنے لگتا ہے۔ بھلا وہ

پستول اور بندوق سے کیونکر کھیل سکیں گے۔ اور صاحب سو باتوں کی ایک بات تو یہ کہ اپنے جیتے جی تو یہ ہو نہیں سکتا کہ ان کو آنکھ بند کر کے جھونک دیا جائے کسی ایسے محکمے میں۔ بلکہ اگر وہ خود اس قسم کا ارادہ کریں بھی تو میں یہی کہوں گا:

اللہ آمیں سے ہم تو یوں پالیں
آپ آفت میں جان کو ڈالیں

یہاں زندگی کے لالے پڑے ہیں جی۔ بچپن میں یہی بہت ہے۔ اگر یہی روزگار رہ گئے ہیں تو ان کے لیے بے کاری بھلی۔

(خدانخواستہ)

سوالات

مختصر جواب لکھیے۔

۱۔ (الف) جب تمام شٹل کاک خراب ہو جاتے ہیں تو شاہین بچوں کی ماں کیا کہتی ہے؟

(ب) شاہین بچے کیا کیا کھیل رغبت سے کھیلتے ہیں؟

(ج) شاہین بچوں کو اگر وقت پر چائے نہ ملے تو ان کی کیا حالت ہوتی ہے؟

(د) مصنف اپنے شاہین بچوں کو اپنی اوقات سے بڑھ کر شاندار لباس مہیا کرنے کی کوشش کیوں کرتا ہے؟

(ہ) شاہین بچوں کی ڈریسنگ ٹیبل پر میک اپ کی کون کون سی چیزیں موجود رہنا ضروری ہیں؟

(و) مصنف کو اپنے شاہین بچے کے لیے ایئر فورس کی ملازمت کیوں ناپسند تھی؟

(ز) مصنف اپنے شاہین بچے کو ڈاکٹری کی تعلیم دلانے سے کیوں گریزاں تھے؟

(ح) وکالت کے پیشے سے مصنف کا دل کیوں کھٹا تھا؟

(ط) مصنف کو پولیس کی ملازمت میں کیا کیا قباحتیں نظر آئیں؟

۲۔ مصنف نے اس طنزیہ ومزاحیہ مضمون میں علامہ اقبال کے جن زبان زد خاص وعام اشعار کو ذہن میں رکھ کر مزاح پیدا کیا ہے انھیں اسی ترتیب سے لکھیے۔

۳۔ مندرجہ ذیل محاورات کو جملوں میں استعمال کیجیے۔

رونگٹے کھڑے ہونا' جان کی بازی لگانا' بال بیکا ہونا' پاپڑ بیلنا' جوتے اچھالنا' دماغ نچوڑنا' دل شکستہ ہونا' شیطان کے کان بہرے' دل کھٹا ہونا' زندگی کے لالے پڑنا' چٹکیوں میں اڑانا' ہتھیلی پر جان لیے پھرنا' مرزا پھویا بنانا' جلی کٹی سنانا۔

۴۔ ''شوکت تھانوی درحقیقت نوجوان نسل کے لیے ''شاہین بچے'' کی ظرافت میں چھپی ایک شدید تمنا رکھتے ہیں''۔ وہ تمنا کیا ہے؟ مختصر طور پر اظہار خیال کیجیے۔

○☆○☆○☆○☆○☆○

مرزا فرحت اللہ بیگ

(۱۸۸۴ء - ۱۹۴۷ء)

دہلی کا ایک یادگار مُشاعَرہ

جب میں پہنچا تو استاد صحن میں بان کی کھرّی چارپائی پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ دوسری چارپائی پر ان کے چہیتے شاگرد حافظ غلام رسول ویران بیٹھے تھے۔ یہ اندھے ہیں اور ان ہی سے ہوشیار رہنے کے لیے حضرت جہاں پناہ نے ارشاد فرمایا تھا۔ استاد ذوق قدو قامت میں متوسط اندام ہیں، رنگ اچھا سانولا ہے، چہرے پر چیچک کے بہت داغ ہیں، آنکھیں بڑی بڑی اور روشن اور نگاہیں تیز ہیں۔ چہرے کا نقشہ کھڑا کھڑا ہے۔ اس وقت سفید تنگ پاجامہ، سفید کرتا اور سفید ہی انگرکھا پہنے ہوئے تھے۔ سر پر گول چندوے کی ململ کی ٹوپی تھی۔ میرے پاؤں کی آہٹ سنتے ہی حافظ ویران نے چونک کر کہا: "کون ہے؟" میں نے کہا: "کریم الدین استاد ذوق کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔" استاد نے اپنا نام سن کر کہا: "آیئے آیئے اندر تشریف لایئے۔" میں نے آداب عرض کیا۔ انھوں نے فرمایا: "بیٹھو بھئی بیٹھو۔" میں حافظ ویران کے پاس چارپائی پر بیٹھ گیا۔ کہا: "فرمایئے کیسے تشریف لانا ہوا؟" میں نے عرض کی: "میرا ارادہ قاضی کے حوض پر ایک مُشاعَرہ شروع کرنے کا ہے۔ ۱۴ رجب تاریخ مقرر ہوئی ہے۔ اگر حضور بھی از راہ بندہ نوازی قدم رنجہ فرمائیں تو بعید از کرم نہ ہو گا۔" میرا اتنا کہنا تھا کہ حافظ ویران تو چراغ پا ہو گئے۔ کہنے لگے: "جایئے جایئے کہاں کا مشاعرہ نکالا ہے۔ استاد کو فرصت نہیں ہے۔ ان مرزا لے پالک[1] کے پاس کیوں نہیں جاتے۔ جو خواہ مخواہ ان کو آکر دق کرتے ہو۔" استاد نے کہا: "حافظ ویران! تمھاری زبان نہیں رکتی، بیٹھے بٹھائے تم دنیا بھر سے لڑائی مول لیتے ہو۔" حافظ ویران کہنے لگے: "استاد، جب آپ کو برا بھلا کہیں تو ہم کیوں چپ بیٹھنے لگے۔ وہ ایک کہیں گے تو ہم سو سنائیں گے۔" استاد ہنس کر فرمانے لگے: "نہ بھئی نہ تم میری وجہ سے کیوں بلا میں پڑتے ہو جس کا جو

---

[1] مرزا غالب کی طرف اشارہ ہے۔

جی چاہے سو کہے۔" میں نے عرض کی: "میں کل بارگاہِ ظلِّ سُبحانی میں حاضر ہوا تھا۔ حضرت ظلِ اللہ نے ارشاد فرمایا تھا کہ اس مُشاعرے میں ہم مرزا فتح الملک بہادر کو اپنی طرف سے بھیجیں گے اور اپنی غزل بھیج کر مُشاعرے کی عزت بڑھائیں گے اور یہ بھی ارشاد ہوا تھا کہ استاد ذوق سے بھی کہہ دیں گے، وہ بھی مشاعرے میں ضرور آئیں گے۔" یہ سن کر حافظ ویران تو ٹھنڈے پڑ گئے۔ استاد نے فرمایا: "ہاں بھئی مجھے یاد آگیا کل شام کو حضرت پیرو مرشد نے مجھ سے بھی فرمایا تھا اور یہ بھی ارشاد ہوا تھا کہ تو بھی ضرور جائیو، میاں میں اِنْ شَاءَ اللہ تعالیٰ ضرور آؤں گا مگر یہ تو بتاؤ طرح[1] کیا رکھی ہے؟" میں نے واقعہ عرض کیا اور کہا کہ حضرت ظلِ سُبحانی نے طرح کا جھگڑا ہی نکال دیا ہے۔ جو شخص جس بحر اور جس ردیف قافیے میں چاہے آکر غزل پڑھے۔" استاد تو "بہت خوب بہت خوب" کہتے رہے، مگر حافظ ویران کی تیوری کے بل نہیں گئے۔ برابر بڑبڑاتے ہی رہے۔ کہ "اللہ خیر کرے دیکھیے اس مُشاعرے کا کیا ہوتا ہے۔ حضرت پیرو مرشد بھی بیٹھے بیٹھے اُشقلے[2] چھوڑا کرتے ہیں۔" وہ اپنی کہے گئے میں تو اٹھ سلام کر چلا آیا۔

دوسرا حملہ اسد اللہ خاں غالب پر تھا۔ چاندنی چوک سے ہوتا ہوا بَلّی ماروں میں آیا۔ حکیم محمود خاں صاحب کے مکان کے سامنے سے قاسم جان کی گلی گئی ہے۔ بائیں طرف پہلا ہی مکان ان کا تھا۔ یہ مکان مسجد کے پیچھے ہے۔ اس کے دو دروازے ہیں ایک مردانہ دوسرا زنانہ۔ محل سرا کا ایک راستہ مردانے مکان میں سے بھی ہے۔ باہر کے دروازے کی دہلیز ذرا دھنسی ہوئی سی ہے۔ دروازے کے اوپر ایک کمرہ ہے اور کمرے کے دونوں پہلوؤں میں دو کوٹھڑیاں۔ گرمی میں مرزا صاحب دوپہر کے وقت اسی ایک کوٹھڑی میں رہا کرتے تھے۔ دروازے سے گزر کر مختصر سا صحن ہے اور سامنے ہی دالان در دالان۔ جب میں پہنچا تو اندر کے دالان میں گاؤ تکیے سے لگے بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔

مرزا نوشہ کی عمر کوئی پچاس سال کی ہوگی۔ حسین اور خوش رُو آدمی ہیں۔

---

[1] یہاں طرح سے مراد طرح مصرعہ ہے جس کے مطابق مشاعرے میں شاعر اپنی غزل یا نظم کہتے ہیں۔
[2] دہلی میں یہ لفظ عام طور پر شگوفے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

قد اونچا اور ہاڑ بہت چوڑا چکلا، موٹا موٹا نقشہ اور سرخ و سفید رنگ ہے، لیکن اس میں کچھ کچھ زردی جھلکتی ہے۔ ایسے رنگ کو محاورے میں چمپئی کہا جاتا ہے۔ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے ہیں۔ ڈاڑھی بڑھی ہوئی مگر گھنی نہیں ہے۔ سر منڈا ہوا، اس پر سیاہ پوستین کی ٹوپی ہے جو کلاہ پاپاخ سے ملتی جلتی ہے۔ ایک بر کا سفید پاجامہ، سفید ململ کا انگرکھا، اس پر ہلکے زرد زمین کی جامہ وار کا چغہ۔ میری آہٹ پاکر لکھتے لکھتے آنکھ اونچی کی۔ میں نے آداب کیا۔ سلام کا جواب دیا اور آنکھوں سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں ایک طرف بیٹھ گیا۔ ابھی بیٹھا ہی تھا کہ نواب ضیاء الدین احمد خاں آگئے۔ یہ امین الدین خاں صاحب نواب لوہارو کے بھائی ہیں۔ ریختے میں رخشاں اور فارسی میں نیر تخلص کرتے ہیں۔ کوئی چالیس سال کی عمر ہے۔ انشا پردازی، جغرافیہ، تاریخ، علم الانساب، اسماء الرجال، تحقیق لغات اور واقفیت عامہ میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ مرزا نوشہ کے خلیفہ ہیں۔ چھوٹا قد، بہت گورا رنگ، نازک نازک نقشہ، غلافی آنکھیں، چگی ڈاڑھی، چھریرا بدن، غرض نہایت خوب صورت آدمی ہیں۔ ایک بر کا سفید پاجامہ اور سفید ہی انگرکھا زیب بدن تھا۔ قالب چڑھی ہوئی چوگوشیہ ٹوپی سر پر تھی۔ ایک بڑا رومال سموسا بنا کر کندھے پر ڈالے ہوئے تھے۔ میں نے اٹھ کر سلام کیا۔ انھوں نے بڑھ کر مصافحہ کیا اور خاموش ایک طرف دوزانو نہایت ادب سے بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر میں مرزا غالب لکھنے سے فارغ ہوئے۔ پہلے نواب صاحب کی طرف مڑے اور کہنے لگے : "میاں نیر تم کس وقت آبیٹھے؟ بھئی اس مرزا تفتہ نے میرا ناک میں دم کر دیا ہے۔ ظالم کی طبیعت کی روانی کسی طرح کم نہیں ہوتی۔ ہر خط میں آٹھ دس غزلیں اصلاح کے لیے بھیج دیتے ہیں۔ اصلاح دیتے دیتے تھک جاتا ہوں"۔ میری طرف دیکھ کر کہا : "آپ شاید مولوی کریم الدین صاحب ہیں۔" میں نے کہا : "جی ہاں۔" فرمانے لگے : "حضرت آپ کے تشریف لانے کی مجھے پہلے ہی سے اطلاع مل گئی تھی۔ کل ہی میاں عارف آکر مجھ سے مشاعرے میں چلنے کا وعدہ لے گئے ہیں۔ کہو میاں نیر تم بھی چلو گے؟۔" نواب صاحب نے کہا : "جہاں آپ وہاں میں۔ آپ تشریف لے جائیں گے تو ان شاء اللہ میں بھی ضرور ہمراہ رہوں گا۔ مرزا صاحب نے پوچھا : "مگر بھئی اب تک علائی نہیں آئے، مجھ کو ان کا کل سے انتظار ہے۔ اے لو! وہ آ ہی گئے، بھئی بڑی عمر ہے، ابھی میں تم کو

پوچھ رہا تھا۔"

نواب علاء الدین خاں علائی نواب لوہارو کے ولی عہد ہیں۔ کوئی تئیس، چوبیس سال کی عمر ہے۔ متوسط قد، گندمی رنگ، موٹا موٹا نقشہ گول چہرہ، شربتی آنکھیں اور گھنی چڑھی ہوئی ڈاڑھی ہے۔ لباس میں ململ[1] کا تنگ مہری کا پاجامہ، سفید کامدانی[2] کا انگرکھا، اس پر سینہ کھلی ہوئی سیاہ مخمل کی نیم آستین اور سر پر سیاہ مخمل کی چوگوشیہ ٹوپی تھی۔ وہ بھی آداب کر کے ایک طرف بیٹھ گئے اور کہا "واقعی آج دیر ہو گئی، مجھے خود خیال تھا آپ انتظار کر رہے ہوں گے۔" میری طرف دیکھ کر کہا: "آپ کی تعریف؟" مرزا نوشہ نے تمام قصہ بیان کیا اور کہا علائی تم کو بھی چلنا ہو گا۔ ابھی تو شاید تم لوہارو نہیں جا رہے ہو۔ انھوں نے کہا: "بہت خوب آپ تشریف لے جائیں گے تو میں بھی حاضر ہوں۔" جب یہ مرحلہ بھی طے ہو گیا تو میں نے اجازت چاہی۔

کھانا کھا کر تھوڑی دیر سو رہا۔ چار بجے کے قریب اٹھ کر حکیم مومن خاں کے ہاں جانے کی تیاری کی۔ حکیم صاحب کا مکان چیلوں کے کوچے میں ہے۔ راستے میں مولوی امام بخش صاحب صہبائی مل گئے۔ یہ کالج میں میرے استاد رہے ہیں۔ کھلا ہوا گندم گوں رنگ ہے، منہ پر کہیں کہیں چیچک کے داغ ہیں۔ سر پر پٹھے[3] ہیں۔ بڑے دبلے پتلے آدمی ہیں۔ کوئی چالیس سال کی عمر ہو گی۔ ایک بر کا سفید پاجامہ، سفید انگرکھا، کشمیری کام کا جبہ پہنتے اور سر پر چھوٹا سفید صافہ باندھتے ہیں۔ یہ بھی چیلوں کے کوچے ہی میں رہتے ہیں۔ مجھ سے پوچھنے لگے: "کہاں جاتے ہو؟" میں نے کہا: "حکیم مومن خاں کے پاس۔" پوچھا: "کیا کام ہے؟" میں نے حال بیان کیا۔ کہنے لگے: "چلو میں بھی وہیں جا رہا ہوں۔"

حکیم مومن خاں کی عمر تقریباً چالیس برس کی تھی۔ کشیدہ قامت، سرخ و سفید رنگ تھا جس میں سبزی جھلکتی تھی۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں، لمبی لمبی پلکیں، کھنچی ہوئی بھنوئیں، لمبی ستواں ناک، پتلے پتلے ہونٹ، ان پر پان کا لاکھا جما ہوا، مسی آلودہ دانت،

۱۔ موٹا کپڑا

۲۔ کڑھا ہوا پھولدار کپڑا

۳۔ سر کے بال جو ادھر ادھر چھوٹے رہتے ہیں۔ ہر ایک پہلو کو پٹھا کہتے ہیں۔

ہلکی ہلکی مونچھیں، خشخاشی ڈاڑھی، بھرے بھرے ڈنڈ، پتلی کمر، چوڑا سینہ اور لمبی انگلیاں، سر پر گھونگر والے لمبے لمبے بال کاکلوں کی شکل میں کچھ تو پشت پر اور کچھ کندھوں پر پڑے ہوئے، کان کے قریب تھوڑے سے بالوں کو موڑ کر زلفیں بنا لیا تھا۔ بدن پر شربتی ململ کا نیچی چولی کا انگرکھا تھا۔ لیکن اس کے نیچے کرتا نہ تھا اور جسم کا کچھ حصہ انگرکھے کے پردے میں سے دکھائی دیتا تھا۔ گلے میں سیاہ رنگ کا فیتہ، اس میں چھوٹا سا سنہری تعویذ، کاکریزی [1] رنگ کے دوپٹے کو بل دے کر کمر میں لپیٹ لیا تھا اور اس کے دونوں کونے سامنے پڑے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں پتلا سا خارپشت، پاؤں میں سرخ گلبدنی کا پاجامہ، مہریوں پر سے تنگ، اوپر جا کر کسی قدر ڈھیلا، کبھی کبھی ایک بر کا پاجامہ بھی پہنتے تھے۔ مگر کسی قسم کا بھی ہو ہمیشہ ریشمی اور قیمتی ہوتا تھا۔ چوڑا سرخ نیفہ، انگرکھے کی آستینیں آگے سے کٹی ہوئی، کبھی لٹکتی رہتی تھیں اور کبھی پلٹ کر چڑھا لیتے تھے۔ سر پر گلشن کی بڑی دو پلڑی ٹوپی، اس کے کنارے پر باریک لیس۔ ٹوپی اتنی بڑی تھی کہ سر پر اچھی طرح منڈھ کر آ گئی تھی۔ اندر سے مانگ اور ماتھے کا کچھ حصہ اور بال صاف جھلکتے تھے۔ غرض یہ کہ نہایت خوش پوشاک اور جامہ زیب آدمی تھے۔

حکیم صاحب ہماری طرف متوجہ ہوئے اور کہنے لگے: "ارے بھئی صہبائی! تم تو کئی دن سے نہیں آئے، کہو خیریت تو ہے اور آپ کے ساتھ یہ کون ہیں؟" مولوی صہبائی نے کہا: "یہ پہلے کالج میں میرے شاگرد تھے، اب مطبع لگا لیا ہے، وہاں مشاعرہ کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کو تکلیف دینے آئے ہیں۔" حکیم صاحب نے ہنس کر کہا: "بس صاحب مجھے تو معاف ہی کیجیے۔ اب دہلی کے مُشاعرے شریفوں کے جانے کے قابل نہیں رہے۔ بھئی میں نے تو اسی وجہ سے مُشاعروں میں جانا ہی تُرک کر دیا ہے۔" میں نے عرض کی کہ: "اس مشاعرے میں استاد ذوق اور مرزا نوشہ نے آنے کا وعدہ کر لیا ہے۔ حضرت ظلِ سبحانی کی غزل بھی آئے گی۔" فرمایا: "ہر شخص مختار ہے۔ خود آئے، چاہے غزل بھیجے۔ میں تو نہ آؤں گا اور نہ غزل بھیجوں گا۔" یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک بنارس کا سوداگر کپڑوں کے دو گٹھڑ لے کر آیا۔ شہر میں جب کوئی کپڑوں کا سوداگر

---

[1] سیاہی مائل اودے رنگ کا نام

آتا تو حکیم صاحب کے پاس اس کا آنا لازمی تھا۔ ریشمی کپڑوں سے ان کو عشق تھا۔ کوئی کپڑا پسند آتا تو پھر قیمت کی پروا نہیں کرتے تھے۔ جو مانگتا دیتے۔

میں نے جب دیکھا کہ خاں صاحب ہاتھوں سے نکلے ہی جا رہے تھے۔ تو مجھے نواب زین العابدین خاں عارف کا آخری نسخہ یاد آیا۔ میں نے کہا : "مجھے تو اس مشاعرے سے برائے نام تعلق ہے' سب کیا دھرا نواب زین العابدین خاں عارف کا ہے۔ وہ بہت بیمار ہو گئے ہیں اور ان کو اب زندگی کی امید نہیں رہی۔ ان کی آخری خواہش ہے کہ مرتے مرتے ایک ایسا مشاعرہ دیکھ لوں' جس میں دہلی کے تمام کاملینِ فن جمع ہوں"۔ خاں صاحب بڑے غور سے میری بات سنتے رہے۔ میری طرف دیکھ کر کہا : "اچھا بھئی جاؤ میری طرف سے عارف سے کہہ دینا کہ میاں میں ضرور آؤں گا۔" جب میں نے دیکھا یہ جادو چل گیا تو اور پاؤں پھیلائے اور کہا : "نواب صاحب نے یہ بھی فرمایا ہے کہ مولوی صہبائی صاحب مفتی صدرالدین صاحب اور نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کو بھی اپنے ہمراہ لائیے گا تو عنایت ہوگی۔" حکیم صاحب کہنے لگے : "میاں صہبائی سے تو ابھی کہے دیتا ہوں۔ اب رہے آزردہ اور شیفتہ تو واپس جاتے جاتے ان سے بھی کہتے جاؤ۔ یہ کہہ دینا کہ میں نے تم کو بھیجا ہے۔" یہ کہہ کر وہ کپڑے دیکھنے میں مشغول ہو گئے اور میں سلام کر کے رخصت ہوا۔

چتلی قبر کے قریب حویلی عزیز آبادی کے سامنے مفتی صدرالدین صاحب کا مکان تھا۔ اس کے نزدیک ٹیا محل میں نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ رہتے ہیں۔ مفتی صاحب کے ہاں جا کر معلوم ہوا کہ شیفتہ بھی مفتی صاحب ہی کے پاس بیٹھے ہیں۔ میں نے کہا چلو اس سے بہتر موقع ملنا مشکل ہے۔ دونوں سے ایک ہی جگہ ملنا ہو گیا۔ چبوترے کے اوپر تخت بچھے ہوئے تھے۔ اس پر چاندنی کا فرش اور دو طرف گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ تختوں پر مفتی صاحب اور نواب صاحب بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ مفتی صاحب کی عمر کوئی چھپن ستاون سال کی تھی۔ گداز جسم' سانولا رنگ' چھوٹی چھوٹی آنکھیں' ذرا اندر کو دھنسی ہوئیں' بھری ہوئی ڈاڑھی' بہت سیدھی سادی وضع کے آدمی ہیں۔ ظاہری نمائش سے کوئی سروکار نہیں۔ لباس سفید' ایک بر کا پاجامہ' سفید کرتا اور سفید ہی صافہ

تھا۔ جامہ زیبی میں حکیم مومن خاں کے بعد دہلی میں نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ ہی کا نمبر تھا۔ ان کا رنگ گہرا سانولا تھا۔ لیکن ناک نقشہ غضب کا پایا تھا۔ اس پر نیچی سیاہ گول ڈاڑھی بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ جسم کسی قدر بھاری اور قد متوسط تھا۔ لباس میں بھی زیادہ تکلّف نہیں کرتے تھے۔ تنگ مہری کا سفید پاجامہ سفید کرتا، نیچی چولی کا سفید انگرکھا اور قبلہ نما پچ گوشیہ ٹوپی پہنتے تھے۔ تقریباً انتالیس چالیس سال کی عمر تھی۔

میں آداب کر کے تخت کے ایک کونے پر دو زانو بیٹھ گیا۔ مفتی صاحب نے آنے کا سبب پوچھا۔ میں نے حکیم مومن خاں کا پیام پہنچا دیا۔ مفتی صاحب نے بڑے تعجب سے پوچھا "ہیں، خاں صاحب نے تو مشاعرے میں نہ جانے کا عہد کر لیا ہے۔ بھئی شیفتہ یہ کیا معاملہ ہے؟ یا تو خود نہیں جاتے تھے یا دوسروں کو بھی ساتھ گھسیٹ رہے ہیں"۔ میں نے نواب زین العابدین خاں عارف کا واقعہ بیان کیا۔ کہنے لگے "ہاں یوں کہو، یہ بات ہے۔ ورنہ مجھے یہ سن کر حیرت ہوئی تھی کہ حکیم صاحب اور مشاعرے میں جائیں۔ اچھا بھئی عارف سے کہہ دینا کہ میں اور شیفتہ دونوں آئیں گے"۔ یہاں سے چھٹی ہوئی تو میں یہ سمجھا کہ گویا گنگا نہایا۔

(دہلی کا ایک یادگار مُشاعرہ)

سوالات

۱۔ مختصر جواب دیجیے۔

(الف) دہلی کے یادگار مُشاعرے کے منتظم کون کون تھے؟

(ب) حضرت ظلِ سُبحانی، حضرت ظلِ اللہ اور حضرت پیرو مرشد کے الفاظ کس شخصیت کے لیے آئے ہیں؟

(ج) استاد ابراہیم ذوق اور مرزا غالب کی بُود و باش کیسی تھی؟

(د) سبق کے حوالے سے نواب ضیاء الدین احمد خاں کا تعارف کرائیے۔

(ہ) نواب علاء الدین احمد خاں علائی کا ناک نقشہ واضح کیجیے۔

(و) اس سبق میں جن جن شعرا کا تذکرہ آیا ہے ان کی ایک فہرست مرتب کیجیے۔

(ر) دہلی میں جامہ زیبی کے لیے کن کے نام معروف تھے۔

۲۔ مندرجہ ذیل محاورات کو جملوں میں استعمال کیجیے:
قدم رنجہ فرمانا، چراغ پا ہونا، اُشْتُلے چھوڑنا، پاؤں پھیلانا، ساتھ گھسیٹنا، گنگا نہانا۔

۳۔ تحریر و تقریر میں بسا اوقات اصل فعل کے ساتھ کوئی دوسرا فعل یا اس کا جزو استعمال کیا جاتا ہے۔ جس سے اصل فعل کے معنوں میں تھوڑا بہت تغیر پیدا ہو جاتا ہے۔ یا تو اصل فعل کے معنوں میں زیادہ قوت پیدا ہو جاتی ہے یا کلام میں کوئی حسن اور خوبی آجاتی ہے۔ وہ افعال یا ان کے اجزا جو اصل افعال کی مدد یا معاونت کے طور پر آتے ہیں امدادی افعال یا افعالِ معاون کہلاتے ہیں۔

امدادی افعال کے ذریعے سے کلام میں بے شمار لطیف اور نازک معنی پیدا ہو جاتے ہیں۔ اردو زبان میں امدادی افعال نے بڑی وسعت اور نزاکت پیدا کر دی ہے۔ اکثر اوقات امدادی افعال سے معنی میں جو فصاحت اور فرق پیدا ہو جاتا ہے وہ ایسا نازک اور پُرلُطف ہوتا ہے کہ بیان میں نہیں آسکتا۔ اس ضمن میں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ تمام بنیادی افعال 'امدادی افعال کے طور پر استعمال نہیں ہوتے جبکہ تمام امدادی افعال 'بنیادی افعال بھی ہوتے ہیں۔ اردو میں بالعموم استعمال ہونے والے امدادی افعال جن مصادر سے بنتے ہیں وہ یہ ہیں :-

دینا، لینا، آنا، جانا، ڈالنا، پڑنا، چکنا، سکنا، پانا، چاہنا، رکھنا، اٹھنا، کرنا، لگنا، رہنا، ہونا وغیرہ

عام طور پر امدادی فعل اصل فعل کے بعد ہی آتا ہے جیسے امدادی افعال دینا

اور لینا کی مناسبت سے یہ جملے :

میں نے اسے سمجھا دیا ہے۔ یہ رقم رکھ لیجیے وغیرہ

لیکن کبھی کبھی امدادی فعل اصل فعل سے پہلے بھی آجاتا ہے جیسے :

ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا' اور تو اور وہ مجھ کو بھی لے ڈوبا۔ وغیرہ۔

اس سبق میں سے ایسے تمام افعال تلاش کر کے' جو امدادی افعال کے طور پر آئے ہوں' ایک فہرست مرتب کیجیے۔

۴۔ کسی حالیہ مشاعرے کا آنکھوں دیکھا حال (روداد) قلم بند کیجیے۔

○☆○☆○☆○☆○☆○

مولانا غلام رسول مہر

(۱۸۹۵ء - ۱۹۷۱ء)
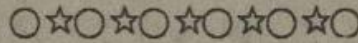
وَقارُ المُلکُ

سرسید مرحوم کے رفیقانِ خاص اپنے ہی عہد میں بے مثال نہ تھے بلکہ ان جیسی شخصیتیں کسی بھی عہد میں بہت ہی کم ملیں گی۔ محسن الملک، وقار الملک، حالی، شبلی، نذیر احمد، اعظم یار جنگ، ان میں سے کونسی شخصیت ہے جو علم و فضل، مکارم اخلاق، وسعتِ نظر اور جذبۂ خدمتِ ملک و ملت میں انتہائی اونچے مقام پر فائز نہیں؟ لیکن ان میں سے وقار الملک محاسن کی فراوانی اور فضائل کی جامعیت کے اعتبار سے بہت ممتاز ہیں۔ میں نے شخصیتوں کے اس نظامِ شمسی پر جب کبھی غور کیا، ان میں سے دو کو بالکل یگانہ اور نادر پایا۔ ایک مولانا حالی اور دوسرے نواب وقار الملک۔ مولانا حالی بہت ہی پاکیزہ صفات انسان تھے۔ سراپا سوز و گداز، سراپا محبت و شفقت اور سراپا ایثار و انکسار، تاہم ان کا حلقۂ عمل صرف علم و ادب اور شعر و سخن تک محدود تھا۔ وقار الملک کا دائرہ کار بہت وسیع تھا۔ انھوں نے ہر مقام پر حسنِ عمل کے جو نقوش چھوڑے ان کی آب و تاب اب تک ہر صاحبِ بصیرت کا دامنِ نگاہ اپنی طرف کھینچ رہی ہے اور جب تک فضائل کے اسلامی معیار اس دنیا میں قائم ہیں، یہ آب و تاب ماند نہیں پڑ سکتی۔

میں نے وقار الملک کو دسمبر ۱۹۰۸ء میں پہلی اور آخری مرتبہ دیکھا تھا، جب میں غالباً آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ وہ ہوشیار پور میں اسلامیہ ہائی سکول کا سنگِ بنیاد رکھنے کی غرض سے جالندھر آئے تھے۔ اس زمانے میں جالندھر اور ہوشیاپور کے درمیان ریلوے لائن نہ تھی اور انھیں جالندھر میں ٹھہر کر گھوڑے گاڑی کے ذریعہ سے ہوشیار پور جانا تھا۔ ہزاروں اکابر کے علاوہ طلبہ بھی استقبال کے لیے سٹیشن پر پہنچے ہوئے تھے۔ نواب صاحب نے سب سے مصافحہ کیا۔ میرے ناچیز ہاتھوں کو بھی یہ شرف حاصل ہوا۔ وہ منظر پینتالیس سال گزرنے کے باوجود اب تک اس طرح آنکھوں کے سامنے تازہ ہے گویا کل پیش آیا تھا۔

قد زیادہ لمبا نہ تھا۔ جسم دہرا اور گٹھا ہوا۔ اس وجہ سے وہ قدرے پست قامت نظر آتے تھے۔ رنگ سانولا' سر منڈا ہوا' چہرہ گول' مونچھیں ترشی ہوئی' ڈاڑھی متوسط اور بالکل سفید۔ اس وقت ان کی عمر سڑسٹھ کے قریب تھی۔ میں نے جب انھیں دیکھا تو سر پر سرخ ترکی ٹوپی تھی۔ سبز سی گرم شیروانی اور پتلون پہن رکھی تھی۔ جو بھی ان سے مصافحہ کرتا' بڑے تپاک' حسنِ اخلاق اور محبت و شفقت سے ملتے' لیکن چہرے پر متانت کا غلبہ تھا اور تبسم کی کوئی جھلک نمایاں نہ تھی۔ اس زمانے میں استقبال ویسے شاندار نہ ہوتے تھے' جن کی رسم ہمارے ملک میں 'ترکِ مُوالاات'[1] کے دَور سے پڑی اور تکلفات میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ لیکن جالندھر میں وقارالملک کا استقبال بہت غیر معمولی جوش و سرگرمی سے کیا گیا۔ دور تک اور دیر تک ان پر پھولوں کی بارش ہوتی رہی۔

واضح رہے اس وقت مجھے وقارالملک کی عظیم الشان شخصیت اور ان کے بلند مقام کے متعلق کچھ علم نہ تھا۔ لہٰذا تقریبِ استقبال میں شامل ہونے کی خوش نصیبی کا اندازہ نہ تھا۔ ہوش سنبھالا تو زندگی کے جن واقعات کو اپنے لیے سرمایۂ فخر سمجھتا رہا ہوں' ان میں ایک یہ واقعہ بھی ہے۔

وقارالملک ۱۹ محرم ۱۲۵۷ھ (۱۴۔ مارچ ۱۸۴۱ء) کو پیدا ہوئے۔ مشتاق حسین نام رکھا گیا۔ والد کا نام فضل حسین تھا' ذات کمبوہ' وطن سنبھل۔ والدہ امروہہ کی تھیں۔ مشتاق حسین صرف چھ مہینے کے تھے' جب ان کے والد نے وفات پائی۔ والدہ یتیم بچے کو لے کر امروہہ چلی گئیں۔ یہی مقام مشتاق حسین کا وطن بن گیا۔ جو آگے چل کر وقارالدولہ وقارالملک نواب مشتاق حسین خاں بہادر انتصار جنگ بننے والے تھے۔

چھ سال کی عمر میں قرآن ختم کیا۔ کچھ عربی اور فارسی پڑھی۔ ۱۸۵۹ء میں دس روپے ماہانہ پر مدرس بن گئے تھے۔ پھر انکم ٹیکس کی محرّری اور واصل باقی[2] نویسی کی۔

۱۔ عدم تعاون ۔ انگریزی میں (Non Cooperation) لیکن اس سے مراد انگریزوں کے خلاف ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ تحریک عدم تعاون ہے۔
۲۔ یہ حساب رکھنا کہ کُل واجب الادا رقم میں سے کتنی وصول ہو گئی ہے اور کتنی باقی ہے۔

بعد ازاں منصفی میں سرشتہ دار[1] بن گئے۔ تحصیل داری کا امتحان بھی پاس کر لیا لیکن ایک واقعے کے باعث جس کا ذکر آگے آئے گا' ملازمت سے استعفا دیدیا اور سرسید کی سفارش پر حیدر آباد میں چار سو روپیہ ماہانہ پر ملازم ہو گئے۔ وہاں سے بھی ایک مرتبہ بعض مقامی کشمکشوں کے باعث ملازمت سے جواب مل گیا تھا۔ دوبارہ بلائے گئے اور تھوڑی ہی دیر میں صوبہ وارنگل کے صوبہ دار' پھر معتمد عدالت وکوتوالی بنے۔ سر آسمان جاہ بہادر کی وزارت میں پوری ریاست کا کاروبار عملاً انھیں سے متعلق تھا۔ ۱۸۹۲ء میں پنشن لے کر وطن واپس آگئے اور قوم کے تعلیمی وسیاسی کاموں میں حصہ لیتے رہے۔ انہی کی کوششوں سے مسلم لیگ کی سنگ بنیاد پڑی۔ نواب محسن الملک کی وفات کے بعد علی گڑھ کالج کے سیکرٹری بن گئے۔ انہی کے عہدِ نظامت میں مسلم یونیورسٹی کی تجویز بروئے کار آئی۔ جولائی ۱۹۱۲ء میں ضعف اور علالت کے باعث استعفا دے دیا لیکن قوم کے سیاسی مقاصد سے دلچسپی آخری دم تک جاری رہی۔ ۲۷ اور ۲۸ جنوری ۱۹۱۷ء کی درمیانی شب میں پونے دس بجے وفات پائی اور امروہہ میں دفن ہوئے۔

یہ حالاتِ زندگی کا سرسری مرقّع ہے۔ میرا مقصد یہ نہیں کہ ان کے حالات تفصیلاً" لکھوں' بلکہ ان اولوالعزمانہ اخلاق کی چند جھلکیاں دکھانا چاہتا ہوں جو وقارالملک کی عظمت کا سرچشمہ تھے اور جن کی بنا پر حق شناسوں کے نزدیک ان کا ماتم قوم کا ماتم قرار پایا۔

وقارالملک نے ۱۸۵۹ء میں دس روپے ماہانہ کی مدرسی سے مستقل زندگی کا آغاز کیا تھا۔ اس وقت کسی کو اندازہ نہ ہو سکتا تھا کہ اس وجود میں خدا نے کیسی نادر صلاحیتیں ودیعت کی ہیں۔ سرسید علی گڑھ میں صدر الصدور کے عہدے پر مامور تھے' جب وقارالملک کو سررشتہ دار عدالت کی حیثیت سے ان کے ماتحت کام کرنا پڑا۔ سرسید علی گڑھ سے تبدیل ہو کر بنارس گئے تو وقارالملک کی سروس بک میں انھوں نے جو رائے لکھی وہ اس عظیم الشان انسان کے گوناگوں اوصاف کا پہلا اعتراف تھا۔

---

[1] میر منشی۔ ہیڈ کلرک

فرماتے ہیں :

"منشی مشتاق حسین سرشتہ دار عدالت ہذا نہایت لائق، نہایت محنتی، نہایت کارگزار، نہایت فہیم اور نہایت زود نویس و خوش خط افسر ہے۔ اس افسر کی دیانت داری پر مجھ کو ایسا یقین ہے، جیسا کہ اپنی موت پر۔ جس عہدے پر یہ شخص نوکر ہے، اس سے بہت زیادہ بڑے عہدے کی نہایت عمدہ لیاقت اس میں موجود ہے۔"

واضح رہے کہ سرسید حد درجہ متوازن رائے کے آدمی تھے اور ان کی طبیعت میں احتیاط بہت تھی۔ تاہم وہ وقارالملک کے یگانہ اوصاف سے اس قدر متاثر ہوئے کہ کوئی بھی وصف "نہایت" کی صفت کے بغیر بیان نہ کیا، حالانکہ اس وقت تک وقارالملک معمولی سرشتہ دار تھے اور سررشتہ داری کے محدود دائرے میں ان کی تمام قابلیتیں ٹھیک بروئے کار نہ آسکتی تھیں۔

۱۸۷۵ء میں وہ مسٹر کالون کلکٹر کے ماتحت کام کر رہے تھے۔ جب نماز کا وقت آتا، مقررہ معمول کے مطابق دفتر سے اٹھ کر مسجد میں چلے جاتے۔ کالون صاحب کو ان کا یہ طریقہ پسند نہ آیا۔ اس نے منع کیا تو انھوں نے کہا: "نماز مذہباً" مجھ پر فرض ہے میں اسے چھوڑ نہیں سکتا۔ البتہ اس کی بوجہ سے کام میں کوئی خلل پیدا ہو تو آپ مجھ سے جواب طلب کر سکتے ہیں۔" کالون کام سے قطع نظر کرتے ہوئے صرف نماز کا مخالف تھا۔ مجبور ہو کر وقارالملک نے درخواست دے دی کہ یا تو ادائے نماز کے لیے تھوڑی سی غیر حاضری معاف کر دی جائے یا غیر حاضری کے وقت کی تنخواہ کاٹ لی جائے یا چھ مہینے کی رخصت دی جائے۔ اگر ان میں سے کوئی بھی صورت منظور نہ ہو تو اس درخواست کو میرا استعفا سمجھ لیا جائے۔ یعنی پندرہ سال کی ملازمت سے دست برداری پر وہ بے تکلف تیار ہو گئے لیکن نماز میں تاخیر گوارا نہ کی۔

چھ مہینے کی رخصت ہی کے زمانے میں سرسید نے سرسالار جنگ وزیراعظم حیدر آباد کو لکھا اور وقارالملک کے لیے حیدر آباد میں چار سو روپے ماہانہ کی ملازمت کا انتظام ہو گیا۔ لطف یہ کہ جس انگریز افسر نے نماز پر جھگڑا کر کے رخصت اور استعفے تک نوبت پہنچائی تھی اس نے آپ کی کارکردگی کے متعلق نہایت اچھی رائے دی اور

اس میں اقرار کر لیا کہ وہ پابندی سے نماز پڑھتے تھے' مجھے تکلیف ہوتی تھی۔ وہ اپنی رائے بدلنے پر راضی نہ ہوئے' میں اس صورت کو قبول نہ کر سکتا تھا۔ اچھا ہوا کہ انھیں دوسری جگہ ملازمت مل گئی۔

وقارالملک اخلاقی جرأت میں ضرب المثل تھے۔ جس زمانے میں سالار جنگ وزیر اعظم دولت آصفیہ کے مختار کل تھے' نواب بشیرالدولہ عدالت اور کوتوالی دونوں کے صدر المہام یا وزیر تھے اور وقارالملک ان کے ماتحت معتمدی (سیکرٹری شپ) کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ سالار جنگ نے ایک معاملے کے متعلق وقارالملک کے سامنے اپنی رائے ظاہر کی اور فرمایا کہ اسی رائے کو اپنی رائے کے طور پر نواب بشیرالدولہ کے روبرو پیش کر دیں۔ وقارالملک اگرچہ سالار جنگ کے آوردہ تھے' اپنی ملازمت اور ترقی کو انہی کا احسان سمجھتے تھے لیکن صاف کہ دیا کہ میری یہ رائے نہیں ہے۔ سالار جنگ کو یہ امر طبعاً" ناگوار گزرا۔ وقارالملک گھر واپس آئے تو فوراً ملازمت سے استعفا پیش کر دیا اور حیدر آباد سے روانگی کے لیے تیار ہو گئے۔ سالار جنگ نے انھیں بلا کر اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور کہا کہ واقعی اپنی رائے آپ پر ٹھونسنے کا مجھ کو کوئی حق نہ تھا۔

وقارالملک اپنے ماتحت ملازموں کا بہت خیال رکھتے تھے۔ کوئی فوت ہو جاتا تو اس کے متعلق پوری معلومات بہم پہنچاتے۔ اس پر قرضہ ہوتا تو اتارنے کا بندوبست کرتے۔ اس کے لڑکوں کے لیے وسائل معاش کا خیال رکھتے۔ غیر شادی شدہ لڑکیوں کی شادی کا انتظام کراتے۔ بیواؤں کے لیے وظائف مقرر کراتے۔

ان کی طبیعت میں انکسار بہت تھا۔ اس سلسلے میں صرف ایک واقعہ پیش کروں گا۔ حیدر آباد میں کسی مسجد کے ایک نابینا کا کھانا ان کے ہاں سے مقرر تھا۔ ایک مرتبہ شدت سے بارش ہوئی۔ ملازم رات کا کھانا نابینا کو نہ پہنچا سکا۔ وقارالملک کو بڑی دیر میں معلوم ہوا تو خود اٹھے اور پیدل کھانا نابینا کے پاس لے کر گئے۔ وہ بھوکا بیٹھا تھا۔ بہت بڑ بڑایا اور خفا ہوا کہ آدھی رات کو روٹی لے کر آیا ہے' جا ہم نہیں کھاتے۔ وقارالملک نے بڑی خوشامد اور منت سماجت سے اسے راضی کیا اور کھانا کھلا کر واپس

آئے۔ تاہم اس پر قطعاً" یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ خود کھانا لے کر آئے تھے۔

دوسروں کو مصیبت میں دیکھ کر بے اختیار اشک بار ہو جاتے۔ ایک مرتبہ علالت کے باعث پہاڑ پر چلے گئے۔ وہاں سنا کہ ان کی صوبہ داری میں بارش نہ ہونے کے باعث عوام کی حالت بہت خراب ہو گئی ہے اور غریبوں کے مویشی مر رہے ہیں۔ فوراً پہاڑ سے واپس آئے۔ جمعہ کی نماز کے بعد ایک چھپر کے نیچے بیٹھے ہوئے اطراف علاقہ کی رپورٹیں دیکھ رہے تھے، جو دردناک اطلاعوں سے بھری ہوئی تھیں، کاغذات اٹھاتے پڑھتے اور روتے جاتے۔ دو گھنٹے میں خدا کی رحمت سے ابر آیا اس قدر پانی برسا کہ چھپّر ٹپک پڑا اور وقارالملک بھیگ گئے، پھر اٹھے۔

یہ وقارالملک کے فضائل مکارم کی چند جھلکیاں ہیں جو سرسری طور پر پیش کر دی گئی ہیں۔ انھیں سامنے رکھ کر غور فرمائیے کہ وہ کس درجہ نادر و یگانہ شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے انتظامی کارناموں پر بحث کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔ بے شائبہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ دولتِ آصفیہ پچاس سال تک جس نظامِ حکومت پر چلتی رہی، اس کی تربیت اور اجزاء میں سب سے بڑا حصہ وقارالملک ہی کا تھا۔ انھوں نے حکومت کو خود سری کی بلندیوں سے اتار کر حقوق جمہور کی نگہبانی و پاسداری کی راہ پر لگایا اور اپنے حسن عمل سے وہ نمونہ پیش کیا جس کی مثالیں کسی بھی ملک میں بہت ہی کم ملیں گی۔ سرسید کے رفیقوں میں ایسے جامع اوصاف کا آدمی دوسرا کوئی نہ تھا۔

(جماعتِ مجاہدین)

سوالات

۱۔ سوالات کے مختصر جواب لکھیے:

(الف) سرسید احمد خاں کے ان خاص رفیقوں کے نام لکھیے جو اس سبق میں آئے ہیں۔

(ب) مصنف (مولانا غلام رسول مہر) نے جب نواب وقارالملک کو پہلی بار دیکھا تو ان کی وضع قطع کیسی تھی؟

(ج) مصنف نواب وقار الملک کی تقریبِ استقبال میں شامل ہونے کو اپنے لیے سرمایہ افتخار کیوں سمجھتے تھے؟

(د) نواب وقار الملک نے قوم کے تعلیمی و سیاسی کاموں میں حصہ لینا کب شروع کیا؟

(ہ) نواب وقار الملک کی سب سے اہم خدمات کون کون سی ہیں؟

(و) سرسید احمد خاں نے وقار الملک کی سروس بک میں اپنی رائے کا اظہار، کن الفاظ میں کیا تھا؟

(ز) انگریز افسر نے جب دفتری اوقات کار کے دوران میں وقار الملک کے نماز پڑھنے پر اعتراض کیا تو آپ نے اپنی درخواست میں کیا لکھا؟

(ح) "نواب وقار الملک کی طبیعت میں انکسار بہت تھا"۔ اس بات کی وضاحت اس واقعہ سے کیجیے جو اس سبق میں آیا ہے۔

۲۔ سیاق و سباق کے حوالے سے درج ذیل عبارات کی تشریح کیجیے:

(الف) سرسید مرحوم ------ یہ آب و تاب ماند نہیں پڑ سکتی۔

(ب) یہ وقار الملک کے فضائل ------ کوئی دوسرا نہ تھا۔

۳۔ اس سبق میں نواب وقار الملک کے متعلق خاطر خواہ معلومات موجود ہیں، آپ انھیں بنیاد بنا کر نواب وقار الملک کی شخصیت پر اپنے الفاظ میں ایک مضمون لکھیے۔

○☆○☆○☆○☆○☆○

احمد شاہ بخاری پطرس

(۱۸۹۸ء۔ ۱۹۵۸ء)

ہاسٹل میں پڑھنا

ہم نے کالج میں تعلیم تو ضرور پائی اور رفتہ رفتہ بی۔ اے بھی پاس کر لیا' لیکن اس نصف صدی کے دوران میں' جو کالج میں گزارنی پڑی' ہاسٹل میں داخل ہونے کی اجازت ہمیں صرف ایک ہی مرتبہ ملی۔

خدا کا یہ فضل ہم پر کب اور کس طرح ہوا یہ سوال ایک داستان کا محتاج ہے:

جب ہم نے انٹرنس پاس کیا تو مقامی سکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب خاص طور پر مبارک باد دینے کے لیے آئے۔ قریبی رشتہ داروں نے دعوتیں دیں۔ محلے والوں میں مٹھائی بانٹی گئی اور ہمارے گھر والوں پر یک لخت اس بات کا انکشاف ہوا کہ وہ لڑکا جسے آج تک اپنی کوتاہ بینی کی وجہ سے ایک بیکار اور نالائق فرزند سمجھتے رہے تھے' دراصل لامحدود قابلیتوں کا مالک ہے۔ جس کی نشوونما پر بے شمار آنے والی نسلوں کی بہبودی کا انحصار ہے۔ چنانچہ ہماری آئندہ زندگی کے متعلق طرح طرح کی تجویزوں پر غور کیا جانے لگا۔

تھرڈ ڈویژن میں پاس ہونے کی وجہ سے یونیورسٹی نے ہم کو وظیفہ دینا مناسب نہ سمجھا۔ چونکہ ہمارے خاندان نے خدا کے فضل سے کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا اس لیے وظیفے کا نہ ملنا بھی' خصوصاً ان رشتہ داروں کے لیے' جو رشتے کے لحاظ سے خاندان کے مضافات میں بستے تھے' فخرو مباہات کا باعث بن گیا اور مرکزی رشتہ داروں نے تو اس کو پاسِ وضع اور حفظِ مراتب سمجھ کر ممتحنوں کی شرافت ونجابت کو بے انتہا سراہا۔ بہرحال ہمارے خاندان میں فالتو روپے کی بہتات تھی اس لیے بلا تکلف یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ نہ صرف ہماری بلکہ ملک وقوم اور شاید بنی نوع انسان

کی بہتری کے لیے یہ ضروری ہے کہ ایسے ہونہار طالب علم کی تعلیم جاری رکھی جائے۔

اس بارے میں ہم سے بھی مشورہ لیا گیا۔ عمر بھر میں اس سے پہلے ہمارے کسی معاملے میں ہم سے رائے طلب نہ کی گئی تھی۔ لیکن اب تو حالات بہت مختلف تھے۔ اب تو ایک غیر جانبدار اور ایماندار منصف یعنی یونیورسٹی ہماری بیدار مغزی کی تصدیق کر چکی تھی۔ اب بھلا ہمیں کیوں کر نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔ ہمارا مشورہ یہ تھا کہ ہمیں فوراً ولایت بھیج دیا جائے۔ ہم نے مختلف لیڈروں کی تقریروں سے یہ ثابت کیا کہ ہندوستان کا طریقہ تعلیم بہت ناقص ہے۔ اخبارات میں سے اشتہار دکھا دکھا کر یہ واضح کیا کہ ولایت میں کالج کی تعلیم کے ساتھ ساتھ فرصت کے اوقات میں بہت تھوڑی تھوڑی فیسیں دے کر بیک وقت جرنلزم، فوٹو گرافی، تصنیف و تالیف، دندان سازی، عینک سازی، ایجنٹوں کا کام غرضیکہ بے شمار مفید اور کم خرچ بالا نشیں پیشے سیکھے جا سکتے ہیں اور تھوڑے عرصے کے اندر انسان ہر فن مولا بن سکتا ہے۔

لیکن ہماری تجویز کو فوراً رد کر دیا گیا کیونکہ ولایت بھیجنے کے لیے ہمارے شہر میں کوئی روایات موجود نہ تھیں۔ ہمارے گردونواح میں سے کسی کا لڑکا ابھی تک ولایت نہ گیا تھا اس لیے ہمارے شہر کی پبلک وہاں کے حالات سے قطعاً" ناواقف تھی۔ اس کے بعد پھر ہم سے رائے طلب نہ کی گئی اور ہمارے والد، ہیڈ ماسٹر صاحب اور تحصیلدار صاحب ان تینوں نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ ہمیں لاہور بھیج دیا جائے۔

جب ہم نے یہ خبر سنی تو شروع شروع میں ہمیں سخت مایوسی ہوئی۔ لیکن جب ادھر ادھر کے لوگوں سے لاہور کے حالات سنے تو معلوم ہوا کہ لندن اور لاہور میں چنداں فرق نہیں۔ بعض واقف کار دوستوں نے سینما کے حالات پر روشنی ڈالی۔ بعض نے تھیٹروں کے مقاصد سے آگاہ کیا۔ بعض نے ٹھنڈی سڑک وغیرہ کے مشاغل کو سلجھا کر سمجھایا۔ بعض نے شاہدرے اور شالامار کی ارمان انگیز فضا کا نقشہ کھینچا۔ چنانچہ جب لاہور کا جغرافیہ پوری طرح ہمارے ذہن نشین ہو گیا تو ثابت یہ ہوا کہ خوش گوار مقام ہے اور اعلیٰ درجے کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے بے حد موزوں۔ اس پر ہم نے اپنی زندگی کا پروگرام وضع کرنا شروع کر دیا، جس میں لکھنے پڑھنے کو جگہ تو ضرور دی گئی

لیکن ایک مناسب حد تک، تاکہ طبیعت پر کوئی ناجائز بوجھ نہ پڑے اور فطرت اپنا کام حسن وخوبی کے ساتھ کر سکے۔

لیکن تحصیلدار صاحب اور ہیڈ ماسٹر صاحب کی نیک نیتی یہیں تک محدود نہ رہی۔ اگر وہ ایک عام اور مجمل سا مشورہ دے دیتے کہ لڑکے کو لاہور بھیج دیا جائے تو بہت خوب تھا، لیکن انھوں نے تو تفصیلات میں دخل دینا شروع کر دیا اور ہاسٹل کی زندگی اور گھر کی زندگی کا مقابلہ کر کے ہمارے والد پر یہ ثابت کر دیا کہ گھر پاکیزگی اور طہارت کا ایک کعبہ اور ہاسٹل گناہ و معصیت کا ایک دوزخ ہے۔ ایک تو تھے وہ چرب زبان، اس پر انھوں نے بے شمار غلط بیانیوں سے کام لیا۔ چنانچہ گھر والوں کو یقین سا ہو گیا۔

چنانچہ گھر والوں کو یہ سوچنے کی عادت پڑ گئی کہ لڑکے کو کالج میں تو داخل کیا جائے لیکن ہاسٹل میں نہ رکھا جائے۔ کالج ضرور، مگر ہاسٹل ہرگز نہیں۔ کالج مفید، مگر ہاسٹل مضر۔ وہ بہت ٹھیک، مگر یہ ناممکن۔ جب انھوں نے اپنی زندگی کا نصب العین ہی یہ بنا لیا کہ کوئی ترکیب ایسی سوچی جائے جس سے لڑکا ہاسٹل کی زد سے محفوظ رہے، تو کسی ترکیب کا سوجھ جانا کیا مشکل تھا۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ چنانچہ از حد غور وخوض کے بعد لاہور میں ہمارے ایک ماموں دریافت کیے گئے اور ان کو ہمارا سرپرست بنا دیا گیا۔ میرے دل میں ان کی عزت پیدا کرنے کے لیے بہت سے شجروں کی ورق گردانی سے مجھ پر یہ ثابت کیا گیا کہ وہ واقعی میرے ماموں ہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ جب میں ایک شیر خوار بچہ تھا تو وہ مجھ سے بے انتہا محبت کیا کرتے تھے۔ چنانچہ فیصلہ یہ ہوا کہ ہم پڑھیں کالج میں اور رہیں ماموں کے گھر۔

اس سے تحصیلِ علم کا جو ایک ولولہ سا ہمارے دل میں اٹھ رہا تھا، وہ کچھ بیٹھ سا گیا۔ ہم نے سوچا یہ ماموں لوگ اپنی سرپرستی کے زُعم میں والدین سے بھی زیادہ احتیاط برتیں گے۔ جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ہمارے دماغی اور روحانی قویٰ کو پھلنے پھولنے کا موقع نہ ملے گا اور تعلیم کا اصلی مقصد فوت ہو جائے گا۔ چنانچہ وہی ہوا جس کا ہمیں خوف تھا۔ ہم روز بروز مرجھاتے چلے گئے اور ہمارے دماغ پر پھپھوندی سی جمنے

لگی۔ سینما جانے کی اجازت کبھی کبھار مل جاتی تھی۔ لیکن اس شرط پر کہ بچوں کو بھی ساتھ لیتا جاؤں۔ اس صحبت میں بھلا سنیما سے کیا اخذ کر سکتا تھا۔ تھیٹر کے معاملے میں ہماری معلومات اندر سبھا سے آگے بڑھنے نہ پائیں۔ تیرنا ہمیں نہ آیا۔ کیونکہ ہمارے ماموں کا ایک مشہور قول ہے کہ ڈوبتا وہی ہے جو تیراک ہو۔ جسے تیرنا نہ آتا ہو وہ پانی میں گھستا ہی نہیں۔ گھر پر آنے جانے والے دوستوں کا انتخاب ماموں کے ہاتھ میں تھا۔ کوٹ کتنا لمبا پہنا جائے اور بال کتنے لمبے رکھے جائیں' ان کے متعلق ہدایات بہت کڑی تھیں۔ ہفتے میں دو بار گھر خط لکھنا ضروری تھا۔

یہ سپاہیانہ زندگی ہمیں راس نہ آئی۔ یوں تو دوستوں سے ملاقات بھی ہو جاتی تھی۔ سیر کو بھی چلے جاتے تھے۔ ہنس بول بھی لیتے تھے۔ لیکن وہ جو زندگی میں ایک آزادی' ایک فراخی' ایک وارفتگی ہونی چاہیے' وہ ہمیں نصیب نہ ہوئی۔ رفتہ رفتہ ہم نے اپنے ماحول پر غور کرنا شروع کیا کہ ماموں جان عموماً کس وقت گھر میں ہوتے ہیں' کس وقت باہر جاتے ہیں' کس کمرے سے کس کمرے تک گانے کی آواز نہیں پہنچ سکتی' کس دروازے سے کمرے کے کس کونے میں جھانکنا ناممکن ہے' گھر کا کون سا دروازہ رات کے وقت باہر سے کھولا جا سکتا ہے' کون سا ملازم موافق ہے' کون سا نمک حلال ہے۔ جب تجربے اور مطالعے سے ان باتوں کا اچھی طرح اندازہ ہو گیا تو ہم نے اس زندگی میں بھی نشوونما کے لیے چند گنجائشیں پیدا کر لیں۔ لیکن پھر بھی ہم روز دیکھتے تھے کہ ہاسٹل میں رہنے والے طلبہ کس طرح اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر زندگی کی شاہراہ پر چل رہے ہیں۔ ہم ان کی زندگی پر رشک کرنے لگے۔ اپنی زندگی کو سدھارنے کی خواہش ہمارے دل میں روز بروز بڑھتی گئی۔ ہم نے دل سے کہا' والدین کی نافرمانی کسی مذہب میں جائز نہیں' لیکن ان کی خدمت میں درخواست کرنا' ان کے سامنے اپنی ناقص رائے کا اظہار کرنا' ان کو صحیح واقعات سے آگاہ کرنا میرا فرض ہے اور دنیا کی کوئی طاقت مجھے اپنے فرض کی ادائیگی سے باز نہیں رکھ سکتی۔

چنانچہ جب گرمیوں کی تعطیلات میں میں وطن کو واپس گیا تو چند مختصر مگر جامع اور موثر تقریریں اپنے دماغ میں تیار رکھیں۔ گھر والوں کو ہاسٹل پر سب سے بڑا

اعتراض یہ تھا کہ وہاں کی آزادی نوجوانوں کے لیے ازحد مضر ہوتی ہے۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے ہزارہا واقعات ایسے تصنیف کیے جن سے ہاسٹل کے قواعد کی سختی ان پر اچھی طرح روشن ہو جائے۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب کے ظلم وتشدد کی چند مثالیں رقت انگیز اور ہیبت خیز پیرائے میں سنائیں۔ آنکھیں بند کر کے ایک آہ بھری اور بیچارے اشفاق کا واقعہ بیان کیا کہ ایک دن شام کے وقت بیچارہ ہاسٹل کو واپس آرہا تھا' چلتے چلتے پاؤں میں موچ آگئی' دو منٹ دیر سے پہنچا' صرف دو منٹ۔ بس صاحب' اس پر سپرنٹنڈنٹ صاحب نے فوراً تار دے کر اس کے والد کو بلوایا۔ پولیس سے تحقیقات کرنے کو کہا اور مہینے بھر کے لیے اس کا جیب خرچ بند کروا دیا۔ توبہ ہے الٰہی!

لیکن یہ واقعہ سن کر گھر کے لوگ سپرنٹنڈنٹ صاحب کے مخالف ہو گئے۔ ہاسٹل کی خوبی ان پر واضح نہ ہوئی۔ پھر ایک دن موقع پا کر بیچارے محمود کا واقعہ بیان کیا کہ ایک دفعہ شامت اعمال' بیچارہ سنیما دیکھنے چلا گیا۔ قصور اس سے یہ ہوا کہ ایک روپے والے درجے میں جانے کی بجائے وہ دو روپے والے درجے میں چلا گیا۔ بس اتنی سی فضول خرچی پر اسے عمر بھر کو سنیما جانے کی ممانعت ہو گئی ہے۔ لیکن اس سے بھی گھر والے متأثر نہ ہوئے۔ انھیں ناکام کوششوں میں تعطیلات گزر گئیں اور ہم نے پھر ماموں کی چوکھٹ پر آکر سجدہ کیا۔

اگلی گرمیوں میں جب ہم پھر گھر گئے تو ہم نے ایک نیا ڈھنگ اختیار کیا۔ دو سال تعلیم پانے کے بعد ہمارے خیالات میں پختگی سی آگئی تھی۔ پچھلے سال ہاسٹل کی حمایت میں جو دلائل ہم نے پیش کی تھیں' وہ اب ہمیں نہایت بودی معلوم ہونے لگی تھیں۔ اب کے ہم نے اس موضوع پر ایک لیکچر دیا کہ جو شخص ہاسٹل کی زندگی سے محروم ہو اس کی شخصیت نامکمل رہ جاتی ہے۔ ہاسٹل سے باہر شخصیت پنپنے نہیں پاتی۔ چند دن تو ہم اس پر فلسفیانہ گفتگو کرتے رہے اور نفسیات کے نقطہ نظر سے اس پر بہت روشنی ڈالی۔ لیکن ہمیں محسوس ہوا کہ بغیر مثالوں کے کام نہ چلے گا اور جب مثالیں دینے کی نوبت آئی تو ذرا دقت محسوس ہوئی۔ کالج کے جن طلبہ کے متعلق میرا ایمان تھا کہ وہ زبردست شخصیتوں کے مالک ہیں' ان کی زندگی کچھ ایسی نہ تھی کہ والدین کے

سامنے بطور نمونہ کے پیش کی جا سکے۔ ہر وہ شخص جسے کالج میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا ہے، جانتا ہے کہ والدینی اغراض کے لیے واقعات کو ایک نئے اور اچھوتے پیرائے میں بیان کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ لیکن اس پیرائے کا سوجھ جانا الہام اور اتفاق پر منحصر ہے۔ بعض روشن خیال بیٹے اپنے والدین کو اپنے حیرت انگیز اوصاف کا قائل نہیں کر سکتے اور بعض نالائق سے نالائق طالب علم والدین کو کچھ اس طرح مطمئن کر دیتے ہیں کہ ہر ہفتے ان کے نام منی آرڈر پہ منی آرڈر چلا آتا ہے:

بناداں آں چناں روزی رساند [1]

کہ دانا اندراں حیراں بماند

جب ہم ڈیڑھ مہینے تک شخصیت اور ہاسٹل کی زندگی پر اس کا انحصار، ان دو مضمونوں پر وقتاً فوقتاً اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے تو ایک دن والد نے پوچھا:

"تمھارا شخصیت سے آخر مطلب کیا ہے؟"

میں تو خدا سے یہی چاہتا تھا کہ وہ مجھے عرض و معروض کا موقع دیں۔ میں نے کہا: "دیکھیے نا، مثلاً ایک طالب علم ہے، وہ کالج میں پڑھتا ہے، اب ایک تو اس کا دماغ ہے، دوسرا اس کا جسم ہے۔ جسم کی صحت بھی ضروری ہے اور دماغ کی صحت تو ضروری ہے ہی۔ لیکن ان کے علاوہ ایک اور بات بھی ہوتی ہے، جس سے آدمی گویا پہچانا جاتا ہے، میں اس کو شخصیت کہتا ہوں۔ اس کا تعلق نہ جسم سے ہوتا ہے نہ دماغ سے ہو سکتا ہے کہ ایک آدمی کی جسمانی صحت بالکل خراب ہو اور اس کا دماغ بھی بالکل بیکار ہو لیکن پھر بھی اس کی شخصیت ــــــ نہ خیر دماغ تو بیکار نہیں ہونا چاہیے ورنہ انسان خبطی ہوتا ہے ــــــ لیکن پھر بھی اگر ہو بھی تو بھی ــــــ گویا شخصیت ایک ایسی چیز ہے ــــــ ٹھہریے میں ابھی ایک منٹ میں آپ کو بتاتا ہوں"۔

ایک منٹ کی بجائے والد نے مجھے آدھ گھنٹے کی مہلت دی۔ جس کے دوران میں وہ خاموشی کے ساتھ میرے جواب کا انتظار کرتے رہے۔ اس کے بعد میں وہاں

1۔ نادانوں کو اس طرح روزی پہنچاتے ہیں کہ دانا اس پر حیران رہ جاتے ہیں۔

سے اٹھ کر چلا آیا۔

تین چار دن کے بعد مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ مجھے شخصیت نہیں، سیرت کہنا چاہیے۔ شخصیت ایک بے رنگ سا لفظ ہے۔ سیرت کے لفظ سے نیکی ٹپکتی ہے۔ چنانچہ میں نے سیرت کو اپنا تکیہ کلام بنا لیا۔ لیکن یہ بھی مفید ثابت نہ ہوا۔ والد کہنے لگے:

"کیا سیرت سے تمھارا مطلب چال چلن ہے یا کچھ اور؟"

میں نے کہا: "چال چلن ہی کہ لیجیے"۔

"تو گویا دماغی اور جسمانی صحت کے علاوہ چال چلن بھی اچھا ہونا چاہیے"۔

میں نے کہا: "بس یہی تو میرا مطلب ہے"۔

"اور یہ چال چلن ہاسٹل میں رہنے سے بہت اچھا ہو جاتا ہے!"

میں نے نسبتاً "نحیف آواز میں کہا: "جی ہاں!"

"یعنی ہاسٹل میں رہنے والے طالب علم نماز روزے کے زیادہ پابند ہوتے ہیں۔ ملک کی زیادہ خدمت کرتے ہیں، زیادہ سچ بولتے ہیں، نیک زیادہ ہوتے ہیں"۔

میں نے کہا: "جی ہاں:۔"

کہنے لگے: "وہ کیوں؟"

اس سوال کا جواب ایک دفعہ پرنسپل صاحب نے تقسیم انعامات کے جلسے میں نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا تھا۔ اے کاش، میں نے اس وقت توجہ سے سنا ہوتا!

اس کے بعد پھر سال بھر میں ماموں کے گھر میں: "زندگی ہے تو خزاں کے بھی گزر جائیں گے دن" گاتا رہا۔

ہر سال میری درخواست کا یہی حشر ہوتا رہا۔ لیکن میں نے ہمت نہ ہاری۔ ہر سال ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا۔ لیکن اگلے سال گرمی کی چھٹیوں میں پہلے سے بھی زیادہ شدومد کے ساتھ تبلیغ کا کام جاری رکھتا۔ ہر دفعہ نئی نئی دلیلیں پیش کرتا، نئی نئی مثالیں

کام میں لاتا۔ جب شخصیت اور سیرت والے مضمون سے کام نہ چلا تو اگلے سال ہاسٹل کی زندگی کے انضباط اور باقاعدگی پر تبصرہ کیا۔ اس سے اگلے سال یہ دلیل پیش کی کہ ہاسٹل میں رہنے سے پروفیسروں کے ساتھ ملنے جلنے کے موقعے زیادہ ملتے رہتے ہیں اور ان "بیرون از کالج" ملاقاتوں سے انسان پارس ہو جاتا ہے۔ اس سے اگلے سال یہ مطلب یوں ادا کیا کہ ہاسٹل کی آب وہوا بڑی اچھی ہوتی ہے۔ صفائی کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے۔ مکھیاں اور مچھر مارنے کے لیے کئی کئی افسر مقرر ہیں۔ اس سے اگلے سال یوں سخن پیرا ہوا کہ جب بڑے بڑے حکام کالج کا معائنہ کرنے آتے ہیں تو ہاسٹل میں رہنے والے طلبہ سے فرداً "فرداً" ہاتھ ملاتے ہیں، اس سے رسوخ بڑھتا ہے۔ لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، میری تقریروں میں جوش بڑھتا گیا، معقولیت کم ہوتی گئی۔ شروع شروع میں ہاسٹل کے مسئلے پر والد مجھ سے باقاعدہ بحث کیا کرتے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد انھوں نے یک لفظی انکار کا رویہ اختیار کیا۔ پھر ایک آدھ سال مجھے ہنس کے ٹالتے رہے اور آخر میں یہ نوبت آن پہنچی کہ وہ ہاسٹل کا نام سنتے ہی ایک طنز آمیز قہقہے کے ساتھ مجھے تشریف لے جانے کا حکم دے دیا کرتے تھے۔

ان کے اس سلوک سے آپ یہ اندازہ نہ لگائیے کہ ان کی شفقت کچھ کم ہو گئی تھی۔ ہرگز نہیں۔ حقیقت صرف اتنی ہے کہ بعض ناگوار حادثات کی وجہ سے گھر میں میرا اقتدار کچھ کم ہو گیا تھا۔

اتفاق یہ ہوا کہ جب میں نے پہلی مرتبہ بی۔ اے کا امتحان دیا تو فیل ہو گیا۔ اگلے سال ایک مرتبہ پھر یہی واقعہ پیش آیا۔ اس کے بعد بھی تین چار دفعہ یہی قصہ ہوا تو گھر والوں نے میری امنگوں میں دلچسپی لینی چھوڑ دی۔ بی۔ اے میں پے در پے فیل ہونے کی وجہ سے میری گفتگو میں ایک سوز تو ضرور آگیا تھا لیکن کلام میں وہ پہلے جیسی شوکت اور میری رائے کی وہ پہلے جیسی وقعت اب نہ رہی تھی۔

ہر سال امتحان کے بعد جب گھر آتا تو والدین کو نتیجے کے لیے پہلے ہی سے تیار کر دیتا۔ رفتہ رفتہ نہیں بلکہ یک لخت اور فوراً۔ رفتہ رفتہ تیار کرنے سے خوامخواہ وقت ضائع ہوتا ہے اور پریشانی مفت میں طول کھینچتی ہے۔ ہمارا قاعدہ یہ تھا کہ جاتے ہی کہہ دیا

کرتے تھے کہ اس سال تو کم از کم پاس نہیں ہو سکتے۔ والدین کو اکثر یقین نہ آتا۔ ایسے موقعوں پر طبیعت کو بڑی الجھن ہوتی ہے۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے میں پرچوں میں کیا لکھ کر آیا ہوں۔ اچھی طرح جانتا ہوں کہ ممتحن لوگ اگر نشے کی حالت میں پرچے نہ دیکھیں تو میرا پاس ہونا قطعاً" ناممکن ہے۔ چاہتا ہوں کہ میرے تمام بہی خواہوں کو بھی اس بات کا یقین ہو جائے تاکہ وقت پر ان کو صدمہ نہ ہو۔ لیکن یہ بہی خواہ ہیں کہ میری تمام تشریحات کو محض کسرِ نفسی سمجھتے ہیں۔ آخری سالوں میں والد کو فوراً یقین آجایا کرتا تھا۔ کیونکہ تجربے سے ان پر ثابت ہو چکا تھا کہ میرا اندازہ غلط نہیں ہوتا۔ لیکن ادھر ادھر کے لوگ :"اجی نہیں صاحب" "اجی کیا کہہ رہے ہو" "اجی یہ بھی کوئی بات ہے" ایسے فقروں سے ناک میں دم کر دیتے۔ بہر حال اب کے پھر گھر پہنچتے ہی ہم نے حسب دستور اپنے فیل ہونے کی پیشین گوئی کر دی۔ دل کو یہ تسلی تھی کہ بس یہ آخری دفعہ ہے، اگلے سال ایسی پیشین گوئی کرنے کی کوئی ضرورت نہ ہوگی۔

ساتھ ہی خیال آیا کہ وہ ہاسٹل کا قصہ پھر شروع کرنا چاہیے۔ اب تو کالج میں صرف ایک ہی سال باقی رہ گیا ہے' اب بھی ہاسٹل میں رہنا نصیب نہ ہوا تو عمر بھر گویا آزادی سے محروم رہے۔ گھر سے نکلے تو ماموں کے ڈربے میں اور جب ماموں کے ڈربے سے نکلے تو شاید اپنا ایک ڈربہ بنانا پڑے گا۔ آزادی کا ایک سال' صرف ایک سال اور یہ آخری موقع ہے۔

آخری درخواست کرنے سے پہلے میں نے تمام ضروری مصالحہ بڑی احتیاط سے جمع کیا۔ جن پروفیسروں سے مجھے اب ہم عمری کا فخر حاصل تھا' ان کے سامنے نہایت بے تکلفی سے اپنی آرزوؤں کا اظہار کیا اور ان سے والد کو خط لکھوائے کہ اگلے سال لڑکے کو ضرور آپ ہاسٹل میں بھیج دیں۔ بعض کامیاب طلبہ کے والدین سے بھی اسی مضمون کی عرض داشتیں بھجوائیں۔ خود اعداد و شمار سے ثابت کیا کہ یونیورسٹی سے جتنے لڑکے پاس ہوتے ہیں ان میں سے اکثر ہاسٹل میں رہتے ہیں اور یونیورسٹی کا کوئی وظیفہ یا تمغہ یا انعام تو کبھی ہاسٹل سے باہر گیا ہی نہیں۔ میں حیران ہوں کہ یہ دلیل مجھے اس سے پیشتر کبھی کیوں نہ سوجھی تھی۔ کیونکہ یہ بہت ہی کارگر ثابت

ہوئی۔ والد کا انکار نرم ہوتے ہوتے غور وخوض میں تبدیل ہو گیا لیکن پھر بھی ان کے دل سے شک رفع نہ ہوا۔ کہنے لگے :

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جس لڑکے کو پڑھنے کا شوق ہو وہ ہاسٹل کی بجائے گھر پر کیوں نہیں پڑھ سکتا"۔

میں نے جواب دیا کہ : "ہاسٹل میں ایک علمی فضا ہوتی ہے' جو ارسطو اور افلاطون کے گھر کے سوا اور کسی گھر میں دستیاب نہیں ہو سکتی۔ ہاسٹل میں جسے دیکھو بحرِ عُلوم میں غوطہ زن نظر آتا ہے۔ باوجود اس کے کہ ہر ہاسٹل میں دو دو سو تین تین سو لڑکے رہتے ہیں پھر بھی وہ خاموشی طاری ہوتی ہے کہ قبرستان معلوم ہوتا ہے۔ وجہ یہ کہ ہر ایک اپنے اپنے کام میں لگا رہتا ہے۔ شام کے وقت ہاسٹل کے صحن میں جابجا طلبہ علمی مباحثوں میں مشغول نظر آتے ہیں۔ علی الصباح ہر ایک طالب علم کتاب ہاتھ میں لیے ہاسٹل کے چمن میں ٹہلتا نظر آتا ہے۔ کھانے کے کمرے میں' کامن روم میں' غسل خانوں میں' برآمدوں میں' ہر جگہ لوگ فلسفے اور ریاضی اور تاریخ کی باتیں کرتے ہیں۔ جن کو انگریزی کا شوق ہے وہ دن رات آپس میں شیکسپیئر کی طرح گفتگو کرنے کی مشق کرتے ہیں۔ ریاضی کے طلبہ اپنے ہر ایک خیال کو الجبرے میں ادا کرنے کی عادت ڈال لیتے ہیں۔ فارسی کے طلبہ رباعیوں میں تبادلہ خیالات کرتے ہیں۔ تاریخ کے دلدادہ ----"

والد نے اجازت دے دی۔

اب ہمیں یہ انتظار کہ کب اگلے سال کے لیے عرضی بھیجیں۔ اس دوران میں ہم نے ان تمام دوستوں سے خط و کتابت کی جن کے متعلق یقین تھا کہ اگلے سال پھر ان کی رفاقت نصیب ہو گی اور انھیں یہ مژدہ سنایا کہ آئندہ سال ہمیشہ کے لیے کالج کی تاریخ میں یادگار رہے گا کیونکہ ہم تعلیمی زندگی کا ایک وسیع تجربہ اپنے ساتھ لیے ہاسٹل میں آ رہے ہیں' جس سے ہم طلبہ کی نئی پود کو مفت مستفید فرمائیں گے۔ اپنے ذہن میں ہم نے ہاسٹل میں اپنی حیثیت ایک مادرِ مہربان کی سی سوچ لی' جس کے اردگرد ناتجربہ کار طلبہ مرغی کے بچوں کی طرح بھاگتے پھریں گے۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب کو جو کسی

زمانے میں ہمارے ہم جماعت رہ چکے تھے، لکھ بھیجا کہ جب ہم ہاسٹل میں آئیں گے تو فلاں فلاں مراعات کی توقع آپ سے رکھیں گے اور فلاں فلاں قواعد سے اپنے آپ کو مستثنیٰ سمجھیں گے، "اطلاعاً" عرض ہے۔ اور یہ سب کچھ کر چکنے کے بعد ہماری بد نصیبی دیکھیے کہ جب نتیجہ نکلا تو ہم پاس ہو گئے۔

ہم پر تو جو ظلم ہوا سو ہوا، یونیورسٹی والوں کی حماقت ملاحظہ فرمائیے کہ ہمیں پاس کر کے اپنی آمدنی کا ایک مستقل ذریعہ ہاتھ سے گنوا بیٹھے۔

(پطرس کے مضامین)

سوالات

۱۔ انٹرنس پاس کرنے کے بعد مضمون نگار نے مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے اپنے والدین کو کیا تجویز دی اور اسے کیوں رد کر دیا گیا؟

۲۔ مضمون نگار کو اپنے ماموں کے گھر پر رہنے میں کن کن باتوں سے چڑ تھی؟

۳۔ مصنف نے اپنے والد کو ہاسٹل میں داخل ہونے کے لیے آخری بار کیا کیا دلائل پیش کیے اور ان کا کیا اثر ہوا؟

۴۔ مضمون نگار کی ہاسٹل میں پڑھنے کی حسرت کیوں پوری نہ ہو سکی؟

۵۔ اس مضمون میں جہاں جہاں مزاحیہ مواقع پیدا ہوتے ہیں، ان کی نشاندہی کیجیے۔

۶۔ رموزِ اوقاف سے مراد وہ علامات ہیں جو تحریر میں ایک جملے کو دوسرے جملے سے یا کسی جملے کے ایک حصے کو دوسرے حصوں سے علیحدہ کریں۔ رموزِ اوقاف کی مدد سے قاری کو معلوم ہو جاتا ہے کہ جملوں کو کس طرح پڑھنا ہے یا جملے کے کس حصے کو کس طرح ادا کرنا ہے اور کہاں کہاں اور کس کس قدر توقف کرنا ہے۔ اگر یہ علامتیں نہ ہوں تو عبارت مسلسل الفاظ و حروف کا ملغوبہ بن کر رہ جائے اور اس کا مفہوم سمجھنے میں دشواری پیش آئے اور

عبارت کے خلط ملط ہونے کا اندیشہ بھی باقی رہے۔ ان اوقاف کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ ذہن ہر جملے کے ہر جزو کی اہمیت جان لیتا ہے اور عبارت کا مطلب سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے اور دوسری بڑی بات یہ ہے کہ ان کی وجہ سے نظر کو سکون ملتا ہے اور وہ تھکنے نہیں پاتی۔

رموزِ اوقاف کا آغاز بغداد و دمشق اور اندلس کے علما نے کیا۔ اہلِ یورپ نے علمائے اندلس کی تقلید کی اور تھوڑے سے تغیر سے ان ہی اوقاف کو اپنے یہاں رائج کر لیا۔ آج دنیا کی کم و بیش ہر علمی و ادبی زبان میں رموزِ اوقاف کے طور پر کچھ نہ کچھ علامتیں مقرر اور مستعمل ہیں۔ اردو میں اس مقصد کے لیے جو علامتیں بالعموم استعمال کی جاتی ہیں ان کے نام اور شکلیں حسبِ ذیل ہیں۔

سکتہ یا وقفِ خفیف (،) وقفہ یا نصفِ وقف (؛) رابطہ یا وقفِ لازم (:) تفصیلہ (:-) ختمہ یا وقفِ مطلق (۔) استفہامیہ یا سوالیہ (؟) ندائیہ اور فجائیہ (!) قوسین [{()}] خط یا لکیر (----)

اس سبق میں جہاں جہاں رموزِ اوقاف کا استعمال ہوا ہے، ان کے استعمال پر غور کیجیے اور ان علامات کے نام بتائیے۔

○☆○☆○☆○☆○☆○

مولانا صلاح الدین احمد

(۱۹۰۱ء - ۱۹۶۴ء)

اردو ناول ــــــ نذیر احمد سے پریم چند تک

نذیر احمد تک پہنچتے پہنچتے ہمارے ناول نے طرزِ جدید کا وہ لباس پہن لیا تھا جو آج بھی اس کے قدِ موزوں پر بدزیب نہیں لگتا۔ نذیر احمد صحیح معنوں میں اردو کے پہلے ناول نگار تھے اور اگرچہ انھوں نے اپنے بیشتر ناول اپنے سماجی اور عمرانی نظریات کی تبلیغ کے لیے لکھے، لیکن وہ طبعاً قصہ گو تھے اور قصہ گوئی کے فن کی بہت سی باریکیاں اور خوبیاں انھیں فطری طور پر ارزانی ہوئی تھیں۔ اس لیے ایک شدید قسم کی مقصدیت کے باوجود وہ بار بار اپنے راستے سے بھٹک کر فنی افسانویت کی شاداب وادیوں میں گم ہو جاتے ہیں اور ان کا ناظر چند سنہری لمحوں کے لیے مصلح نذیر احمد سے مخلصی پا کر فن کار نذیر احمد سے آشنا ہو جاتا ہے ــ ان کا یہ صحت مند رجحان ان کے مشہور ناول' فسانۂ مبتلا کے آخری حصے اور ایک دوسرے مگر کم معروف ناول ایامیٰ کے بیشتر متن پر چھایا ہوا ہے اور اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ نذیر احمد اگر سرسید کی اسلامی تحریک کے نسوانی حصے کے 'مدار المہام' نہ ہوتے تو اردو افسانہ نگاری کو ایک بہت بڑا فن کار ہاتھ آجاتا۔

جس زمانے میں نذیر احمد اپنے اصلاحی مقالے، مکالمے اور کہانی کے روپ میں پیش کر رہے تھے اور انھیں خود بھی معلوم نہیں تھا کہ اردو افسانہ نگاری کے ایوان میں پہلی بار جدید طرز کے ناول کو بار دے رہے ہیں اور آنے والی نسلیں انھیں ایک معاشرتی مصلح کے طور پر نہیں بلکہ اپنی زبان کے سب سے پہلے ناول نگار کی حیثیت سے یاد رکھیں گی۔ عین اسی زمانے میں سرزمینِ اودھ نے دو بہت بڑے صاحب قلم پیدا کیے اور ان دونوں کے کارناموں نے ہماری ادبیات میں ناول کو پہلی بار ایک مُسلّم الثبوت حیثیت عطا کی۔ اردو افسانہ نگاری کے یہ عظیم المرتبت استاد (میری مراد پنڈت رتن ناتھ سرشار اور مولانا عبدالحلیم شررؔ سے ہے) زندگی بھر اپنی مخصوص نگارشات میں

منہمک رہے۔ دونوں نے اپنی اپنی کارگاہ میں نت نئے تجربے کیے اور اس وقت تک برابر لکھتے چلے گئے جب تک کہ فرشتۂ اجل نے ان کے ہاتھوں سے قلم نہ چھین لیا۔ بعض لوگ شرر کو اردو کا والٹر سکاٹ اور سرشار کو اس زبان کا چارلس ڈکنز کہتے ہیں۔ ممکن ہے کہ بعض اعتبارات سے یہ تشبیہ درست ہو' مگر میری رائے میں یہ دونوں فن کار اپنی اپنی جگہ ایک مستقل اور آزاد حیثیت رکھتے تھے جو انہی سے خاص تھی اور کسی لحاظ سے مستعار نہیں تھی ـــــ سرشار کا سب سے بڑا کارنامہ فسانہ آزاد ہے اور اگرچہ اس نے متعدد ناول ایسے بھی لکھے ہیں جن میں ناول کی تکنیک کو فسانہ آزاد کی بہ نسبت بہت زیادہ پابندی سے نبھایا گیا ہے۔ لیکن جو مقبولیت اپنی آزادی اور بے راہ روی کے باوجود فسانہ آزاد کو نصیب ہوئی وہ آج تک ہمارے کسی افسانوی شاہکار کے حصے میں نہیں آئی اور میری رائے میں اس کی بعض اقدار زندۂ جاوید رہیں گی۔ فسانہ آزاد کی نگارش میں کوئی اصلاحی یا تبلیغی مقصد مصنف کے پیش نظر نہیں تھا اور اگر تھا بھی تو اس قدر نامحسوس تھا کہ لطیف سے لطیف طبیعت پر بھی گراں نہیں گزرتا تھا۔ سرشار محض تفریح و تفنّن کے لیے لکھتے تھے اور اگر ہنسی ہنسی میں وہ ہماری بعض سماجی برائیوں کو بھی بے نقاب کر جاتے تھے تو ان کا ناظر بدکتا نہیں تھا۔ بلکہ ایسے تاثرات کو کمال خوش دلی سے جذب کر لیتا تھا اور یہی لکھنے والے کا مطلوب تھا۔ فسانہ آزاد کا کینوس یعنی تصویر کشی کا پردہ بڑا وسیع ہے اس لیے وہ ایک آدھ پختہ کردار مثلاً خوجی اور دو چار ٹائپ یعنی ڈھلے ڈھلائے نمونے' مثلاً لاڈلے نواب یا بی اللہ رکھی کے سوا کوئی معرکے کے کردار پیش نہیں کر سکا اور یہی سرشار کی سب سے بڑی خامی ہے۔ اس کا پھیلاؤ اسے نگینہ ساز نہ بنا سکا۔ شرر نے تاریخ خصوصاً قرونِ وسطیٰ کی اسلامی تاریخ کو اپنا مرکز نگارش بنایا اور اس خوبی سے بنایا کہ اگر آج عوام کو تاریخ اسلام کے چیدہ چیدہ واقعات اور مسلمانوں کے بڑے بڑے کارناموں کا کچھ علم اور شاندار ماضی سے کچھ دلچسپی ہے تو اس کیفیت میں بلا مبالغہ شرر کے تاریخی ناولوں کو بہت بڑا دخل ہے۔ شرر ان صاحبِ بصیرت اہلِ قلم میں سے تھے جو وقت کے تقاضوں کو پہچانتے اور ان سے فائدہ اٹھانا جانتے ہیں۔ انیسویں صدی کے انجام اور بیسویں صدی کے آغاز کا زمانہ مسلمانانِ ہند کے لیے ایک شدید ذہنی بحران کا زمانہ تھا۔ ان کا سیاسی تفوّق ختم ہو چکا تھا اور نئے نظام

میں ان کے لیے کوئی آبرو کی جگہ نہیں رہی تھی ایسے میں یہ بے حد ضروری تھا کہ ان کے حواس یکجا کر کے ان کی ہمت بڑھائی جائے اور دوش کے آئینے میں انھیں فردا کی تصویر دکھائی جائے۔ شرر نے اپنے تاریخی ناولوں میں بیشتر یہی مقصد پیش نظر رکھا ہے اور اس شدت سے رکھا ہے کہ بعض جگہ مقصد کے مُعبَد میں فنی لوازم کو بے دریغ قربان کر دیا گیا ہے۔ شرر کے تاریخی ناولوں میں فنی لحاظ سے زوال بغداد سب سے ممتاز ہے اور فلورا فلورینڈا اور ملک العزیز ورجنا بھی خاصے کی چیزیں ہیں۔ وہ تاریخی واقعات کو حسن و عشق کی چاشنی میں اس انداز سے سموتے تھے کہ ناظر کا حافظہ اس کی کیفیات سے مدتوں حلاوت اندوز رہتا ہے۔ انھیں منظر کشی میں بھی کمال حاصل تھا اور بسا اوقات وہ کسی فعل میں بیان ہونے والے واقعات کے لیے اس کے آغاز ہی میں مناسب پس منظر اور فضا تیار کر دیتے تھے اور ان کا ذہین ناظر اس فضا کے مطالعے ہی سے پیش آنے والے واقعات کی کیفیت کا اندازہ کر لیتا تھا یہ سب کچھ تھا لیکن کردار نگاری ان کے بس کا روگ نہیں تھا اور اگر شرر اسی درجے کے کردار نگار بھی ہوتے جس پائے کے وہ واقعات نویس اور منظر نگار تھے تو یقیناً اردو کے سب سے بڑے ناولسٹ تسلیم کیے جاتے۔

شرر اور سرشار کے ساتھ ساتھ اودھ نے ایک اور باکمال ناول نگار پیدا کیا جس کی نگاہ نہ تاریخ پر تھی نہ اصلاح پر اور نہ سرشار کی طرح اس کا اشہبِ قلم ایک وسیع و عریض کینوس پر بے لگام ہو کر دوڑنے لگتا تھا۔ یہ مرزا رسوا تھے جنھوں نے امراؤ جان ادا لکھ کر اردو ناول کو بیک جست اعلیٰ درجے کے مغربی ناولوں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ رسوا نے امراؤ جان ادا کے علاوہ اور بھی ناول لکھے ہیں لیکن وہ بہت معمولی درجے کے ہیں۔ امراؤ جان کی کامیابی کا سب سے بڑا راز یہ تھا کہ رسوا نے ہماری زبان میں پہلی بار ایک جیتا جاگتا دلکش نسوانی کردار پیش کیا تھا۔ ہماری کہانیاں جب سے پریوں کے سائے سے آزاد ہوئی تھیں ان کی جگہ یا تو بے جان قسم کی عورتوں نے لے لی تھی، مثلاً ڈپٹی نذیر احمد کی اصغری نے یا ایسے نسوانی کرداروں نے جسے ناظر کی چشم تخیل ہی دیکھ سکتی تھی۔ چشم تماشا نے انھیں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ عورت ہماری سوسائٹی سے یکسر غائب تھی، پھر ناول نگار اپنے قصوں میں جان ڈالنے کے لیے اسے کہاں سے پکڑ

لاتے۔ رسوا نے اجتہاد سے کام لے کر اپنے ناول کی جان اس عورت کو بنایا جو اپنے وقت کی سوسائٹی میں موجود تھی اور نہ صرف موجود تھی بلکہ اس کی روح رواں تھی ——اس غیر معمولی اقدام نے نہ صرف اس کی نگارش میں ایک فطری اور دل افروز کیفیت پیدا کر دی بلکہ اسے دوام اور استقلال کی خصوصیات سے بھی ممتاز کیا۔ یہی وجہ ہے کہ دیوانِ غالب کی طرح امراؤ جان ادا آج اپنی نمود اولین کے زمانے کی بہ نسبت بہت زیادہ مقبول و محبوب ہے اور توقع کی جا سکتی ہے کہ آرٹ کے حقیقی مظاہر کی طرح اس کی بنیادی اقدار کبھی زائل نہیں ہوں گی۔

سوسائٹی میں عورت کے وجود نے جو سماجی مسائل پیدا کیے ان میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کی جستجوئے حسن اور تلاشِ رفاقت کا مسئلہ نہایت اہم تھا۔ مغربی تعلیم کے اتصالِ اوّلیں نے اس جستجو کو اور بھی تیز کر دیا تھا۔ چنانچہ بیسویں صدی کے آغاز میں یہ اپنی پوری شدت سے مرزا محمد سعید دہلوی کے ناول خوابِ ہستی میں نمودار ہوئی اور معرضِ شہود میں آتے ہی ہمارے ذہین نوجوانوں کی شخصیاتی کیفیتوں سے ہم آہنگ ہو گئی۔ خوابِ ہستی کے مصنف نے جو مسئلہ پیش کیا تھا اگرچہ وہ اسے پوری طرح حل نہ کر سکا اور اپنے جواب کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے اسے اپنے ناظر کو باطن کے پردوں اور روحانیت کے دھندلکوں کے پیچھے لے جانا پڑا۔ تاہم ایک اعلیٰ درجے کا نفسیاتی ناول لکھ کر اس نے اپنے وقت کے تقاضوں کو بوجوہ احسن پورا کیا۔

مرزا محمد سعید دہلوی نے جس زمانے میں اردو کا پہلا نفسیاتی ناول لکھا تقریباً اسی زمانے میں علامہ راشد الخیری نے وہ قلم پھر سے اٹھا لیا۔ جسے مولوی نذیر احمد نے قرآن مجید کا ترجمہ کرنے سے پہلے اپنے قلم دان میں رکھ دیا تھا۔ راشد الخیری نذیر احمد کے روحانی وارث تھے اور عورتوں کی فلاح و بہبود کا جو کام مولوی صاحب نے ادھورا چھوڑا تھا علامہ صاحب نے اس کی تکمیل کا بیڑا اٹھایا اور مولوی صاحب کے پانچ چھ ناولوں کے مقابل کم و بیش چالیس ناول لکھ ڈالے۔ یہ ناول کسی زمانے میں ہمارے نسوانی ادب پر چھا گئے تھے اور ان کی لاکھوں جلدیں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گئی تھیں۔ وجہ اس قبولِ عام کی یہ تھی کہ نذیر احمد کے منطقی انداز کے خلاف راشد نے اپنی

نگارشات میں ایک شدید قسم کا جذباتی انداز اختیار کیا تھا اور چونکہ اس کا مخاطب طبقہ یعنی طبقۂ نسواں خود بے حد جذباتی اور فکر کی نسبت جذبے سے بہت متأثر ہوتا ہے اس لیے راشد الخیری کی یہ ترکیب بہت کامیاب رہی اور وہ نہ صرف ایک اعلیٰ درجے کے ناول نگار بلکہ طبقۂ نسواں کے بہت بڑے محسن قرار دیے گئے۔ ہمیں ان کے مؤخر الذکر مرتبے سے بحث نہیں ہے۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو ان کے ناولوں میں ہمیں کوئی ایسا عنصر نہیں ملتا جو ان کی فنی عظمت کا شاہد اور ان کے دوام کا کفیل ہو۔ نذیر احمد کی اکبری اور ہریالی آج بھی اسی طرح تروتازہ ہیں، جس طرح وہ آج سے کم وبیش اَسّی برس پیشتر تھیں۔ لیکن راشد الخیری کی بے شمار ہیروئنوں میں سے ہمیں نسیمہ کے سوا اور کوئی ہیروئن یاد نہیں اور نسیمہ بھی چونکہ آنسوؤں کی ملکہ تھی اور آج کی ناول پڑھنے والی عورت کو آنسوؤں کی بہ نسبت مسکراہٹیں زیادہ پسند ہیں اس لیے ان کی یاد بھی زیادہ دیر تک باقی نہیں رہے گی۔ غم نوازی اور غم انگیزی کے خلاف خود طبقہ نسواں میں اس کا شدید ردِعمل علامہ صاحب کی زندگی میں ہی شروع ہو گیا تھا۔ چنانچہ بعض تعلیم یافتہ مصنفات نے اونچے اور درمیانی طبقے کی زندگی کے پس منظر پر بعض نہایت دلچسپ ناول اسی زمانے میں لکھے جب شام زندگی اور طوفان حیات نے نسوانی دنیا میں ایک ہیجان برپا کر رکھا تھا۔ ان میں گودڑی کا لال خاص طور پر کامیاب ہوا۔ میں نے عملاً بعض ناولوں کا تفصیلی ذکر اس لیے نہیں کیا کہ وہ ناول نگاری میں کسی مخصوص رجحان کی رہبری نہیں کرتے اور اگرچہ وہ اپنے اپنے دَور میں اپنی عام دلچسپی کے باعث مقبول ضرور ہوئے۔ ان میں گورا نیل کا سانپ۔ شہاب کی سرگزشت اور شاہد رعنا ممتاز ہیں۔ شاہد رعنا امراؤ جان ادا کے تتبع میں لکھی گئی تھی۔ لیکن چونکہ حقیقت سے معرّیٰ تھی اس لیے ایک محدود سی تب وتاب کے بعد معدوم ہو گئی۔ ناول کے سلسلۂ طوائفیہ کی ایک قابلِ ذکر کتاب لیلیٰ کے خطوط ہے۔ جو اپنی تکنیک کے اعتبار سے منفرد تھی اور شاید اس بل پر ابھی ایک عرصہ دراز تک زندہ رہے گی۔ ناول کا کارواں اسی انداز سے رواں تھا کہ پہلی جنگ عظیم کے زمانے کے آس پاس اس میں دو شہسوار اور شامل ہوئے۔ ایک کا نام عظیم بیگ چغتائی تھا اور دوسرے کا نام پریم چند۔ عظیم بیگ اپنے آرٹ میں یگانہ اور اپنے انداز میں منفرد تھے۔ وہ دائم المرض

ہونے کے باعث جسمانی حرکت اور جوش سے محروم تھے۔ لیکن ان کی یہ محرومی ان کے ناولوں میں بڑی شدت سے انتقام لیتی ہے اور ان کے کردار زندگی کی اچھل کود اور دوڑ بھاگ میں ضرورت سے زیادہ مصروف نظر آتے ہیں۔ وہ مسکراتے نہیں بلکہ دیوانہ وار قہقہہ لگاتے ہیں اور اپنے ناظرین سمیت زندگی کے رقص گرداں میں کود کر اس کی ہماہمی میں گم ہو جاتے ہیں۔ عظیم بیگ کا مطالعہ خاطر افسردہ کے لیے حیاتِ تازہ کا پیغام رکھتا ہے۔ اور اب پریم چند —— پریم چند ہمارا سب سے بڑا افسانہ نگار ہی نہیں بلکہ شاید سب سے بڑا ناول نگار بھی تھا۔ وہ طبعاً ایک فن کار تھا لیکن جس سماج میں وہ پیدا ہوا اور زندہ رہا، اس کے لچر اور بے معنی تقاضوں نے اس کے فن کا گلا گھونٹ کر رکھ دیا۔ سماج کے اس ظلم کا ایک نمایاں ثبوت اس کا مشہور ناول بازار حسن ہے۔ بازار حسن کا پہلا حصہ سمن اس کی ہیروئن کے دل آویز کردار کی فطری نشو و نما سے ایک شاہکار کا درجہ اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن اس ناول کا دوسرا حصہ سماجی تقاضوں کے دباؤ سے ایک ابھرتے ہوئے کردار کو مسخ اور اول درجے کے ناول کو تباہ کر دیتا ہے۔ میدان عمل اور گئودان میں اس نے کچھ جرأت سے کام لیا ہے اور سماج کے اجارہ داروں سے اس حد تک نہیں دبا جس حد تک وہ دبنے کا خوگر ہو چکا تھا۔ اس لیے یہ دونوں ناول ہمارے افسانوی لٹریچر میں ایک دوامی اور مستقل حیثیت رکھتے ہیں پریم چند کے دیگر ناول بھی اپنے زمانے کے معیار کے لحاظ سے خاصے ہیں۔ ان کا مصنف زندگی کا ایک نہایت زیرک ناظر تھا اور جو کچھ وہ دیکھتا تھا اسے نہایت وفاداری سے صفحۂ قرطاس پر اپنے مخصوص و دل کش انداز میں منتقل کر دیتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ شہری سماج کے گھٹے ہوئے ماحول کی بہ نسبت وہ دیہات کی کھلی ہوئی فضا میں جو بات کہتا تھا وہ اپنی منزلِ مقصود یعنی ناظر کے دل و دماغ تک جلد جا پہنچتی ہے اور اسی میں اس کی جیت ہے۔

(اردو میں افسانوی ادب)

سوالات

۱۔ مولوی نذیر احمد نے اپنے بیشتر ناول کن باتوں کو مد نظر رکھ کر لکھے ہیں؟

۲۔ "فسانہ آزاد" کی مقبولیت کے چند اسباب بیان کیجیے۔

۳۔ مولانا عبدالحلیم شرر نے عام طور پر اپنے ناولوں میں کن مقاصد کو پیشِ نظر رکھا ہے؟

۴۔ مرزا رسوا کے معروف ناول "امراؤ جان ادا" کی کامیابی کا سب سے بڑا راز کیا تھا؟

۵۔ علامہ راشد الخیری کو طبقہ نسواں کا محسن کیوں قرار دیا گیا؟

۶۔ افسانوی ادب میں منشی پریم چند کی وجہ شہرت کیا ہے؟ مختصر بیان کیجیے۔

○☆○☆○☆○☆○☆○

احمد ندیم قاسمی

(ولادت ۱۹۱۶ء)
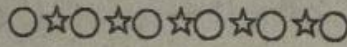
ممتا

پنجاب سے مجھے برطانیہ کے ایک افسر نے بھرتی کیا اور چین کے ایک جزیرے ہانگ کانگ میں بھیج دیا' جہاں چینی بستے تھے اور انگریز گورنر راج کرتا تھا۔ مدتوں سے ہانگ کانگ پولیس کے لیے پنجاب سے سپاہیوں کے گروہ کے گروہ تو بر آمد کیے جاتے ہی تھے۔ لیکن اب ادھر یورپ میں ہٹلر نے جنگ چھیڑ دی تھی اور انگریز وہاں بہت عدیم الفرصت ہو رہا تھا' اس لیے ہانگ کانگ پولیس کے لیے پنجابی نوجوانوں کی مانگ دگنی ہو گئی تھی میں کچھ ایسے گٹھے ہوئے جسم کا جوان نہیں ہوں۔ فوجی بھرتی میں کئی بار منہ کی کھائی ہے۔ مگر اب کے ڈاکٹر نے میری باہر نکلی ہوئی پسلیوں سے نظریں بچا کر میرے لمبے قد کی تعریف کی اور کہا کہ اتنے دراز قد نوجوان سپاہی کو دیکھتے ہی چینی باشندے دہل کر مر جائیں گے۔ ہانگ کانگ پولیس میں چھ فٹ سے کم قد کے نوجوانوں کو بھیجنا بہت بڑی سیاسی غلطی ہے اور اس سیاسی غلطی کی تصحیح کا جذبہ مجھے ہانگ کانگ لے آیا۔

میں نے پرانے ہانگ کانگی سپاہیوں سے سن رکھا تھا کہ ہانگ کانگ میں بڑے مزے ہیں۔ ہر اس ملک میں پولیس کے مزے ہیں جس پر کوئی دوسرا ملک راج کرتا ہے اور ہانگ کانگ تو پولیس کی جنت ہے۔ پستہ قد گداگر چینی عورتوں کو سڑکوں اور بازاروں کی پٹریوں سے بھگا دو' اور جب ان کی گودوں میں سے ان کے بچے پاؤں سے جوتوں کی طرح نکل جائیں تو ان کو گندے چیتھڑے کی طرح چٹکی سے پکڑ کر ان کی ماؤں کی طرف اچھال دو' اور پولیس ہیڈ کوارٹر میں آ کر اس روپہلی خدمت کی سنہری سند حاصل کر لو۔ کولون اور اصل چین کی سرحد پر ہر آنے والے چینی مسافر کی تلاشی لو اور اس کا بوجھ ہلکا کر کے اسے پھر چین میں دھکا دے دو۔ لیکن جب ہمارا جہاز سنگاپور پہنچا تو ایک مدراسی جہازی نے ہوائی اڑا دی کہ ادھر مشرقی سمندروں میں بھی جنگ ہونے

والی ہے۔ جہاز کے انگریز کپتان نے یہ افواہ سنی تو اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ غلط افواہ پھیلانے کے جرم میں مدراسی جہازی کو ملازمت سے برطرف کر دیا اور سنگاپور ہی میں انگریز پولیس کے حوالے کر دیا۔۔۔۔۔تاکہ افواہ زیادہ نہ پھیلنے پائے۔

جب ہم ہانگ کانگ پہنچے تو فضا سرگوشیوں میں چھلکتی معلوم ہوئی۔ جنگ ہونے والی ہے' جنگ ہونے والی ہے۔ پھٹی پھٹی آنکھوں میں زبانیں پیدا ہو گئی تھیں اور لوگ یوں تیورا تیورا کر چلتے تھے جیسے قدم قدم پر ان کے سینے کے اندر ہی گولی چل جاتی ہے۔ ہانگ کانگ اور کولون کی بل کھاتی سڑکوں کی پٹڑیوں پر بیٹھے ہوئے چینی پناہ گزین افق کی طرف یوں تکتے رہتے تھے جیسے طیاروں کے انتظار میں ہیں۔ ان کے پھٹے ہوئے ہونٹوں اور اچٹتی ہوئی پٹڑیوں میں ایک ہی سوال کلبلا رہا تھا: "جو کچھ ہونے والا ہے وہ ایک دم سے کیوں نہیں ہو چکتا۔"

بھوکے پیاسے چینی بچوں کے ہجوم روٹی کی تلاش میں سڑکوں پر مارے مارے پھرتے تھے۔ ایک انگریز حکمران نے انتظامیہ کے ایک اجلاس کے دوران میں یہاں تک کہُ دیا تھا کہ اتنے بہت سے بچوں کا کفیل ہونا حکومت کا فرض نہیں۔ جن بچوں کے ماں باپ زندہ ہیں ان کے گلے میں کتوں کی طرح پٹے ہونے چاہییں اور گلے میں پٹے کے بغیر جو لڑکا دکھائی دے اسے کولون کی سرحد پر لے جا کر اصلی چین میں دھکا دے دینا چاہیے۔ پولیس کے پیدل سیر کرنے والے صاحب لوگوں کی آسائش کی خاطر پٹڑیاں صاف رکھنے کا کام سخت دشوار ہو رہا تھا۔ مورچے کھد رہے تھے۔ پناہ گاہیں تعمیر ہو رہی تھیں۔ عمارتوں کے حسن کو ریت کی بوریوں نے چھپا لیا تھا۔ یوں معلوم ہوتا کہ سارے کا سارا ہانگ کانگ زیرِ تعمیر ہے۔

کہتے ہیں ایک زمانے میں ہانگ کانگ کی روشنیاں جب سمندر میں ڈبکیاں لگاتی تھیں اور پھر جب پانی ان روشنیوں کو اوپر انہی روشنیوں کی طرف اچھال دیتا تھا تو پرانے بوسیدہ جسموں میں بھی انگڑائی کی اینٹھن رینگنے لگتی تھی۔ مگر اب ہانگ کانگ اور کولون کا درمیانی سمندر ساری دنیا کے اندھیرے کا منبع معلوم ہوتا تھا۔ اس وقت میں دن کی تربیتی پریڈ سے تھک ہار کر بیرک میں چارپائی پر لیٹے ہوئے ادھر ادھر کی

مزے مزے کی باتیں سوچنے کی کوشش کرتا، مگر اندھیرے اور سناٹے کی دہشت میرے کانوں میں بمباروں کی بھنبھناہٹ بن کر گونجتی اور میں اپنی ماں کو یاد کر کے رو دیتا۔

دن کو بھی جب میں لوگوں کی پتھرائی ہوئی آنکھیں اور فق چہرے دیکھتا تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ سب کے سب اپنی مائیں کھو بیٹھے ہیں، اور انہی کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ مجھے بار بار اپنی ماں یاد آتی تھی۔ مگر دن کے ہنگاموں میں اس تصوّر سے بار بار کترا کر نکل جانے میں کامیاب ہو جاتا، البتہ رات کو یہ تصور میرے ذہن میں اور میری آنکھوں سے چمٹ کر رہ جاتا اور میں تکیے میں منہ چھپا کر بچوں کی طرح روتا رہتا۔

ماں نے مجھے ہانگ کانگ آنے سے روکا تھا اور کہا تھا: "ہانگ کانگ تو وہاں ہے جہاں سے آگے سنا ہے دھرتی ختم ہو جاتی ہے۔ بیٹا تم دلی کلکتہ میں ہوتے تو میں تمھیں خوابوں میں ٹٹول لیتی، پر تم تو ہانگ کانگ جا رہے ہو۔ تمھارے میرے درمیان سمندر اور پہاڑ کھڑے ہو جائیں گے اور پھر میرے لال لام اگر ادھر بھی ہونے لگی اور تمھارے دشمنوں پر بھی کوئی آنچ آگئی تو بتاؤ میں یہاں اس اُجڑے پُجڑے گاؤں میں کس کے ہاتھ کا سہارا لے کر اٹھوں گی۔ نہ جاؤ میرے بیٹے، مجھے بھوکوں زندہ رہنا آتا ہے۔ میں سوچتی ہوں، وہاں تمھارے کپڑے کون دھوئے گا؟ تمھارے بالوں میں تیل کون ڈالے گا؟ تمھاری آنکھ میں سے گری ہوئی پلک کون نکالے گا؟ تمھارے چولے کے بٹن کون ٹانکے گا؟ ——— اور پھر پچھلے سال کی طرح تمھارے دشمنوں کو نمونیا ہو گیا، تو؟ پچھلے سے پچھلے سال کی طرح، میری زبان کوئلہ ہو جائے، اگر تمھارے دشمنوں کے آدھے سر میں درد اٹھا تو تمھاری کنپٹیوں میں روغن بادام کون مَلے گا؟ نہیں بیٹا نہ جاؤ چلو میرے گھٹنے سے لگ کر بیٹھ جاؤ۔ بھوکوں مریں گے پر اکٹھے تو مریں گے۔ اور بیٹا تم ہانگ کانگ میں ہوئے اور ادھر میں مر گئی تو میری قبر میں تمھارے حصے کی مٹھی بھر مٹی کون ڈالے گا۔ جو مولوی جی کہتے ہیں ماں کی قبر اندھیرے میں جھولی بھر ستاروں کی طرح چمکتی رہتی ہے، بتاؤ....."

لیکن میں چلا آیا تھا اور جب آتے وقت میں نے ماں کی طرف دیکھا تو اس کے چہرے کی کوئی جھری ایسی نہ تھی جس میں آنسو ندی بن کر پھیل نہ گئے ہوں۔

آنسوؤں میں ڈوبا ہوا یہ چہرہ جیسے میری پتلیوں میں گھس گیا تھا۔ رات کو بیرک میں مجھے اس فق چہرے کے سوا اور کچھ نظر نہ آتا تھا اور پھر میں ماں کی جمی ہوئی نظروں سے ڈرنے لگتا اور حواس باختہ ہو کر اس سے سرگوشی کرتا تھا "ماں تمھاری پلکیں جھپکتی ہی نہیں۔ تمھاری پتلیاں تو ہلتی ہی نہیں۔ تم کسے دیکھ رہی ہو ماں !" اور یہ سوال میں اس لیے پوچھتا تھا کہ مجھے میری ماں چینی پناہ گزینوں کی طرح افق کی طرف تکتی نظر آتی تھی۔ جہاں سے کہتے ہیں ایک منٹ میں ایک ہزار بم برسانے والے ہوائی جہازوں کو نمودار ہونا تھا۔

اور پھر ایک دن یہ نظریں افق پر جمی رہ گئیں۔ بمبار کسی اور سمت سے آ نکلے۔ پیانو اور آرگن کی صداؤں میں لپٹا ہوا ہانگ کانگ بموں کے دھماکوں سے بلبلا اٹھا۔ طیارہ شکن توپیں چند مرتبہ بھونکیں' اور پھر گردنیں نہوڑا کے تھکے اژدھوں کی طرح پلٹ گئیں۔ بجلی اور تار کے اکھڑے ہوئے کھمبے بلندی پر سے پٹخنیاں کھاتے ہوئے گرے اور سڑکوں پر بکھرے ہوئے' پناہ گزینوں کا بھیجہ چاٹتے ہوئے ساحل پر بکھر گئے۔ شہروں کی عمارتوں نے اپنی جگہ بدل لی۔ دیواروں کے ملبے باغیچوں میں آن گرے تو باغیچے کی جھاڑیاں ہال کمرے میں بکھر گئیں۔ ڈیوٹی پر کھڑے ہوئے ایک پنجابی سپاہی کے پیٹ میں بم کا ایک سپلنٹر پیوست ہو گیا۔ انتڑیاں باہر نکل آئیں' موت کے کرب میں اس نے چند بل کھائے تو اس کی انتڑیاں اس کی گردن میں پھنس گئیں اور ایک انگریز افسر نے بموں کے خوف سے بے نیاز ہو کر اس کی تصویر اتار لی۔ ہم غیر تربیت یافتہ سپاہیوں کو پناہ گاہوں میں دھکیل دیا گیا۔ جہاں انگریز بچے اور انگریز مائیں تک "ممی ممی" کراہ رہی تھیں۔ ایک بوڑھی انگریز عورت پناہ گاہ کے دروازے کے پاس سے ہر چہرے کو پڑھتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تُلے کھڑے تھے اور وہ ایک ہاتھ سے ٹھوڑی کے نیچے لٹکتی ہوئی جھلی کو مسلے جا رہی تھی اور جب وہ آخری چہرہ پڑھ چکی تو "میرا بیٹا" کہہ کر دھم سے گر پڑی اور ہم سب کے منہ لٹک گئے۔

جاپانیوں کے آنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ وہ آئے اور قابض ہو گئے اور میں

جو پنجاب سے ہانگ کانگ میں پولیس کا سپاہی بننے آیا تھا جنگی قیدی بنا دیا گیا۔ اس روز میں خوب خوب رویا۔ مجھے کچھ ایسا لگتا تھا جیسے میں اپنی زندگی کی عزیز ترین متاع یعنی اپنی ماں کو کھو بیٹھا ہوں، جیسے جنگ نے میری بانھوں سے میری ماں کو کھسوٹ لیا ہے، جیسے اب تک میں ہانگ کانگ میں اپنی ماں کے پہلو میں بیٹھا تھا مگر اب اس کی لاش کو دفن کر کے خالی ہاتھ رہ گیا ہوں۔ باوجود ہزار کوشش کے اب ماں کا فق چہرہ بھی میرے سامنے نہیں ابھرتا تھا۔ اس چہرے کے مانوس نقوش دھندلا گئے تھے ہر طرف جیسے غبار اڑنے لگا تھا۔

چند روز تک اسی کیفیت میں قیدیوں کے باڑے میں بند پڑا رہا۔ میرا بند بند ٹوٹ چکا تھا اور جسم بالکل کھوکھلا ہو گیا تھا۔ کبھی بھولے سے سر ہلایا تو کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے ایک پتھر ایک کان سے لڑھک کر دوسرے کان سے ٹکرا گیا ہے بعض اوقات پھیپھڑوں میں سانس جاتی تھی اور وہیں کی ہو رہتی تھی۔ اور میں سینے پر گھونسا مار کر دوسری سانس لے پاتا تھا۔

مگر جلد ہی میں اس قید سے مانوس ہو گیا اور پھر جاپانیوں سے مانوس ہونے میں تو مجھے کوئی دیر نہ لگی۔ میری قمیض کے بٹن ٹوٹ گئے تھے۔ ایک دن ایک جاپانی سے میں نے ایک بٹن کی بھیک مانگی تو اس نے میرے سینے کے بالوں کا ایک گچھا ایک جھٹکے سے توڑ کر میرے ہاتھ میں دے دیا اور کہا "اسے باندھ لو" ٹوٹے ہوئے بالوں کی جڑوں میں سے پھوٹتے ہوئے خون نے جاپانیوں سے مانوس ہونے کی پہلی منزل طے کرا دی۔ حکم ملا کہ سب قطار میں کھڑے ہو جاؤ۔ حکم دینے والا جاپانی افسر الٹے قدموں پیچھے ہٹا تو ایک چھوٹے سے گڑھے نے اسے لڑکھڑا دیا، اس کی ٹوپی گر پڑی اور عینک کا ایک بازو کان سے ہٹ کر لٹکنے لگا۔ میرے قریب کھڑا ہوا سربلند مسکرا دیا: "مسکراتا ہے؟" ایک جاپانی افسر نے سوال کیا اور پھر ایک گولی سن سے آئی، سربلند کی پسلیوں کو توڑتی باہر نکل گئی۔ ایک لمحے کے لیے میں مر گیا۔ پھر جب جاپانیوں کو بے تحاشا ہنستے سنا تو ہوش آیا ہنسی کی وجہ بھی سمجھ میں آ گئی۔ گولی سربلند کے جسم سے نکل کر اس کے عقب میں کھڑے ہوئے وارث کے پیٹ میں گھس گئی تھی۔ اور سربلند پیچھے

گرا تھا تو وارث منہ کے بل گرا تھا۔ اور موت کے کرب میں دونوں نے ایک دوسرے کے جسم نوچ ڈالے تھے' اور وارث کی موت جاپانیوں کے لیے لطیفہ بن گئی تھی۔ اس روز سے ہم سب نے ایکا ایکی جاپانیوں سے مانوس ہونے کی آخری منزل طے کر لی۔ حکم ملے تو مسکراؤ حکم ملے تو نظریں اٹھاؤ۔ حکم ملے تو خشک گلے تر کرنے کے لیے منہ کا لعاب نگلو اور اگر حکم نہ ملے تو مٹی کے مادھو کی طرح جس انداز اور جس رخ سے کھڑے ہو کھڑے رہو۔ اور پھر میں جینے کے معاملے میں بہت لالچی ہو گیا تھا۔ میں ہر قیمت پر جینا چاہتا تھا کہ کبھی تو جنگ ختم ہو گی' کبھی تو کوئی جہاز مجھے اپنے سینے پر بٹھا کر سنگاپور سے گزرتا ہوا ہگلی میں داخل ہو گا اور ریل گاڑی مجھے کلکتے سے پنجاب لے جائے گی' جہاں میں اپنی ماں کے گھٹنے سے لگ کر بیٹھ جاؤں گا اور قیامت تک یونہی بیٹھا رہوں گا۔ جینے کے اسی لالچ کے سبب میں نے جاپانیوں کے حضور میں کبھی کوئی گستاخی نہیں کی۔

کافی دنوں تک ہم ہانگ کانگ ہی میں اپنے نئے حاکموں کی خدمت بجا لاتے رہے۔ ہم ایسے سدھ گئے تھے کہ ہم نے سرکس والے ہاتھیوں کو مات کر دیا تھا۔ ایک روز ہمیں ایک جاپانی افسر نے بتایا کہ ہانگ کانگ کے قریب ہی ساحلی جزیروں میں سے ایک چھوٹے سے جزیرے پر سو ڈیڑھ سو چینی مچھیروں نے جاپانی سرکار کے خلاف ایک محاذ بنا لیا ہے اور اب وہ ہانگ کانگ تک چھاپا مارنے کی سوچ رہے ہیں۔ ان کی گوشمالی کے لیے ہانگ کانگ سے جاپانی فوجیوں کا ایک دستہ بھی جانے والا تھا۔ جس میں وفادار اور تابعدار قسم کے قیدیوں کو بھی جانا تھا۔ ظاہر ہے اس دستے میں میرا نام سرِفہرست تھا۔ رات دو بجے ہم سب ایک دخانی کشتی پر سوار ہوئے۔ آج ہوا معمول سے زیادہ خنک ہو رہی تھی اور میری قمیض کے کھلے گریبان میں جیسے اولے سے بھر گئے تھے۔

ایک دوسرے میں گھستے سمٹتے ہم منہ اندھیرے اس جزیرے پر پہنچے۔ نہایت ہوشیاری سے ساحل پر اترے اور پھر جھاڑیوں میں رینگتے ہوئے جب آگے بڑھے تو اس وقت سامنے مشرق میں جیسے کسی نے انار چھوڑ دیے تھے۔ اتنی اجلی صبح میں نے پنجاب میں بھی کبھی نہیں دیکھی۔ چڑیوں کے چہچہوں میں ہنسی کی سی کیفیت تھی۔

سمندری پرندے لمبی لمبی ٹانگیں لٹکائے ہمارے سروں پر تیرنے اور غوطے مارنے لگے تھے۔

اچانک ہم نے دیکھا کہ ہمارے سامنے ایک چھوٹی سی وادی چینی کی پیالی کی طرح نمودار ہوگئی۔ اس کے عین وسط میں چند جھونپڑے تھے اور چہار طرف ساحل کی سمت سے آتی ہوئی ان گنت پگڈنڈیاں' ان کے قریب آکر غائب ہو رہی تھیں۔ جھونپڑوں کے گرد گھاس کے قطعے تھے۔ ان کے گرد درختوں کا ایک دائرہ تھا۔ ان کے پیچھے جھاڑیوں کا ایک دائرہ اور پھر سب کے آخر میں ساحل کی سنہری ریت اور سانس لیتے ہوئے سمندر کا دائرہ۔ سارا منظر کچھ عجیب مصنوعی سا لگتا تھا' بالکل کھلونا سا اور جب سمندر کی بڑی بڑی لہروں کی طرف دیکھتا تھا تو میرے قدموں تلے چینی کی یہ پیالی تیرتی اور ڈولتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

ہم سب کو بڑی حیرت ہوئی کہ دیر تک انتظار کرنے کے باوجود ابھی تک ہمیں جھونپڑوں کے آس پاس کوئی بچہ تک دکھائی نہیں دیتا تھا۔ کسی جھونپڑے سے دھواں تک نہیں اٹھتا تھا۔ کسی بوڑھے کے کھانسنے تک کی آواز نہیں آتی تھی۔ صرف ایک کتا گھاس کے قطعوں میں لوٹیں لگا رہا تھا۔ تنگ آکر دستے کے جاپانی لیڈر نے اپنے ریوالور سے ہوا میں فائر کر دیا اور پھر ہم سب دبک کر زمین سے چمٹ گئے۔ مگر یہ فائر بھی جھونپڑوں کے آس پاس زندگی کا کوئی ثبوت نہ ابھار سکا بس اتنا ہوا کہ کھیلتا ہوا کتا کان کھڑے کر کے ایک لمحہ ہماری طرف دیکھتا رہا اور پھر جھونپڑوں میں بھاگ گیا۔ چڑیاں بہت سی ڈاروں کی صورت میں مشرق کی طرف کچھ یوں اڑ گئیں جیسے ابھرتے ہوئے سورج میں گھس کر دم لیں گی۔

اب ہم نے ہلہ بول دیا۔ جھونپڑوں کے قریب آکر ہم نے اکٹھے بہت سے فائر کھول دیے اور پھر جاپانی افسر نے کڑک کر چینی زبان میں کہا: "اگر کوئی اندر ہے تو فوراً باہر آجائے ورنہ اس کے بعد ہم اندر آکر کسی کو جیتا نہ چھوڑیں گے۔"

اور پھر میں نے ایسا منظر دیکھا جو صرف جنوں پریوں کی کہانیوں ہی میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہاں سے وہاں تک تمام جھونپڑوں میں سے پھٹے پرانے چیتھڑے پہنے

ہوئے بوڑھی اور ادھیڑ عمر کی عورتیں اتنی بہت سی تعداد میں ایک دم باہر نکل آئیں جیسے وہ اسی حکم کے انتظار میں تھیں۔ آن کی آن میں ہمارے سامنے جھریوں بھرے چہرے لٹکتی ہوئی جھلیوں اور بجھی ہوئی آنکھوں کی قطاریں تن گئیں اور مجھے کچھ ایسا لگا جیسے کوئی بہت بڑا حادثہ ہونے والا ہے۔ اس وقت کا سناٹا ہولناک تھا۔ ابھرتے ہوئے سورج کی وجہ سے ہم سب کے سائے ڈراؤنی حد تک لمبے ہو کر گھاس کے قطعوں پر جیسے لیٹ گئے تھے' اور عورتیں زیرِ لب کوئی جاپ کر رہی تھیں۔ کچھ ایسی پُراَسرار فضا پیدا ہو گئی جیسے ابھی ابھی ایک پل میں چینی کی یہ پیالی ہوا میں ابھر جائے گی اور الٹ کر سب کو سمندر میں گرا دے گی۔

جاپانی افسر کے حکم سے ہم نے انھیں گھیرے میں لے لیا پھر جاپانی لیڈر آگے بڑھا اور گرج کر بولا: "مرد کہاں ہیں؟"

ایک لمحے تک خاموشی رہی جیسے توپ سے گولا بھرا جا رہا ہے۔

پھر ایک بالکل سفید بالوں والی بُڑھیا ایک قدم آگے آگئی اور بولی:

"روز کے کام پر گئے ہیں۔"

"روز کے کام پر" لیڈر کڑکا "یعنی جاپانی سرکار کی جڑیں کھودنے کے لیے چین کے ساحلوں پر فسادیوں کے اڈے بنانے؟"

"جی نہیں" بڑھیا بولی "مچھلیاں پکڑنے!"

"اور بچے اور بوڑھے؟" افسر نے پوچھا "اور تمھاری لڑکیاں؟"

"آج ہم مچھیروں کا سالانہ میلہ ہے" بڑھیا اسی انداز سے بول رہی تھی "سب ادھر پانیوں میں خوشیاں منائیں گے اور ——————"

"ادھر آؤ" لیڈر نے بڑھیا کے ہاتھ کو ایک جھٹکے سے کھینچا اور وہ منہ کے بل گر پڑی۔ دوسرے افسر نے اس کی پیٹھ پر اپنے ریوالور کا فائر کر دیا۔ وہ چیخی اور یوں تڑپی جیسے اٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ پھر وہ چت گر پڑی اور دو ایک بار تن کر ٹھنڈی ہو گئی اور اپنی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے جیسے ہم سب کو گھورنے لگی۔ سب عورتیں چہروں

کو ہاتھوں سے چھپا کر رہ گئیں اور میں نے اپنے ہونٹ کے ایک گوشے کو اس زور سے کاٹا کہ کرچ سے میرے دانت میرے ہی گوشت میں اتر گئے۔ چڑیوں کے غول جو شاید پلٹ آئے تھے روتے ہوئے ہانگ کانگ کی طرف اڑ گئے۔

لمبی لمبی ٹانگوں والے سمندری پرندے کچھ یوں منتشر ہو کر ادھر ادھر اڑ گئے جیسے گولی انہی کے ہجوم میں سے گزری ہے۔

دور کے جھونپڑوں میں دو کتے بھونکنے لگے۔

ہم پنجابیوں کو عورتوں کی نگرانی کے لیے چھوڑ کر جاپانی جھونپڑوں میں گھس گئے، خوب اٹھا پٹخ کی اور گالیاں بکیں۔ میں چینی عورتوں کے چہروں کو باری باری دیکھتا رہا، ان کی ٹھوڑی کے نیچے لٹکتی ہوئی جھلی موت کے خوف سے یا جانے کس احساس سے کانپے جا رہی تھی اور ان کی ذرا ذرا سی آنکھیں کہیں دور ہٹ کر سوچ رہی تھیں۔ جاپانی جھونپڑوں سے نکل کر دور گول ساحل کی طرف چلے گئے تھے اور جھاڑیوں میں فائر کر رہے تھے۔

اچانک ایک عورت زمین پر بیٹھ گئی، میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنا زیر لب جاپ جاری کر دیا مجھے اپنی ماں یاد آ گئی۔ میں فوراً دوسری طرف دیکھنے لگا اور کچھ یوں ظاہر کیا جیسے میں ان سب سے بے پروا ہو گیا ہوں۔ آنکھوں کے گوشوں میں سے میں نے دیکھا وہ عورت پھر زمین پر بیٹھ گئی اور دوسری عورتوں کی ٹانگوں میں چھپتی ہوئی آگے کھسکنے لگی۔ مردہ بڑھیا کے پاس آ کر اس نے نہایت خوفزدہ انداز میں میری طرف دیکھا۔ پھر جلدی سے لاش کے چہرے پر ایک بڑا سا کپڑا پھیلا کر وہ پیچھے ہٹی اور اپنی جگہ پر آ کر کھڑی ہو گئی۔

میں نے ضبط کی کوشش کی، کانپتے ہوئے ہونٹوں کو دانتوں میں جکڑ لیا مگر میری آنکھوں میں آنسو آ ہی گئے۔ لاش کا منہ ڈھانپنے والی عورت تھوڑا سا آگے آ کر مجھے بڑے غور سے دیکھنے لگی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کی پلکیں جھپک گئیں اور اکٹھے بہت سے آنسو اس کی جھریوں میں ندیوں کی طرح بہ کر پھیل گئے۔ سمندر کی ٹھنڈی نم آلود ہوا میرے کھلے گریبان سے فائدہ اٹھا کر میری پسلیوں میں پیوست ہوئی

جا رہی تھی اور میں رو رہا تھا۔ میں نے دوسری عورتوں کی طرف دیکھا، ان سب کی آنکھیں بھی ڈبڈبا آئی تھیں۔ میں بڑھیا کی لاش کی طرف دیکھنے لگا، ہوا کے جھونکے نے اس کے منہ پر سے کپڑا اڑا دیا تھا۔ میں نے جھک کر اس کا سر اٹھایا اور اس کے گرد کپڑا لپیٹ دیا۔ ایک جاپانی سپاہی چنگھاڑتا ہوا آیا اور میری کمر میں ایک زور کی ٹھوکر ماری۔ لاش کا منہ ڈھانپنے والی عورت کے سوا دوسری سب عورتوں نے ہاتھوں سے اپنے چہرے چھپا لیے اور میں کمر کی چوٹ کو سہلاتا کھڑا ہو گیا۔ جاپانی سپاہی نے لاش کے سر پر سے کپڑا نوچ ڈالا۔ مری ہوئی بڑھیا کا ذرا سا سفید جوڑا کھل کر اس کے کھلے دہانے اور پتھرائی ہوئی آنکھوں پر پھیل گیا اور سب جاپانی واپس آ گئے۔

دستے کے لیڈر نے عورتوں کے سامنے بڑے غصے سے ایک تقریر کی اور کہا:

"معلوم ہوتا ہے کہ ہانگ کانگ میں بھی تم لوگوں کا خفیہ گروہ کام کر رہا ہے اور انہی میں سے کسی نے تمھیں ہمارے چھاپے کی خبر دی ہے۔ ورنہ یوں نوعمر لڑکیاں، بچے، جوان اور بوڑھے جزیرے پر سے غائب نہ ہوتے۔ لیکن ہم یہاں سے جائیں گے نہیں۔ ہم آج سارا دن ان کا انتظار کریں گے اور جب وہ آئیں گے تو تمھارے بیٹوں، بیٹیوں، بھائیوں، بہنوں، شوہروں، بیویوں اور باپوں کو تمھارے سامنے گولیوں سے اڑا دیں گے اور پھر تمھیں بھی سمندر میں دھکیل دیا جائے گا۔" وہ دیر تک ایسی باتیں کرتا رہا اور افسر ہم جنگی قیدیوں کو ان نئے قیدیوں کی نگرانی پر مقرر کر کے سب جاپانی دور درختوں کے دائرے میں چلے گئے اور اپنے اپنے تھیلوں سے شراب کی بوتلیں نکال کر قہقہے مارنے اور ناچنے گانے لگے۔

عورتیں ہمارے حلقے میں بیٹھ گئیں۔ بادل گھر آئے تھے جن کی وجہ سے سورج غائب تھا۔ اتنی دیر بعد بھی وہی منہ اندھیرے کا منظر جاری تھا۔ تیز ٹھنڈی ہوا میرے سینے میں برمے کی طرح گھسی جا رہی تھی۔ میں گریبان کے دونوں حصوں کو ملاتا تو میرا ہاتھ سن ہو جاتا اور جب چھوڑتا تو سر سے پاؤں تک لرز اٹھتا۔ بڑھیا کی لاش کی موجودگی کے احساس سے بھی جسم کی کپکپی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ عورتوں کا زیرِ لب جاپ جاری تھا۔ لاش کا منہ ڈھانپنے والی عورت کے چہرے پر آنسوؤں کی بجائے زردی

کھنڈ رہی تھی اور وہ منہ کھولے مجھے گھورے جا رہی تھی۔

دیر تک یہی کیفیت جاری رہی۔ جب ایک جاپانی سپاہی ہمارے پاس آیا اور بولا کہ فی الحال ایک اور قریبی جزیرے پر جانے کا فیصلہ ہوا ہے اس لیے کچھ دیر کے بعد ادھر روانہ ہوں گے اور جب تک یہ عورتیں ہم سب کے لیے کھانا تیار کریں گی۔ اس نے عورتوں کو کھانا پکانے کا حکم دیا اور ہمیں اپنی اپنی جگہ پر کھڑے رہنے کا حکم دے کر واپس چلا گیا۔

عورتیں اپنے اپنے جھونپڑوں میں چلی گئیں۔ بادل گرجنے لگا' ہوا میں جمی ہوئی برف کے ٹکڑے اڑنے لگے جو میرے سینے سے نکیلے پتھروں کی طرح ٹکرا رہے تھے اور میں اپنے گھروندے کے اس گوشے کو یاد کر رہا تھا جس میں دبک کر ہم ماں بیٹا سردیوں کا بیشتر حصہ گزار دیتے تھے۔ اپلوں کا دھواں ہمارا احاطہ کیے رکھتا تھا اور ماں بار بار میرے سینے پر اپنی چادر پھیلا کر کہتی تھی: "سینے کو سردی سے بچائے رکھو بیٹا ہوا میں جو نمونیا ہوتا ہے وہ سینے ہی کی راہ پسلیوں میں اترتا ہے ــــــــــ"

آنسوؤں میں بھیگا ہوا ماں کا چہرہ ایک مدت کے بعد بڑی وضاحت سے میرے سامنے ابھرا۔ جھریوں میں پھنسے ہوئے آنسو بجلی کی چمک سے جگمگا اٹھے تھے۔ جھلی کانپ رہی تھی اور یہ چہرہ میرے قریب آ رہا تھا۔

وہ عورت جس نے لاش کا چہرہ ڈھانپا تھا' آہستہ آہستہ میری طرف آ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کوئی چیز تھی اور وہ بار بار پلٹ پلٹ کر جاپانیوں کی طرف دیکھتی تھی جو دور ابھی تک ناچ اور گا رہے تھے۔ اس کے چہرے اور میری ماں کے چہرے میں کتنی مماثلت تھی' بڑھاپے میں کتنی یکسانیت ہوتی ہے۔ اس وقت ان کی جھریوں میں بھی آنسو پھیل رہے تھے۔ قریب آ کر رک گئی اور چینی زبان میں آہستہ سے بولی:

"قیدی ہو؟"

میں زبان سے کچھ نہ بولا صرف اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ بولی: "میرا بیٹا جلدی میں تھا' میں پکارتی رہی مگر اس نے میری ایک نہ سنی' اس کی قمیض میں بھی تمھاری طرح ایک بھی بٹن نہ تھا۔"

میں چونکا۔

وہ بولتی چلی گئی: "تمہاری ماں ہے نا؟"

میں اب کے بھی کچھ نہ بولا صرف اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں نے ضبط کرنے کی کوشش کی مگر بچے کی طرح رونے لگا۔

وہ آگے بڑھ کر میری قمیض میں بٹن ٹانکنے لگی اور جب ٹانک چکی تو آنسوؤں میں مسکرائی۔ جاپانیوں کی طرف کنکھیوں سے دیکھ کر اس نے جیسے چوری چوری میرے ایک گال پر بوسہ دیا اور میری قمیض سے آنسو پونچھ کر پلٹ گئی۔

اور میں ایک لمحے کے لیے یوں سمجھا جیسے چینی کی یہ پیالی ہوا میں ابھر کر الٹ گئی ہے اور میں پنجاب میں اپنی ماں کی گود میں گرا پڑا ہوں!!

(سناٹا)

سوالات

۱۔ پنجابی نوجوان ہانگ کانگ کی پولیس میں کیسے بھرتی ہوا؟

۲۔ ماں اپنے بیٹے کو ہانگ کانگ جانے سے کیوں منع کرتی تھی؟

۳۔ پنجابی نوجوان جنگی قیدی کیسے بنا؟

۴۔ سربلند کی موت کیسے واقع ہوئی؟

۵۔ چینی بوڑھی عورت نے پنجابی نوجوان کے بٹن کیوں ٹانکے؟

۶۔ جاپانی فوجیوں نے دور افتادہ جزیرے میں چینی مچھیروں کی بستی پر حملہ کیوں کیا؟

۷۔ جاپانی فوجیوں نے چینی عورتوں پر کیا کیا ستم ڈھائے؟

۸۔ اس افسانے میں ظلم و ستم کی جو داستان بیان کی گئی ہے اسے اپنے الفاظ میں تحریر کیجیے۔

○☆○☆○☆○☆○☆○

مرزا اسد اللہ خاں غالب

(۱۷۹۷ء۔ ۱۸۶۹ء)

مکاتیبِ غالب

(۱)

بنام ہرگوپال تفتہ

بھائی!

تم سچ کہتے ہو کہ بہت مسوّدے اصلاح کے واسطے فراہم ہوئے ہیں، مگر یہ نہ سمجھنا کہ تمھارے ہی قصائد پڑے ہیں۔ نواب صاحب کی غزلیں بھی اسی طرح دھری ہوئی ہیں۔ برسات کا حال تمھیں بھی معلوم ہے اور یہ بھی تم جانتے ہو کہ میرا مکان گھر کا نہیں ہے، کرائے کی حویلی میں رہتا ہوں۔ جولائی سے مینہ شروع ہوا، شہر میں سیکڑوں مکان گرے اور مینہ کی نئی صورت، دن میں دو چار بار برسے اور ہر بار اس زور سے کہ ندی نالے بہ نکلیں۔ بالا خانے کا جو دالان میرے بیٹھنے اٹھنے، سونے جاگنے، جینے مرنے کا محل ہے، اگرچہ گرا نہیں لیکن چھت چھلنی ہو گئی۔ کہیں لگن، کہیں چلمچی کہیں اگالدان رکھ دیا ہے۔ قلمدان، کتابیں اٹھا کر توشے خانے کی کوٹھڑی میں رکھ دیئے۔ مالک مرمت کی طرف متوجہ نہیں۔ کشتیِ نوح میں تین مہینے رہنے کا اتفاق ہوا، اب نجات ہوئی ہے۔ نواب صاحب کی غزلیں اور تمھارے قصائد دیکھے جائیں گے۔

میر بادشاہ میرے پاس آئے تھے، تمھاری خیر و عافیت ان سے معلوم ہوئی تھی۔ میر قاسم علی صاحب مجھ سے نہیں ملے۔ پرسوں سے نواب مصطفیٰ خاں صاحب یہاں آئے ہوئے ہیں۔ ایک ملاقات ان سے ہوئی ہے۔ ابھی یہیں رہیں گے، بیمار ہیں، احسن اللہ خاں معالج ہیں، فصد ہو چکی ہے، جونکیں لگ چکی ہیں، اب مسہل کی فکر ہے، سو اس کے سب طرح خیر و عافیت ہے۔ میں ناتواں بہت ہو گیا ہوں، گویا صاحب فراش ہوں۔ کوئی شخص نیا تکلف کی ملاقات کا آ جائے تو اٹھ بیٹھتا ہوں، ورنہ پڑا رہتا ہوں،

لیٹے لیٹے خط لکھتا ہوں، لیٹے لیٹے مسودات دیکھتا ہوں۔ اللہ۔ اللہ۔ اللہ!

صبح جمعہ ۱۴ ماہ اکتوبر ۱۸۶۴ء غالب

(۲)

بنام مرزا حاتم علی بیگ مہر

مرزا صاحب!

میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے، ہزار کوس سے بہ زبان قلم باتیں کیا کرو، ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔ کیا تم نے مجھ سے بات کرنے کی قسم کھائی ہے؟ اتنا تو کہو کہ کیا بات تمھارے جی میں آئی ہے؟ برسوں ہو گئے کہ تمھارا خط نہیں آیا۔ نہ اپنی خیر و عافیت لکھی، نہ کتابوں کا بیورا[۱] بھجوایا۔ ہاں، مرزا تفتہ نے ہاترس سے یہ خبر دی ہے کہ پانچ ورق پانچوں کتابوں کے آغاز کے ان کو دے آیا ہوں اور انھوں نے سیاہ قلم کی لوحوں کی تیاری کی ہے۔ یہ تو بہت دن ہوئے جو تم نے مجھ کو خبر دی ہے کہ دو کتابوں کی طلائی لوح مرتب ہو گئی ہے۔ پھر اب ان دو کتابوں کی جلدیں بن جانے کی کیا خبر ہے اور ان پانچوں کتابوں کے تیار ہونے میں درنگ کس قدر ہے؟ مہتمم مطبع کا خط پرسوں آیا تھا، وہ لکھتے ہیں کہ تمھاری چالیس کتابیں بعد منہائی لینے سات جلدوں کے اسی ہفتے میں تمھارے پاس پہنچ جائیں گی۔ اب حضرت ارشاد کریں کہ سات جلدیں کب آئیں گی؟ ہر چند کاریگروں کے دیر لگانے سے تم بھی مجبور ہو، مگر ایسا کچھ لکھو کہ آنکھوں کی نگرانی اور دل کی پریشانی دور ہو۔ خدا کرے ان تینتیس جلدوں کے ساتھ یا دو تین روز کے آگے پیچھے، یہ سات جلدیں آپ کی عنایتی بھی آئیں۔ تا خاص و عام کو جا بجا بھیجی جائیں۔

میرا کلام میرے پاس کبھی کچھ نہ رہا۔ نواب ضیاء الدین خان اور نواب

۱۔ بیورا بمعنی اطلاع

حسین مرزا جمع کر لیتے تھے۔ جو میں نے کہا انھوں نے لکھ لیا۔ ان دونوں کے گھر لٹ گئے۔ ہزاروں روپے کے کتب خانے برباد ہو گئے۔ اب میں اپنے کلام کے دیکھنے کو ترستا ہوں۔ کئی دن ہوئے کہ ایک فقیر کہ وہ خوش آواز بھی ہے اور زمزمہ پرداز بھی ہے، ایک غزل میری کہیں سے لکھوا لایا۔ اس نے وہ کاغذ جو مجھ کو دکھایا، یقین سمجھنا کہ مجھ کو رونا آیا۔ غزل تم کو بھیجتا ہوں اور صلہ میں اس خط کا جواب چاہتا ہوں۔

غالب

(۱۵ تا ۱۸ نومبر ۱۸۵۸ء)

(۳)

علاء الدین علائی کے نام

جان غالب ! تم تو ثمر نورس ہو اس نہال کے جس نے میری آنکھوں کے سامنے نشو و نما پائی ہے اور میں ہوا خواہ و سایہ نشین اس نہال کا رہا ہوں۔ کیوں کر تم مجھ کو عزیز نہ ہو گے ؟ رہی دید وادید، اس کی دو صورتیں ہیں، تم دلی میں آؤ یا میں لوہارو آؤں۔ تم مجبور میں معذور۔ خود کہتا ہوں کہ میرا عذر زنہار مسموع نہ ہو جب تک نہ سمجھ لو کہ میں کون ہوں اور ماجرا کیا ہے ؟

سنو ! عالم دو ہیں ایک عالمِ اُرواح اور ایک عالمِ آب و گِل۔ حاکم ان دونوں کا ایک ہے .... ہرچند قاعدہ عام یہ ہے کہ عالمِ آب و گِل کے مجرم، عالمِ اُرواح میں سزا پاتے ہیں۔ لیکن یوں بھی ہوتا ہے کہ عالمِ ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ[۱] میں روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا۔ تیرہ برس حوالات[۲] میں رہا۔ ۷ رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکمِ حبسِ

۱۔ پیدائش مطابق: ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء
۲۔ قیام آگرہ

دوام[1] صادر ہوا۔ ایک بیڑی[2] میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلّی شہر کو زندان مقرر کیا اور مجھے اس زندان میں ڈال دیا۔ فکر نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا۔ برسوں کے بعد جیل خانے سے بھاگا۔ تین برس بلادِ شرقیہ میں پھرتا رہا۔ پایاں کار مجھے کلکتہ سے پکڑ لائے اور پھر اسی مجبَس میں بٹھا دیا۔ جب دیکھا کہ یہ قیدی گریز پا ہے، دو ہتھکڑیاں[3] اور بڑھا دیں۔ پاؤں بیڑی سے فگار، ہاتھ ہتھکڑیوں سے زخم دار، مشقت مقرری اور مشکل ہو گئی۔ طاقت یک قلم زائل ہو گئی۔ بے حیا ہوں۔ سال گزشتہ بیڑی کو زاویۂ زندان میں چھوڑ مع دونوں ہتھکڑیوں کے بھاگا۔ میرٹھ، مراد آباد ہوتا ہوا رام پور پہنچا۔ کچھ دن کم دو مہینے وہاں رہا تھا کہ پھر پکڑا آیا۔ اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگوں گا۔ بھاگوں گا کیا؟ بھاگنے کی طاقت بھی تو نہ رہی۔ حکم رہائی دیکھیے کب صادر ہو۔ ایک ضعیف سا احتمال ہے کہ اسی ماہ ذی الحجہ میں چھوٹ جاؤں گا۔ بہر تقدیر بعد رہائی کے تو آدمی سوائے اپنے گھر کے اور کہیں نہیں جاتا۔ میں بھی بعد نجات سیدھا عالمِ ارواح کو چلا جاؤں گا۔

غالب

(جون ۱۸۶۱ء)

(۴)

میر مہدی حسین مجروح کے نام

مار ڈالا یار، تیری جواب طلبی نے۔ اس چرخِ کج رفتار کا برا ہو، ہم نے اس کا کیا بگاڑا تھا؟ ملک و مال و جاہ و جلال کچھ نہیں رکھتے تھے، ایک گوشہ توشہ تھا، چند مفلس و بے نوا ایک جگہ فراہم ہو کر ہنس بول لیتے تھے:

۱۔ شادی مطابق: ۱۹ اگست ۱۸۱۰ء

۲۔ بیوی: مراد بیگم دختر نواب بخش خاں

۳۔ مراد جوان مرگ عارف کے بچے باقر علی خاں اور حسین علی خاں

سو بھی نہ تو کوئی دم، دیکھ سکا، اے فلک!
اور تو یاں کچھ نہ تھا، ایک مگر دیکھنا

یاد رہے یہ شعر میر درد کا ہے۔

"کل سے مجھ کو میکش بہت یاد آتا ہے۔[1]" سو تم ہی بتاؤ کہ میں تم کو کیا لکھوں؟ وہ صحبتیں اور تقریریں جو یاد کرتے ہو، اور تو کچھ بن نہیں آتی، مجھ سے خط پر خط لکھواتے ہو۔ آنسوؤں سے پیاس نہیں بجھتی، یہ تحریر تلافی اس تقریر کی نہیں کر سکتی۔ بہ ہر حال کچھ لکھتا ہوں، دیکھو، کیا لکھتا ہوں۔ سنو، پنسن کی رپورٹ کا ابھی کچھ معلوم نہیں۔ دیر آید درست آید۔

بھئی میں تم سے بہت آزردہ ہوں۔ میرن صاحب کی تندرستی کے بیان میں نہ اظہار مسرت، نہ مجھ کو تہنیت۔ بلکہ اس طرح لکھا گیا ہے گویا ان کا تندرست ہونا تم کو ناگوار ہوا ہے۔ لکھتے ہو کہ میرن صاحب ویسے ہی ہو گئے جیسے آگے تھے۔ اچھلتے کودتے پھرتے ہیں۔ اس کے یہ معنی کہ ہے ہے 'کیا غضب ہوا' یہ کیوں اچھے ہو گئے۔ یہ باتیں تمھاری ہم کو پسند نہیں آتیں۔ تم نے میر کا وہ مقطع سنا ہو گا۔ بہ تغیر الفاظ لکھتا ہوں۔

کیوں نہ "میرن" کو مغتنم جانوں — دلی والوں میں اک بچا ہے یہ

میر تقی کا مقطع یہ ہے:

"میر کو کیوں نہ مغتنم جانوں — اگلے لوگوں میں اک رہا ہے یہ"

"میر" کی جگہ "میرن" اور "رہا" کی جگہ "بچا" کیا اچھا تصرف ہے!

ارے میاں! تم نے کچھ اور بھی سنا؟ کل یوسف میرزا کا خط لکھنؤ سے آیا۔ وہ لکھتا ہے کہ نصیر خاں عرف نواب جان، والد ان کا دائم الحبس ہو گیا۔ حیران ہوں کہ یہ کیسی آفت آئی۔ یوسف میرزا تو جھوٹ کاہے کو لکھے گا۔ خدا کرے اس نے

---

[1] یہ جملہ میر مہدی حسین مجروح نے غالب کو لکھا تھا۔ انھوں نے نقل کر کے اس کا جواب لکھا ہے۔ میر احمد حسین میکش غالب کے تلامذہ میں سے تھے۔ فتح دہلی کے چند مہینے بعد انگریزوں نے انھیں پھانسی دے دی۔

جھوٹ سنا ہو۔

میر سرفراز حسین کو دعا کہنا اور یہ خط ان کو ضرور سنا دینا۔ برخوردار میر نصیر الدین کو دعا پہنچے۔

اپریل ۱۸۶۰ء　　　　غالب

(مکاتیبِ غالب از مولانا غلام رسول مہر)

سوالات

۱۔ مندرجہ ذیل جملوں کا مفہوم واضح کیجیے:

(ا) میرا مکان گھر کا نہیں ہے۔

(ب) کشتیِٔ نوح میں تین مہینے رہنے کا اتفاق ہوا۔

(ج) میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔

(د) تم تو ثمر نورس ہو اس نہال کے جس نے میری آنکھوں کے سامنے نشو و نما پائی ہے۔

(ہ) حکم رہائی دیکھیے کب صادر ہو۔

(و) اس چرخِ کج رفتار کا برا ہو۔

۲۔ مندرجہ ذیل تراکیب کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے:

صاحب فراش، ثمر نورس، دید وا دید، عالمِ آب و گل، عالمِ ارواح، حکم حبسِ دوام، فکرِ نظم و نثر، بلادِ شرقیہ، پایان کار، گریزپا، مشقتِ مقرری، زاویہ زندان، ملک و مال وجاہ و جلال، مفلس و بے نوا، اظہارِ مسرت بہ تغیر الفاظ، دائم الحبس۔

۳۔ سیاق و سباق کے حوالے سے درج ذیل اقتباسات کی تشریح کیجیے:

(ا) تم سچ کہتے ہو ------- اب نجات ہوتی ہے۔

(ب) میرا کلام میرے پاس ------- جواب چاہتا ہوں۔

(ج) ہرچند قاعدہ عام یہ ہے ------- زندان میں ڈال دیا۔

(د) بھئی میں تم سے ------- پسند نہیں آتیں۔

○☆○☆○☆○☆○☆○

علامہ محمد اقبال مرحوم

(۱۸۷۷ء۔ ۱۹۳۸ء)

خطوطِ اقبالؒ

مولانا گرامی کے نام

(۱)

لاہور ۱۲ جولائی ۱۴ء

جناب مولانا گرامی، آپ کہاں ہیں؟ حیدر آباد[1] میں یا عدم آباد میں، اگر عدم آباد میں ہیں تو مجھے مطلع کیجئے کہ میں آپ کو تعزیت نامہ لکھوں۔ صدیاں گزر گئیں کہیں آپ کا کلام دیکھنے میں نہیں آیا۔ کبھی کبھی چند اشعار بھیج دیا کرو تو کون سی بڑی بات ہے۔ میں تو اب بوجہ مشاغل منصبہ کے تارک الشعر ہوں۔ ہاں کبھی فرصت ملتی ہے تو فارسی اساتذہ کے اشعار پڑھ کر مزا اٹھا لیتا ہوں۔ میری شاعری گھٹ کر اب اس قدر رہ گئی ہے کہ اوروں کے اشعار پڑھ لوں۔ گزشتہ سال ایک مثنوی فارسی لکھنی شروع کی تھی۔ ہنوز ختم ہوئی نہیں اور اس کے اختتام کی امید بھی نہیں۔ خیالات کے اعتبار سے مشرقی اور مغربی لٹریچر میں یہ مثنوی بالکل نئی ہے لیکن آپ سے ملاقات ہو تو آپ کو اس کے اشعار سناؤں۔ مجھے یقین ہے آپ اسے سن کر خوش ہوں گے۔ کیسے ادھر آنے کا کب تک قصد ہے؟ میں ایک عرصے سے آپ کا منتظر ہوں۔ خدارا جلدی آیئے۔ سب سے بڑا کام تو یہ ہے کہ آکر میری مثنوی سنیے اور اس میں مشورہ دیجیے۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔

امید ہے کہ بابا گرامی اچھا ہو گا۔ اور نئے نکاح کی فکر میں اپنے آپ کو نہ گھلاتا ہو گا۔ گھر میں میری طرف سے سلام کہ دیجیے۔

خط کا جواب جلد لکھیے اور نیز یہ کہ اپنے اشعار بھی بھیجیے۔ میری مراد تازہ افکار سے ہے۔

آپ کا خادم
محمد اقبال

---

[1] حیدر آباد (دکن)

اکبر الہ آبادی کے نام

(۲)

لاہور، ۱۶ جولائی ۱۹۱۴ء

مخدوم و مکرم حضرت قبلہ مولانا، السلام علیکم!

آپ کا نوازش نامہ ابھی ملا۔ جس کو پڑھ کر بہت مسرت ہوئی۔ حضرت! میں آپ کو اپنا پیرو مرشد تصور کرتا ہوں۔ اگر کوئی شخص میری مذمت کرے جس کا مقصد آپ کی مدح سرائی ہو تو مجھے اس کا مطلق رنج نہیں بلکہ خوشی ہے۔ جب آپ سے ملاقات اور خط کتابت نہ تھی اس وقت بھی میری ارادت و عقیدت ایسی ہی تھی جیسی اب ہے اور ان شاء اللہ جب تک زندہ ہوں ایسی ہی رہے گی۔ اگر ساری دنیا مُتفق اللِّسان ہو کر یہ کہے کہ اقبال پوچ گو ہے تو مجھے اس کا مطلق اثر نہ ہو گا کیونکہ شاعری سے میرا مقصد بقول آپ کے حصولِ دولت و جاہ نہیں محض اظہارِ عقیدت ہے۔

عام لوگ شاعرانہ انداز سے بے خبر ہوتے ہیں۔ ان کو کیا معلوم کہ کسی شاعر کی داد دینے کا بہترین طریق یہ ہے کہ اگر داد دینے والا شاعر ہو تو جس کو داد دینا مقصود ہو، اس کے رنگ میں شعر لکھے۔ یا بالفاظ دیگر اس کا تتبع کر کے اس کی فوقیت کا اعتراف کرے۔ میں نے بھی اس خیال سے چند اشعار آپ کے رنگ میں لکھے ہیں، مگر عوام کے رجحان اور بدمذاقی نے اس کا مفہوم کچھ اور سمجھ لیا اور میرے اس فعل سے عجیب و غریب نتائج پیدا کر لیے۔ سوائے اس کے کیا کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو سمجھ عطا کرے۔ "نقاد" کو جو خط آپ نے لکھا ہے میں اسے شوق سے پڑھوں گا۔ اگر وہ شائع ہو جائے تو رسالے کی کاپی بھیج دیجیے گا۔ میرے پاس نقاد نہیں آتا۔

سبحان اللہ "غم بڑا مُدرِکِ حقائق ہے" [1] زندگی کا سارا فلسفہ اس ذرا سے مصرعے میں مخفی ہے۔ زیادہ کیا عرض کروں، خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ لاہور میں اب کے بارش بالکل نہیں ہوئی۔ ابر روز آتا ہے مگر لاہور کی چار دیواری کے اندر اسے برسنے کا حکم نہیں ہے۔ اگست کے ابتدا میں چند روز کے لیے شملہ جانے کا

---

[1] حقائق کو سمجھنے والا۔ دانا۔ فہیم۔ ذہین

قصد ہے۔ کچہری تین اگست سے بند ہو جائے گی۔

والسلام
آپ کا خادم
محمد اقبال

(۳)

لاہور '۳ جون ۲۰ء

شیخ نور محمد کے نام

قبلہ و کعبہ السلام علیکم!

آپ کا والا نامہ ملا۔ الحمدللہ کہ آپ کی صحت اچھی ہے اور مجھے یقین ہے اللہ تعالیٰ دیر تک آپ کا سایہ ہمارے سر پر رکھے گا۔ بھائی صاحب نے اس سے پہلے کسی خط میں آپ کے انتظام خوراک وغیرہ کے بارے میں لکھا تھا۔ یہ طریقہ اچھا ہے اور اسی کو دستور العمل بنانا چاہیے۔ میں نے یورپ کے مشہور حکیم کی کتاب میں دیکھا ہے کہ جو شخص ہر روز دہی کی لسی پیا کرے اس کی عمر بڑھتی ہے۔ وہ کہتا ہے انسان کے جسم میں ایسے جراثیم ہیں جو قاطع حیات ہیں اور دہی کی لسی ان جراثیم کے لیے بمنزلہ زہر کے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گاؤں کے رہنے والے لوگ شہریوں کی نسبت عموماً طویل العمر اور تندرست ہیں۔ علی بخش نے کل مجھے بتایا کہ اس کی چچی کی لمبی عمر ہوئی اور آخر عمر میں اس کا گذران زیادہ تر لسی پر تھا۔ ترش لسی تو شاید آپ کے لیے مفید نہ ہو کہ آپ کا گلا خراب ہے البتہ میٹھے دہی کی لسی اگر صبح پی جائے تو شاید مفید ہو۔ اس کا تجربہ بھی کرنا چاہیے۔ افسوس ہے کہ کوئی اچھا مکان رہنے کو نہیں ملتا۔ موجودہ مکان میں جوان لوگ تو بہ آسایش رہ سکتے ہیں۔ بوڑھوں کو تکلیف ہے ورنہ میری خواہش تھی کہ سال کا زیادہ حصہ آپ میرے پاس بسر کیا کرتے۔ ذرا ریل کا انتظام ٹھیک ہو جائے تو ان شاء اللہ آپ کی قدم بوسی کے لیے حاضر ہوں گا۔ ڈاکٹر عبداللطیف نے آپ کے دانت بنائے تھے اگر وہ خراب ہو گئے ہوں تو ان کو ڈاک میں بھیج دیجیے گا پھر مرمت کرا دیے جائیں گے۔ اگر وہ قابلِ مرمت بھی نہ ہوں تو لکھیے ڈاکٹر عبداللطیف کو سیالکوٹ بھیج دوں گا کہ وہاں جا کر آپ کے دانت بنا دے۔ باقی خدا کے فضل و کرم

سے خیریت ہے۔ گھر سے سب آپ کی خدمت میں آداب لکھواتی ہیں۔

روحانی کیفیات کا سب سے بڑا ممد و معاون یہی کھانے پینے کی چیزوں میں احتیاط ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری زندگی اس بات کا ثبوت ہے۔ میں خود اپنی زندگی کم از کم کھانے پینے کے متعلق اسی طریق پر ڈھال رہا ہوں۔ دنیا کے حالات اور عام لوگوں کے حالات ایسے ہی ہیں ان کی طرف توجہ نہ کرنا چاہیے۔ عام لوگوں کی نگاہ بہت تنگ ہے۔ ان میں سے بیشتر حیوانوں کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اسی واسطے مولانا روم ایک جگہ لکھتے ہیں کہ چراغ لے کے تمام شہر میں پھرا کہ کوئی انسان نظر آئے مگر نظر نہ آیا۔ اور موجودہ زمانہ تو روحانیت کے اعتبار سے بالکل تہی دست ہے اسی واسطے اخلاص، محبت و مروت و یک جہتی کا نام و نشان نہیں رہا۔ آدمی آدمی کا خون پینے والا اور قوم قوم کی دشمن ہے۔ یہ زمانہ انتہائی تاریکی کا ہے۔ لیکن تاریکی کا انجام سفید ہے۔ کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ جلد اپنا فضل کرے اور بنی نوع انسان کو پھر ایک دفعہ نور محمدی عطا کرے۔ بغیر کسی بڑی شخصیت کے اس دنیا کی نجات نظر نہیں آتی۔ زیادہ کیا عرض کروں۔ خدا کا فضل ہے۔ غلام رسول بیمار تھا، کل میں نے اس کی خیریت دریافت کرنے کے لیے فیروز پور تار دیا تھا مگر تاحال جواب نہیں آیا۔ آج کل تار بھی دیر میں پہنچتے ہیں۔

والسّلام

محمد اقبال

(مکاتیبِ اقبال" مرتبہ سید مظفر حسین برنی)

سوالات

۱۔ مختصر جواب دیجیے :

(ا) "حضرت! میں آپ کو اپنا پیرو مرشد تصور کرتا ہوں۔" علامہ اقبالؒ نے یہ جملہ کس کے بارے میں لکھا تھا؟

(ب) علامہ اقبالؒ نے اکبرالہ آبادی کے رنگ میں چند اشعار کہنے کا کیا جواز

پیش کیا ہے ؟

(ج) علامہ اقبالؒ اکبر الہ آبادی کا وہ خط پڑھنے کے کیوں متمنی تھے جو انھوں نے نقاد کو لکھا تھا ؟

(د) علامہ اقبالؒ نے یورپ کے مشہور حکیم کی کتاب میں کیا پڑھا تھا ؟

(ہ) علامہ اقبالؒ کے خیال میں گاؤں کے رہنے والے لوگ شہریوں کی نسبت طویل العمر اور تندرست کیوں ہوتے ہیں ؟

۲۔ درج ذیل جملوں کی وضاحت کیجیے :

(ا) "غم بڑا مُدرکِ حقائق ہے۔"

(ب) "ابر روز آتا ہے مگر لاہور کی چاردیواری کے اندر اسے برسنے کا حکم نہیں ہے۔"

(ج) "مجھے یقین ہے اللہ تعالیٰ دیر تک آپ کا سایہ ہمارے سر پر رکھے گا۔"

۳۔ مندرجہ ذیل تراکیب کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

مدح سرائی، ارادت و عقیدت، متفق اللسّان، حصولِ دولت و جاہ، مُدرکِ حقائق، دستور العمل، قاطعِ حیات، طویل العمر، تہی دست

۴۔ سیاق و سباق کے حوالے سے عبارات کی تشریح کیجیے۔

(ا) میری شاعری گھٹ کر ---------- خیریت ہے۔

(ب) عام لوگ شاعرانہ انداز سے ---------- نقاد نہیں آیا۔

(ج) روحانی کیفیات کا ---------- نورِ محمدی عطا کرے !

○☆○☆○☆○☆○☆○

حصہ نظم

محسن کاکوروی

(۱۸۲۶ء - ۱۹۰۵ء)

عبادتِ صبح

کیفیتِ وحی میں ہے بلبل ہے وقتِ نزولِ مصحفِ گُل

سبزہ ہے کنارِ آب جُو پر یا خضر ہے مستعد وضو پر

نوبت ہے صدائے قمریاں کی تیاری ہے باغ میں اذاں کی

محوِ تکبیر فاختہ ہے قد و قامت سرو دل ربا ہے

پھیلی ہوئی بوئے گل چمن میں اور صَلِّ عَلیٰ کا غُل چمن میں

کیاری ہر اک اعتکاف میں ہے اور آبِ رواں طواف میں ہے

سالک ہے چمن میں نہرِ موزوں مجذوب ہے شاخِ بیدِ مجنوں

سجادہ بدوش لالہ یک سُو یک سُو شب زندہ دار شبو

ہر شمعِ خموش فکر میں ہے ہر طائرِ شوخ ذکر میں ہے

○☆○☆○☆○☆○☆○

(۲)

مدحِ خیر المرسلینؐ

سب سے اعلیٰ تری سرکار ہے سب سے اُفضل

میرے ایمانِ مفصّل کا یہی ہے مجمل

ہے تمنا کہ رہے نعت سے تیری خالی

نہ مرا شعر ' نہ قطعہ ' نہ قصیدہ ' نہ غزل

دین و دنیا میں کسی کا نہ سہارا ہو مجھے

صرف تیرا ہو بھروسا ' تری قوت ' ترا بل

ہو مرا ریشۂ اُمید وہ نخلِ سرسبز

جس کی ہر شاخ میں ہو پُھول ہر اک پُھول میں پَھل

آرزو ہے کہ رہے دھیان ترا تا دمِ مرگ

شکل تیری نظر آئے مجھے جب آئے اجل

رُخِ انور کا ترے دھیان رہے بعدِ فنا

میرے ہمراہ چلے راہِ عدم میں مشعل

صفِ محشر میں ترے ساتھ ہو تیرا مدّاح

ہاتھ میں ہو یہی مستانہ قصیدہ' یہ غزل

سوالات

۱۔ "عبادتِ صبح" میں شاعر نے مظاہرِ فطرت کے حوالے سے حمدِ باری تعالیٰ میں صبح کے سہانے وقت کی خوبصورت الفاظ میں جو تصویر کشی کی ہے اسے اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

۲۔ "عبادتِ صبح" میں شاعر نے کیاری کو معتکف ' آبِ رواں کو طواف ' نہرِ موزوں کو سالک ' شاخِ بید مجنوں کو مجذوب ' لالہ کو سجادہ بدوش ' شمعِ خموش کو مفکر اور طائرِ شوخ کو ذاکر کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ ان تمام تشبیہات میں

وجہ شبہ بیان کیجیے۔

۳۔ علم بیان کی اصطلاح میں کلام میں کسی مشہور قصے، واقعے یا روایت کی طرف اشارہ کرنے کو تلمیح کہتے ہیں۔ مثلاً حُسنِ یوسف : حضرت یوسفؑ کی طرف اشارہ ہے جو حُسن و زیبائی میں لاثانی تھے۔ دمِ عیسیٰ : حضرتِ عیسیٰؑ کی طرف اشارہ ہے جو لاعلاج بیماروں کو شفا بخشتے اور تنِ مردہ میں جان ڈال دیتے تھے۔ اسی طرح یدِ بیضا حضرت موسیٰؑ کے ہاتھ کی طرف اشارہ ہے جو بچپن میں انگارہ ہاتھ میں لینے سے جل گیا تھا مگر خدا تعالیٰ نے اس داغِ سوختہ میں وہ نور بطور معجزہ عطا فرمایا تھا کہ جب آپ اس ہاتھ کو بغل میں دے کر باہر نکالتے تو مثلِ آفتاب روشن ہو جاتا تھا اور آنکھوں میں چکاچوند آنے لگتی تھی۔

اردو زبان و ادب میں اَن گنت تلمیحات مستعمل ہیں مثلاً : آتشِ نمرود، کوہِ طور، اورنگِ سلیمان، ابنِ مریم، آبِ حیات، صبرِ ایوب، برادرانِ یوسف، نالۂ یعقوب، خیبر شکن، گنج بخش، گنجِ شکر، محمود و ایاز، تیشۂ فرہاد اور مانی و بہزاد وغیرہ۔

"عبادتِ صبح" میں بھی کیفیتِ وحی اور خضر کے الفاظ تلمیح کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ آپ ان واقعات کو اپنے الفاظ میں لکھیے۔

۴۔ "مدحِ خیر المرسلینؐ" میں شاعر نے کیا کیا دعا کی ہے ؟

۵۔ "مدحِ خیر المرسلینؐ" کے پہلے شعر میں "ایمانِ مفصّل" سے کیا مراد ہے؟

۶۔ مندرجہ ذیل تراکیب کا مفہوم واضح کیجیے :
نخلِ سرسبز، فکرِ فردا، دمِ مرگ، رخِ انور، راہِ عدم، صفِ محشر۔

○☆○☆○☆○☆○☆○

خواجہ الطاف حسین حالیؔ
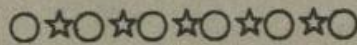
(۱۸۳۷ء - ۱۹۱۴ء)

عرضِ حال بجناب سرورِ کائنات

اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقتِ دُعا ہے
اُمت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے

جو دین بڑی شان سے نکلا تھا، وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے

وہ دین، ہوئی بزم جہاں، جس سے چراغاں
آج اس کی مجالس میں نہ بتی نہ دیا ہے

جو دین کہ تھا شرک سے عالم کا نگہباں
اب اس کا نگہبان اگر ہے تو خدا ہے

جس دین نے غیروں کے تھے دل آ کے ملائے
اس دین میں خود بھائی سے اب بھائی جدا ہے

عالِم ہے سو بے عقل ہے، جاہِل ہے سو وحشی
منعم ہے سو مغرور ہے، مفلِس سو گدا ہے

چھوٹوں میں اطاعت ہے نہ شفقت ہے بڑوں میں
پیاروں میں محبت ہے نہ یاروں میں وفا ہے

فریاد ہے اے کشتیِ امت کے نگہبان
بیڑا یہ تباہی کے قریب آن لگا ہے

سوالات

۱۔ "خاصۂ خاصانِ رُسُل" اور "کشتیِ امت کے نگہبان" سے کون سی ہستی مراد ہے؟

۲۔ اس نظم کے تیسرے، چوتھے اور پانچویں شعر کی تشریح کیجیے۔

۳۔ ہر شعر کے آخر میں آنے والے ہم آواز الفاظ کو "قافیہ" کہا جاتا ہے۔ مثلاً: مولانا حالی کی اس نظم میں دعا، پڑا، غربا، دیا، خدا، جدا، گدا اور وفا قافیہ ہے۔ قافیے کے بعد اگر کوئی لفظ یا الفاظ ایسے آتے ہیں جو جوں کے توں بار بار دہرائے جاتے ہیں تو انھیں "ردیف" کہا جاتا ہے۔ اس نظم میں "ہے" ردیف ہے۔ آپ اپنی کتاب میں سے کوئی سی اور نظم لے کر اس میں قافیہ اور ردیف کی نشاندہی کیجیے۔

۴۔ خواجہ الطاف حسین حالی نے اس نظم میں مسلمانوں کی زبوں حالی کا جو نقشہ کھینچا ہے اسے اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

۵۔ اس نظم کے حوالے سے عالم کے بے عقل، جاہل کے وحشی، منعم کے مغرور اور مفلس کے گدا ہونے کا مفہوم واضح کیجیے۔

○☆○☆○☆○☆○☆○

نظیر اکبر آبادی

(۱۷۳۵ء۔۱۸۳۰ء)

(۱)

آدمی نامہ

دنیا میں بادشہ ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
اور مفلس و گدا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
زردار، بے نوا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
نعمت جو کھا رہا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

ٹکڑے جو مانگتا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

ابدال و قطب و غوث و ولی آدمی ہوئے
منکر بھی آدمی ہوئے اور کفر کے بھرے
کیا کیا کرشمے کشف و کرامات کے کیے
حتیٰ کہ اپنے زہد و ریاضت کے زور سے

خالق سے جا ملا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

فرعون نے کیا تھا جو دعویٰ خدائی کا
شدّاد بھی بہشت بنا کر ہوا خدا
نمرود بھی خدا ہی کہاتا تھا برملا
یہ بات ہے سمجھنے کی، آگے کہوں میں کیا

یاں تک جو ہو چکا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی پہ جان کو وارے ہے آدمی
اور آدمی ہی تیغ سے مارے ہے آدمی
پگڑی بھی آدمی کی اُتارے ہے آدمی
چلّا کے آدمی کو پکارے ہے آدمی

اور سُن کے دوڑتا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

چلتا ہے آدمی ہی مسافر ہو لے کے مال
اور آدمی ہی مارے ہے پھانسی گلے میں ڈال
یاں آدمی ہی صید ہے اور آدمی ہی جال
سچا بھی آدمی ہی نکلتا ہے میرے لال

اور جھوٹ کا بھرا ہے ، سو ہے وہ بھی آدمی

اک آدمی ہیں جن کے یہ کچھ زرق برق ہیں روپے کے ان کے پاؤں ہیں سونے کے فرق ہیں
جھمکے تمام غرب سے لے تابہ شرق ہیں کم خواب تاش شال دوشالوں میں غرق ہیں

اور چیتھڑوں لگا ہے ، سو ہے وہ بھی آدمی

اشراف اور کمینے سے لے شاہ تا وزیر ہیں آدمی ہی صاحب عزت بھی اور حقیر
یاں آدمی مرید ہیں اور آدمی ہی پیر اچھا بھی آدمی ہی کہاتا ہے اے نظیر

اور سب میں جو بُرا ہے ، سو ہے وہ بھی آدمی

(۲)

تندرستی

ہیں مرد اب وہی کہ جنھوں کا ہے فن درست حرمت انھوں کے واسطے جن کا چلن درست
رہتا نہیں کسی کا سدا مال دھن درست دولت رہی کسی کی نہ باغ و چمن درست

جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

دنیا میں اب انھوں کے تئیں کہیے بادشاہ جن کے بدن درست ہیں دن رات سال و ماہ
جس پاس تندرستی و حرمت کی ہو سپاہ ایسی پھر اور کون سی دولت ہے واہ واہ

جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

جو گھر میں اپنے پیری و حشمت پناہی ہے بن تندرستی سب وہ خرابی تباہی ہے
یہ تندرستی یارو بڑی بادشاہی ہے سچ پوچھیے تو عین یہ فضلِ الٰہی ہے

جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

عاجز ہو یا حقیر ہو پر تندرست ہو بے زر ہو یا امیر ہو پر تندرست ہو
قیدی ہو یا اسیر ہو پر تندرست ہو مفلس ہو یا فقیر ہو پر تندرست ہو

جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

اس میں تمام ختم ہیں عالم کی خوبیاں ہو تندرستی اور ملے حرمت سے آب و ناں
قسمت سے جب یہ دونوں میسر ہوں پھر تو یاں پھر ایسی اور کون سی نعمت ہے میری جاں

جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

آیا جو دل میں سیرِ چمن کو چلے گئے بازار، چوک، سیر، تماشے میں خوش ہوئے
بیٹھے، اٹھے خوشی سے ہر اک جا چلے پھرے جاگے مزے میں رات کو یا خوش ہو سو رہے

جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

قدرت سے یہ جو تن کی بنی ہے ہر ایک کَل جب تک یہ کَل بنی ہے تو ہے آدمی کو کل
گر ہو خدانخواستہ ایک کل بھی چل بچل پھر نہ خوشی نہ عیش نہ کچھ زندگی کا پھل

جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

ادنیٰ ہو یا غریب تونگر ہو یا فقیر یا بادشاہ شہر کا یا ملک کا وزیر
ہے سب کو تندرستی و حرمت ہی دل پذیر جو تو نے اب کہا سو یہی سچ ہے اے نظیرؔ

جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

سوالات

۱۔ نظم "آدمی نامہ" کا مرکزی خیال لکھیے۔

۲۔ "آدمی نامہ" کے تیسرے بند میں جن تاریخی واقعات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے انھیں اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

۳۔ اس نظم کے چوتھے بند کی تشریح کیجیے۔

۴۔ "آدمی نامہ" نظیر اکبر آبادی کی ایک طویل نظم ہے۔ شاملِ نصاب نظم اس کا محض اقتباس ہے۔ آپ اپنی کالج کی لائبریری سے "کلیاتِ نظیر" حاصل کر کے پوری نظم کا مطالعہ کیجیے اور دیکھیے کہ نظیر نے آدمی کی کون کون سی اُقسام گنوائی ہیں۔

۵۔ مخمّس کا ہر پانچواں مصرع اور مسدّس کے ہر بند کا تیسرا شعر اگر بِن و عَن دہرائے جائیں تو مخمّس میں اسے ٹیپ کا مصرع اور مسدس میں ٹیپ کا شعر کہتے ہیں۔ گویا شاعر اپنی بات میں زور پیدا کرنے کے لیے اس مصرع یا شعر میں کہی گئی بات کو بار بار دہراتا ہے۔ نظم "تندرستی" میں شاعر نے ٹیپ کے شعر میں کیا بات ذہن نشین کرنے کی کوشش کی ہے؟

۶۔ "تندرستی سب سے بڑی دولت ہے۔" اس موضوع پر ایک جامع مضمون لکھیے۔

○☆○☆○☆○☆○☆○

میر انیس

(۱۸۰۰ء۔ ۱۸۷۴ء)

نمودِ صُبح

طے کر چکا جو منزلِ شب کاروانِ صبح
ہونے لگا اُفق سے ہوَیدا نشانِ صبح
گرُدوں سے کُوچ کرنے لگے اخترانِ صبح
ہر سُو ہوئی بلند صدائے اذانِ صبح

پنہاں نظر سے روئے شبِ تار ہو گیا
عالم تمام مطلعِ انوار ہو گیا

خورشید نے جو رخ سے اٹھائی نقابِ شب
در کھل گیا سحر کا، ہُوا بند بابِ شب
انجم کی فرد فرد سے لے کر حسابِ شب
دفتر کشائے صبح[1] نے الٹی کتابِ شب

گردوں پہ رنگِ چہرۂ مہتاب فق ہوا
سلطانِ غرب و شرق کا نظم و نسق ہوا

یوں گُلشنِ فلک سے ستارے ہوئے نہاں
چن لے چمن سے پھولوں کو جس طرح باغباں
آئی بہار میں گلِ مہتاب پر خزاں
مرجھا کے رہ گئے ثمر و شاخِ کہکشاں

دِکھلائے طَور بادِ سحر نے سمُوم کے
پژمردہ ہو کے رہ گئے، غنچے نجوم کے

---

[1] استعارے میں صبح کو اجالے کا دفتر کھولنے والا کہا ہے۔

چھپنا وہ ماہتاب کا وہ صبح کا ظُہور
یادِ خدا میں زمزمہ پردازی طُیور
وہ رونق اور وہ سرد ہوا ' وہ فضا ' وہ نُور
خنکی ہو جس سے چشم کو اور قلب کو سُرور

انساں زمیں پہ محو ' مَلک آسمان پر
جاری تھا ذکرِ قدرتِ حق ہر زبان پر

وہ سرخیِ شفق کی اُدھر چرخ پر بہار
وہ بارور درخت ' وہ صحرا وہ سبزہ زار
شبنم کے وہ گلوں پہ گہر ہائے آبدار
پھولوں سے سب بھرا ہوا دامان کوہسار

نافے کھُلے ہوئے وہ گلُوں کی شمیم کے
آتے تھے سرد سرد وہ جھونکے نسیم کے

تھی دشتِ کربلا کی زمیں ' رشکِ آسماں
تھا دُور دُور تک شبِ مہتاب کا سماں
چھٹکے ہوئے ستاروں کا ذرّوں پہ تھا گماں
نہرِ فرات بیچ میں تھی مثلِ کہکشاں

سر سبز جو درخت تھا وہ نخلِ طُور تھا
صحرا کے ہر نہال کا سایہ بھی نُور تھا

سوالات

۱۔ "نمودِ صبح" کے پہلے بند کے چاروں مصرعوں میں کاروان ' نشان ' اختران اور اذان "قافیہ" ہے جب کہ صبح "ردیف" ہے۔ پانچویں اور چھٹے مصرعے

میں تار اور انوار "قافیہ" اور ہو گیا "ردیف" ہے۔ آپ اس نظم کے پانچویں اور چھٹے بند میں قافیہ اور ردیف کی نشاندہی کیجیے۔

۲۔ مندرجہ ذیل تراکیب کا مفہوم واضح کیجیے:

صدائے اذانِ صبح، روئے شبِ تار، دفترکشائے صبح، رنگِ چہرۂ آفتاب، سلطانِ غرب و شرق، ثمرِ شاخِ کہکشاں، زمزمہ پردازیِ طیور، ذکرِ قدرتِ حق، گہرہائے آبدار۔

۳۔ گُلِ مہتاب پر خزاں کے آنے کا مفہوم اپنے الفاظ میں واضح کیجیے۔

۴۔ "نمودِ صبح" کے تیسرے اور آخری بند میں چند تشبیہات کا استعمال ہوا ہے۔ ان کی نشاندہی کر کے ان کا تجزیہ کیجیے۔

۵۔ "نمودِ صبح" کے آخری بند میں "نخلِ طُور" تلمیح آئی ہے۔ اس تلمیح کا پس منظر بیان کیجیے۔

۶۔ "نمودِ صبح" میں صبح کے سماں کی جو منظر کشی کی گئی ہے اسے اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

○☆○☆○☆○☆○☆○

اکبرالہ آبادی

(۱۸۴۵ء-۱۹۲۱ء)
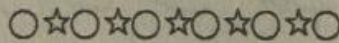
(۱)

اگر مذہب گیا

ہم نشیں کہتا ہے کچھ پروا نہیں مذہب گیا
میں یہ کہتا ہوں کہ بھائی یہ گیا تو سب گیا

ہے عقیدوں کا اثر اخلاقِ انساں پر ضرور
اس جگہ کیا چیز ہو گی وہ اثر جب دَب گیا

پیٹ میں کھانا زباں پر کچھ مسائل نا تمام
قوم کے معنی گئے اور روح کا مطلب گیا

اِتحّادِ معنوی ان میں برائے نام ہے
دیکھتے ہو اک گروہ اک راہ ہو کر کب گیا

نوکری کے باب میں وہ پالسی قائم نہیں
ہوش میں آؤ، وہ رنگِ روز و رنگِ شب گیا

ہم یہی کہتے ہیں صاحب سوچ لو انجامِ کار
دوسرا پھر کیا ٹھکانا ہے اگر مذہب گیا

(۲)

وَصلِ لیلیٰ

خدا حافظ مسلمانوں کا اکبرؔ
مجھے تو ان کی خوش حالی سے ہے یاس

یہ عاشق شاہدِ مقصود کے ہیں
نہ جائیں گے، ولیکن سعی کے پاس

سُناؤں تم کو اک فرضی لطیفہ
کیا ہے جس کو میں نے زیبِ قرطاس

کہا مجنوں سے یہ لیلیٰ کی ماں نے
کہ بیٹا تو اگر ایم-اے کرلے پاس

تو فوراً بیاہ دوں لیلیٰ کو تجھ سے
بِلا دقّت میں بن جاؤں تری ساس

کہا مجنوں نے یہ اچھّی سنائی
کُجا عاشق، کُجا کالج کی بکواس

کُجا یہ فطرتی جوشِ طبیعت
کُجا ٹھونسی ہوئی چیزوں کا احساس

بڑی بی آپ کو کیا ہو گیا ہے
ہرن پر لادی جاتی ہے کہیں گھاس !

یہ اچھی قدر دانی آپ نے کی
مجھے سمجھا ہے کوئی ہر چرن داس

یہی ٹھہری جو شرطِ وَصلِ لیلیٰ
تو استعفا مرا باحسرت و یاس

(۳)

متفرق اشعار

ہم ایسی کُل کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے بیٹے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

☆

نہیں کچھ اس کی پُرسش الفتِ اللہ کتنی ہے
یہی سب پوچھتے ہیں آپ کی تنخواہ کتنی ہے

☆

شوقِ لیلائے سول سروس نے مجھ مجنوں کو
اتنا دوڑایا لنگوٹی کر دیا پتلون کو

☆

اپنی گرہ سے کچھ نہ مجھے آپ دیجیے
اخبار میں تو نام مرا چھاپ دیجیے

☆

ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے اسپتال جا کر

☆

مصیبت میں بھی اب یادِ خدا آتی نہیں ان کو
دعا منہ سے نہ نکلی پاکٹوں سے عرضیاں نکلیں

☆

کورس تو حرف ہی سکھاتے ہیں
آدمی، تو آدمی بناتے ہیں

☆

سوالات

۱۔ اکبرالہ آبادی نے "اگر مذہب گیا" میں اپنے ہم مذہبوں کو کیا تلقین کی ہے؟
۲۔ نظم "اگر مذہب گیا" کے پہلے تین اشعار کی تشریح کیجیے۔
۳۔ نظم "وصلِ لیلیٰ" میں اکبرالہ آبادی نے مسلمان نوجوانوں کی تن آسانی کا جو فرضی لطیفہ بیان کیا ہے اسے اپنے الفاظ میں تحریر کیجیے۔
۴۔ نظم "وصلِ لیلیٰ" کا مرکزی خیال لکھیے۔
۵۔ مندرجہ ذیل تراکیب کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے:
وصلِ لیلیٰ، شاہدِ مقصود، زیبِ قرطاس، جوشِ طبیعت، حسرت و یاس
۶۔ اکبرالہ آبادی طنزیہ و مزاحیہ شاعری کے پردے میں مسلمانوں کی اصلاح چاہتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کے بہت سے اشعار زبان زدِ خاص و عام ہیں۔ آپ نصاب میں شامل ان کے "متفرق اشعار" کے علاوہ چند مزید اشعار لکھیے۔

○☆○☆○☆○☆○☆○

علامہ اقبالؒ

(۱۸۷۷ء - ۱۹۳۸ء)

(۱)

حقیقتِ حُسن

خدا سے حُسن نے اِک روز یہ سوال کیا
جہاں میں کیوں نہ مجھے تُو نے لازوال کیا۔

مِلا جواب کہ تصویر خانہ ہے دنیا
شبِ درازِ عدم کا فسانہ ہے دنیا

ہوئی ہے رنگِ تغیر سے جب نمود اس کی
وہی حَسیں ہے حقیقت زوال ہے جس کی

کہیں قریب تھا، یہ گفتگو قمر نے سنی
فلک پہ عام ہوئی، اخترِ سحر نے سنی

سحر نے تارے سے سن کر سنائی شبنم کو
فلک کی بات بتا دی زمیں کے محرم کو

بھر آئے پھول کے آنسو پیامِ شبنم سے
کلی کا ننھا سا دل خون ہو گیا غم سے

چمن سے روتا ہوا موسمِ بہار گیا
شباب سیر کو آیا تھا، سوگوار گیا

(۲)

اَلْاَرْضُ لِلّٰہ

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب ؟

کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار
خاک یہ کس کی ہے ؟ کس کا ہے یہ نورِ آفتاب ؟

کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب
موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب ؟

دہ خدایا ! یہ زمیں تیری نہیں، تیری نہیں !
تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں !

(۳)

رُوحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے

کھول آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ !
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ !
اس جلوۂ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ !
ایام جدائی کے ستم دیکھ، جفا دیکھ !
بے تاب نہ ہو، معرکۂ بیم و رجا دیکھ !

ہیں تیرے تصرّف میں یہ بادل، یہ گھٹائیں
یہ گنبدِ افلاک، یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ، یہ صحرا، یہ سمندر یہ ہوائیں
تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ !

سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے !
دیکھیں گے تجھے دُور سے گردُوں کے ستارے !
ناپید ترے بحرِ تخیل کے کنارے !
پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے !
تعمیرِ خودی کر، اثرِ آہِ رسا دیکھ !

ا ؎ گاؤں کا مالک۔ زمیندار

خورشیدِ جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں
آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں
اے پیکرِ گِل کوششِ پیہم کی جزا دیکھ!

نالندہ ترے عُود کا ہر تار ازل سے
تُو جنسِ محبت کا خریدار ازل سے
تُو پیرِ صنم خانۂ اَسرار ازل سے
محنت کش و خوں ریز و کم آزار ازل سے
ہے راکبِ تقدیرِ جہاں تیری رضا دیکھ!

(۴)

بلالؓ

چمک اٹھا جو ستارہ ترے مقدر کا — حبش سے تجھ کو اٹھا کر حجاز میں لایا
ہوئی اسی سے ترے غمکدے کی آبادی — تری غلامی کے صدقے ہزار آزادی
وہ آستاں نہ چھُٹا تجھ سے ایک دم کے لیے — کسی کے شوق میں تُو نے مزے ستم کے لیے

جفا جو عشق میں ہوتی ہے وہ جفا ہی نہیں
ستم نہ ہو تو محبت میں کچھ مزا ہی نہیں

نظر تھی صورتِ سلماںؓ ادا شناس تری — شرابِ دید سے بڑھتی تھی اور پیاس تری
تجھے نظارے کا مثلِ کلیمؑ سودا تھا — اُویسؓ طاقتِ دیدار کو ترستا تھا

مدینہ تیری نگاہوں کا نُور تھا گویا　　ترے لیے تو یہ صحرا ہی طُور تھا گویا
تری نظر کو رہی دید میں بھی حسرتِ دید　　خنک دِلے کہ تپید و دَمے نیا سائید[1]
گری وہ برق تری جانِ ناشکیبا پر　　کہ خندہ زن تری ظلمت تھی دستِ موسیٰ پر

تپش ز شعلہ گرفتند و بر دلِ تُو زدند
چہ برقِ جلوہ بخاشاکِ حاصلِ تُو زدند ![2]

ادائے دید سراپا نیاز تھی تیری　　کسی کو دیکھتے رہنا نماز تھی تیری
اذاں ازل سے ترے عشق کا ترانہ بنی　　نماز اس کے نظارے کا اک بہانہ بنی

خوشا وہ وقت کہ یثرب مقام تھا اس کا !
خوشا وہ دَور کہ دیدار عام تھا اس کا !

(۵)

جاوید کے نام

(لندن میں اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا پہلا خط آنے پر)

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ، نئے صبح و شام پیدا کر

خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو
سکوتِ لالہ و گُل سے کلام پیدا کر

۱۔ وہ دل کتنا اچھا ہے جو تڑپتا رہا اور جس نے لمحے بھر کے لیے بھی آرام نہ کیا۔
۲۔ شعلے سے آگ لی اور تیرے دل میں لگا دی۔ حسن کی کیسی بجلی تیرے وجود کے خس و خاشاک پر گرا دی۔

اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں
سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر

میں شاخِ تاک ہوں میری غزل ہے میرا ثمر
مرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر

مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

سوالات

۱۔ حسن نے اپنے بارے میں خدا تعالیٰ سے کیا سوال کیا اور بارگاہِ الٰہی سے حسن کو اس کے سوال کا کیا جواب ملا؟

۲۔ علامہ اقبالؒ کی شاعری کا انداز کہیں کہیں تمثیلی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے "حقیقتِ حسن" میں کون سی تمثیل پیش کی ہے اور یہاں کس نکتے کی وضاحت مطلوب ہے؟ اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

۳۔ نظم "الارض للہ" میں شاعر نے کس بات کو سمجھانے کی کوشش کی ہے؟

۴۔ آدم جنت سے رخصت ہو کر زمین پر اترتا ہے تو روحِ ارضی کیا کہتے ہوئے اس کا استقبال کرتی ہے؟

۵۔ نظم "بلالؓ" کے آخری تین اشعار کی تشریح کیجیے:

۶۔ علامہ اقبالؒ کو لندن میں اپنے بیٹے جاوید کے ہاتھ کا لکھا ہوا خط موصول ہوا تو انھوں نے اس کے جواب میں "جاوید نامہ" میں اسے کیا تلقین کی؟

۷۔ مندرجہ ذیل تراکیب کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

رنگِ تغیر، اخترِ سحر، پیامِ شبنم، نورِ آفتاب، خوشۂ گندم، خوئے انقلاب،

ایامِ جدائی، گنبدِ افلاک، آئینہ ایام، بحرِ تخیل، تعمیرِ خودی، خونِ جگر، پیکرِ گل، کوششِ پیہم، جنسِ محبت، شرابِ دید، طاقتِ دیدار، جانِ ناشکیبا، دیارِ عشق، میناو جام، شاخِ تاک، جوئے آب، گرمیِ محفل، صبحِ ازل۔

۸۔ مندرجہ ذیل مرکبات کا مفہوم واضح کیجیے :

شبِ درازِ عدم، بادِ سازگار، جلوۂ بے پردہ، معرکۂ بیم و رجا، اثرِ آہ رسا، خورشیدِ جہاں تاب، پیر صنم خانۂ اسرار، راکبِ تقدیرِ جہاں، دلِ فطرت شناس، سکوتِ لالہ و گل، شیشہ گرانِ فرنگ، مۓ لالہ فام، رہ نوردِ شوق، دریائے تند و تیز، صنم کدۂ کائنات، میانۂ حق و باطل۔

○☆○☆○☆○☆○☆○

مولانا ظفر علی خاں
(۱۸۷۳ء-۱۹۵۶ء)
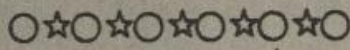
اِقتِصاد

از بسکہ فکر ہے مجھے سب کے مفاد کی — تعلیم دے رہا ہوں میں سب کو جہاد کی
درس اتفاق کا جو دیا شیخ و شاب کو — اٹھی گلی گلی سے صدا زندہ باد کی
بغض و نفاق و کینہ سے سینے ہوئے ہیں پاک — جڑ کاٹنے چلا ہوں میں نخلِ فساد کی
اب آسماں بھی آنے لگا میری راہ پر — پارینہ داستاں ہوئی اس کے عناد کی
اسلام کے جلال کا پرچم ہُوا بلند — بستی الٹ گئی ہے ثمود اور عاد کی
اب بھی چمک رہا ہے حسینؓ و علیؓ کا نام — اور خاک اڑ رہی ہے یزید اور زیاد کی
اب بدگمانیوں کا زمانہ نہیں رہا — حاجت ہے ایک دوسرے پر اعتماد کی

مُحکم بنا اسی سے ہے قصرِ فرنگ کی
تُو بھی کر استوار اساس اِقتِصاد کی

سوالات

۱۔ نظم "اِقتِصاد" کے پانچویں، چھٹے اور ساتویں شعر کی تشریح کیجیے۔
۲۔ اس نظم کے آخری شعر میں مولانا ظفر علی خاں نے قوم کو کیا پیغام دیا ہے؟
۳۔ مندرجہ ذیل تراکیب کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے:
شیخ و شاب، بغض و نفاق، نخلِ فساد، ثمود اور عاد، قصرِ فرنگ۔

جوش ملیح آبادی

(۱۸۹۶ء - ۱۹۸۲ء)

(۱)

وحدتِ انسانی

اے دوست ' دل میں گردِ کدورت نہ چاہیے
اچھے تو کیا ' بروں سے بھی نفرت نہ چاہیے
کہتا ہے کون ' پھول سے رغبت نہ چاہیے
کانٹے سے بھی مگر تجھے وحشت نہ چاہیے

کانٹے کی رگ میں بھی ہے لہو مرغزار کا
پالا ہوا ہے وہ بھی نسیمِ بہار کا

ہوتے ہیں پائے مال' تو کہتے ہیں زرد پھول
کل رحمتِ عمیم کا ' ہم پر بھی تھا نزول
خوبانِ بوستان میں ' ہمارا بھی تھا شمول
اے راہ رو ' نہ ڈال ' ہمارے سروں پہ دھول

ہر چند' انجمن کے نکالے ہوئے ہیں ہم
لیکن ' صبا کی گود کے پالے ہوئے ہیں ہم

بے جان و جان دار کی بنیاد ایک ہے
ارض و سما کی علتِ ایجاد ایک ہے
بت سیکڑوں ہیں ' حسنِ خداداد ایک ہے
سب دل ' الگ الگ ہیں ' مگر یاد ایک ہے

یکساں ہے مال ، گو ہیں دکانیں جدا جدا
معنی ہیں سب کے ایک ، زبانیں جدا جدا

جو ، روشنی چکاں ہے ، سو ہے وہ بھی آدمی
جو ، تیرگی فشاں ہے ، سو ہے وہ بھی آدمی
جو ، یارِ مہرباں ہے ، سو ہے وہ بھی آدمی
اور ، جو عدوئے جاں ہے ، سو ہے وہ بھی آدمی

تُو ، بھاگ ، خواہ موت سے ، یا زندگی سے بھاگ
اے آدمی ، کبھی نہ مگر آدمی سے بھاگ

(۲)

ماں جائے کی یاد

میں دیس میں تم وطن سے باہر
اے بھائی ، بہن نثار تم پر

انگنائی میں ہو رہا ہے غوغا
ساون کی ہے رُت ، ہَوا ہے پُروا

سائے میں گرجتی بجلیوں کے
استادہ ہیں دو شریر بچے

اک موجِ رواں ہے اک چمن ہے
اک خیر سے بھائی ، اِک بہن ہے

کچھ دیر سے دونوں لڑ رہے ہیں
کیا جانیے کیوں جھگڑ رہے ہیں

میں دیکھ رہی ہوں اور چپ ہوں
کس جی سے بھلا فساد کاٹوں

اس جنگ کے آئینے کے اندر
بچپن ہے ہمارا جلوہ گستر

کرتے تھے شرارتیں ، اُدھم بھی
لڑتے تھے اسی طرح سے ہم بھی

سوالات

۱۔ نظم "وحدتِ انسانی" میں جوش ملیح آبادی نے ہمیں کیا درس دیا ہے ؟

۲۔ مندرجہ ذیل تراکیب کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے :
گردِ کدُورت ،نسیم بہار ، رحمتِ عمیم ، خوبانِ بوستاں ، ارض و سما، علّتِ ایجاد ، حسنِ خدا داد ، تیرگی فشاں ، یارِ مہرباں ، موجِ رواں ، جلوہ گستر۔

۳۔ نظم "وحدتِ انسانی" کے پہلے اور تیسرے بند کی تشریح کیجیے۔

۴۔ نظم "ماں جائے کی یاد" کا مرکزی خیال بیان کیجیے۔

○☆○☆○☆○☆○☆○

حفیظ جالندھری

(۱۹۰۰ء – ۱۹۸۲ء)

(۱)

مزارِ قُطبُ الدّین اَیبک

وہ قطب الدین وہ مَردِ مجاہد جس کی ہَیبت سے
یہ دنیا از سرِ نَو جاگ اٹھی تھی خوابِ غفلت سے

وہ جس کی تیغِ ہیبت ناک سے سفّاک ڈرتے تھے
وہ جس کے بازوؤں کی دھاک سے افلاک ڈرتے تھے

یہاں لاہور میں سوتا ہے اک گمنام کوچے میں
پڑی ہے یادگارِ دولتِ اسلام ، کوچے میں

میں اکثر شہر کے پُرشور ہنگاموں سے اکتا کر
سکوں کی جستجو میں بیٹھ جاتا ہوں یہاں آ کر

تخیّل مجھ کو لے جاتا ہے اک پُرہَول میداں میں
جہاں باہم بپا ہوتی ہے جنگ انبوہِ انساں میں

نظر آتا ہے لہراتا ہوا اسلام کا جھنڈا
ہر سُو نور پھیلاتا ہوا اسلام کا جھنڈا

مقابل میں گھٹائیں دیکھتا ہوں فوجِ باطلؔ کی
نظر آتی ہے فرعونی خدائی اَوجِ باطل کی

صدائیں نعرہ ہائے جنگ کی آتی ہیں کانوں میں
بلند آہنگ تکبیریں سما جاتی ہیں کانوں میں

نظر آتا ہے مجھ کو سُرخرو ہونا شہیدوں کا
وہ اطمینان ' وہ ہنستا ہوا چہرہ امیدوں کا

علم کے سائے میں سلطانِ غازی کا بڑھے جانا
سرِ دشمن پہ افواجِ حجازی کا چڑھے جانا

مجھے محسوس ہوتا ہے کہ غازی مرد ہوں میں بھی
پرانے لشکرِ اسلام کا اک فرد ہوں میں بھی

شہادت کے رجز پڑھتا ہوں میدانِ شہادت میں
رجز پڑھتا ہوا بڑھتا ہوں ارمانِ شہادت میں

عظیم الشان ہوتا ہے یہ منظر پاکبازی کا
شہیدوں کی خموشی ' غُلغُلہ مُردانِ غازی کا

مرا جی چاہتا ہے اب نہ اپنے آپ میں آؤں
اسی آزاد دنیا کی فضا میں جذب ہو جاؤں

(۲)

جلوۂ سحر

(i)

چلا ستارۂ سحر سنا کے صبح کی خبر

زمیں پہ نور چھا گیا فلک پہ رنگ آ گیا
تمام زادگانِ شب چمک چمک کے سو گئے
شرارِ آسمانِ شب دمک دمک کے سو گئے
ستارے زرد ہو چکے چراغ سرد ہو چکے
وہ ٹمٹا کے رہ گئے وہ جھلملا کے رہ گئے
چلا ستارۂ سحر سنا کے صبح کی خبر

(ii)

یکایک ایک نور کا غبار شرق سے اٹھا
جو رفتہ رفتہ بڑھ چلا اور آسماں پہ چھا گیا
حسینۂ نمود نے سیہ نقاب اٹھا دیا
فسوں گرِ شہود نے طلسمِ شب مٹا دیا
یکایک ایک تازگی یکایک ایک روشنی
نگاہ جاں میں آ گئی حیات میں سما گئی
یکایک ایک نور کا غبار شرق سے اٹھا

(iii)

عبادتوں کے دَر کھلے سعادتوں کے گھر کھلے
دَرِ قبول وا ہوا دعا کا وقت آ گیا
اذان کی صدا اٹھی جگا دیا نماز کو
چلی ہے اٹھ کے بندگی لیے ہوئے نیاز کو

صنم کدہ بھی کھل گیا   اٹھا ہے شور سنکھ کا
چلو نمازیو چلو   اٹھو پجاریو چلو
عبادتوں کے دَر کُھلے   سعادتوں کے گھر کھلے

(iv)

کسان اٹھ کھڑے ہوئے   مویشیوں کو لے چلے
کہیں مزے میں آ گئے   تو کوئی تان اڑا گئے
یہ سرد شبنمی ہوا   یہ صحت آفریں سماں
یہ فرش سبز گھاس کا   یہ دل فریب آسماں
بسے ہوئے ہیں پریت میں   ہیں محو ان کے گیت میں
کہاں ہیں شہر کے مکیں   وہ بے نصیب اٹھے نہیں
کسان اٹھ کھڑے ہوئے   مویشیوں کو لے چلے

(v)

اٹھی حسینۂ سحر   پہن کے سر پہ تاجِ زر
لباسِ نُور زیبِ بر   چڑھی فرازِ کوہ پر
وہ خندہ نگاہ سے   پہاڑ طُور بن گئے
وہ عکسِ جلوہ گاہ سے   سحاب نُور بن گئے
نوائے جوئبار اٹھی   صدائے آبشار اٹھی
ہواؤں کے رباب اٹھے   خوش آمدید کے لیے
اٹھی حسینۂ سحر   پہن کے سر پہ تاجِ زر

سوالات

۱۔ نظم ”جلوۂ سحر“ کے حوالے سے ”عبادتوں کے در کھلے، سعادتوں کے گھر کھلے“ کا مفہوم واضح کیجیے۔

۲۔ ”جلوۂ سحر“ میں صبح کے وقت کی جو منظر کشی کی گئی ہے اسے اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

۳۔ نظم ”جلوۂ سحر“ میں مندرجہ ذیل تراکیب استعمال ہوئی ہیں، آپ انھیں اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔
ستارۂ سحر، زادگانِ شب، حسینۂ نمود، طلسمِ شب، درِ قبول، صحت آفریں، تاجِ زر، لباسِ نور، فرازِ کوہ، خندۂ نگاہ، عکس جلوہ گاہ، نوائے جوئبار، صدائے آبشار۔

۴۔ عَلَم کے سائے میں سلطانِ غازی کا بڑھے جانا
سرِ دشمن پہ افواجِ حجازی کا چڑھے جانا

اس شعر میں ”سلطانِ غازی“ اور ”افواجِ حجازی“ سے کیا مراد ہے؟

۵۔ مزارِ قطب الدین ایبک کا خلاصہ اپنے لفظوں میں بیان کیجیے۔

○☆○☆○☆○☆○☆○

اختر شیرانی

(۱۹۰۳ء - ۱۹۴۸ء)

گلبانگِ قفس

مدت سے نہ آئی کوئی خبر، یارانِ گلستاں کیسے ہیں ؟
اے بادِ صبا اتنا تو بتا، سرو و گُل و ریحاں کیسے ہیں ؟

پابندِ قفس تو کیسے کہیں اور کس سے کہیں، رُودادِ قفس
آزادِ قفس بتلائیں ہمیں، اربابِ گُلستاں کیسے ہیں ؟

ہر ایک قدم یاں مجلسِ غم، ہر تازہ ستم اک مصرِ الَم
اس حال میں پوچھیں کس سے یہ ہم، غم دیدۂ کنعاں کیسے ہیں؟

ہمدرد ہے اپنا کون یہاں، لا تُو ہی خبر اے بادِ خزاں !
اس سال وطن کے باغوں میں گلہائے بہاراں کیسے ہیں؟

غربت ہی نہ تھی کم ہوشربا، اس پر یہ اسیری رنج فزا
ہے کون جو پوچھے آ کے ذرا ہم خستۂ حرماں کیسے ہیں ؟

صیّاد نے ہے چُن چُن کے کیا، بے جرم و خطا محبُوسِ بلا
ہے کس کو غرض جو پوچھے ذرا، آباد یہ زنداں کیسے ہیں؟

اے موجِ نسیمِ صبحِ چمن، خوش باش، سنا پھر حالِ وطن !
کہسار و دمن کس حال میں ہیں، وادی و خیاباں کیسے ہیں ؟

کیا پوچھتی ہے اے شامِ قفس 'افسانہ رنگ و بوئے چمن
ہم قیدیوں کو کیا علم کہ اب گُل کیسے گلستاں کیسے ہیں ؟

گلبانگ قفس ہی بن جائے 'اے کاش نوائے آزادی
کیا کہیے کہ اختر سینے میں مچلے ہوئے ارماں کیسے ہیں ؟

(۲)

او دیس سے آنے والے بتا

او دیس سے آنے والے بتا

او دیس سے آنے والے بتا کس حال میں ہیں یارانِ وطن
آوارۂ غربت کو بھی سنا کس رنگ میں ہے کنعانِ وطن
وہ باغِ وطن ،فردوسِ وطن ' وہ سروِ وطن ریحانِ وطن
او دیس سے آنے والے بتا

کیا اب بھی وہاں کے باغوں میں مستانہ ہوائیں آتی ہیں
کیا اب بھی وہاں کے پربت پر گھنگھور گھٹائیں چھاتی ہیں
کیا اب بھی وہاں کی برکھائیں ویسے ہی دلوں کو بھاتی ہیں
او دیس سے آنے والے بتا

کیا اب بھی وطن میں ویسے ہی سرمست نظارے ہوتے ہیں
کیا اب بھی سہانی راتوں کو وہ چاند ستارے ہوتے ہیں
ہم کھیل جو کھیلا کرتے تھے کیا اب بھی وہ سارے ہوتے ہیں
او دیس سے آنے والے بتا

کیا شام کو اب بھی جاتے ہیں احباب، کنارِ دریا پر
وہ پیڑ گھنیرے اب بھی ہیں شاداب، کنارِ دریا پر
اور پیار سے آ کر جھانکتا ہے مہتاب، کنارِ دریا پر
او دیس سے آنے والے بتا

کیا اب بھی کسی کے سینے میں باقی ہے ہماری چاہ بتا
کیا یاد ہمیں بھی کرتا ہے اب یاروں میں کوئی آہ بتا
او دیس سے آنے والے بتا، للہ بتا، للہ بتا
او دیس سے آنے والے بتا

سوالات

۱۔ اختر شیرانی کی نظم "گلبانگِ قفس" میں یارانِ گلستاں اور اربابِ گلستاں سے کون لوگ مراد ہیں؟

۲۔ "گلبانگِ قفس" کے تیسرے شعر میں "مصرِ الم" اور "دیدۂ کنعاں" دو تلمیحات استعمال ہوئی ہیں۔ ان کی تشریح کیجیے۔

۳۔ "گلبانگِ قفس" میں سے درج ذیل تراکیب کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔
بادِ صبا، رُودادِ قفس، مجلسِ غم، بادِ خزاں، رنج فزا، خستۂ حرماں، محبوسِ بلا، موجِ نسیم، حالِ وطن، نوائے آزادی

۴۔ "گلبانگِ قفس" کے پانچویں، چھٹے اور ساتویں شعر کی تشریح کیجیے۔

۵۔ اختر شیرانی کی نظم "او دیس سے آنے والے بتا" کے پہلے بند میں یارانِ وطن، کنعانِ وطن، ریحانِ وطن استعارے استعمال ہوئے ہیں۔ ان استعاروں میں ارکانِ استعارہ واضح کیجیے۔

۶۔ نظم "او دیس سے آنے والے بتا" کا مرکزی خیال لکھیے۔

○☆○☆○☆○☆○☆○

سید محمد جعفری

(۱۹۱۱ء - ۱۹۷۶ء)

(ا)

تھرڈ ڈویژن

جینے کی کشمکش میں نہ بیکار ڈالیے — میں تھرڈ[1] ڈویژنر ہوں مجھے مار ڈالیے
پھر نام اپنا قوم کا معمار ڈالیے — ڈگری کو میری لیجیے آچار ڈالیے

کچھ قوم کا بھلا ہو تو کچھ آپ کا بھلا
میرا بھلا ہو کچھ مرے ماں باپ کا بھلا

جاتا ہے جس جگہ بھی کوئی تھرڈ ڈویژنر — کہتے ہیں سب کہ آ گیا تو کس لیے ادھر
تُو چل یہاں سے تیری نہ ہوگی یہاں گزر — "لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرّر ہوں' میں" مگر

"یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے"
ہر شخص مجھ کو آنکھ دکھاتا ہے کس لیے

میں پاس ہو گیا ہوں مگر پھر بھی فیل ہوں — تعلیم کے اداروں کے ہاتھوں میں کھیل ہوں
جس کا نشانہ جائے خطا وہ غلیل ہوں — میں خاک میں رلا ہُوا مٹی کا تیل ہوں

اور یونیورسٹی بھی نہیں ہے ریفائنری[2]
صورت بھی تصفیے کی نہیں کوئی ظاہری

اخبار میں نے دیکھا تو مجھ پر ہُوا عیاں — ہوتے ہیں پاس وہ بھی نہ دیں جو کہ امتحاں
یعنی کہ آنریری[3] بھی ملتی ہیں ڈگریاں — میں جس زمیں پہ پہنچا وہیں پایا آسماں

۱۔ صحیح لفظ تو "تھرڈ ڈویژنر" ہی ہے لیکن یہاں ضرورت شعری کی بنا پر "تھرڈویژنر" یعنی صرف ایک "ڈ" پڑھی جا رہی ہے۔
۲۔ Refinery (صاف کرنے کا کارخانہ)
۳۔ HONORARY (اعزازی)

ہے آسماں کی گردشِ تقدیر میرے ساتھ
ڈگری ہے اک گناہوں کی تحریر میرے ساتھ

گر ہو سکے تو مانگ لوں اک عمر کو ادھار　　اور امتحان جس کا نہیں کوئی اعتبار
اس امتحاں کی بازی لگاؤں گا بار بار　　کہتے ہیں لوگ اس کو کہ مچھلی کا ہے شکار

یہ امتحان مچھلی پھنسانے کا جال ہے
"عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے"

(۲)

کھڑا ڈنر

کھڑا ڈنر ہے غریب الدیار کھاتے ہیں　　بنے ہوئے شتر بے مہار کھاتے ہیں
اور اپنی میز پر ہو کر سوار کھاتے ہیں　　کچھ ایسی شان سے جیسے ادھار کھاتے ہیں

شکم غریب کی یوں فرسٹ ایڈ ہوتی ہے
ڈنر کے سائے میں فوجی پریڈ ہوتی ہے

کھڑے ہیں میز کنارے جو اک پلیٹ لیے　　انھی نے کوفتے اپنے لیے لپیٹ لیے
ادھر ادھر کے جو کھانے تھے سب سمیٹ لیے　　کھڑا تھا پیچھے سو میں رہ گیا پلیٹ لیے

یہ میز ہو گئی خالی اب اور کیا ہو گا
"پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہو گا"

تھی ایک مرغ کی ٹانگ اور رقیب لے بھاگا　　مرا نصیب بھی جاگا پہ دیر میں جاگا
کباب اٹھایا تو اس میں لپٹ گیا دھاگا　　ڈنر کیا کہ نہ پیچھا ہے جس کا نہ آگا

یہ کیا خبر تھی میں آیا تھا جب ڈنر کھانے
" حقیقتوں کو سنبھالے ہوئے ہیں افسانے "

یہ ایک میز خواتین گرد صف آرا • لبوں سے ان کے رواں گفتگو کا فوارہ
میں ایک گوشے میں سہما کھڑا ہوں بے چارا کہ یہ ہٹیں تو اٹھاؤں میں نان کا پارہ

اسیرِ حلقۂ خوباں جو مرغ و ماہی ہیں
تو ہم شہیدِ ستم ہائے کم نگاہی ہیں

سوالات

۱۔ نظم "تھرڈ ڈویژن" میں پاس ہونے والوں کا خاکہ کیوں اڑایا گیا ہے ؟

۲۔ اس نظم کے تیسرے بند کے پہلے مصرعے میں شاعر نے کہا ہے :
"میں پاس ہو گیا ہوں مگر پھر بھی فیل ہوں"
تھرڈ ڈویژن میں پاس ہونے والے کو فیل کیوں تصوّر کیا گیا ہے ؟

۳۔ نظم تھرڈ ڈویژن کا خلاصہ اپنے لفظوں میں لکھیے۔

۴۔ سید محمد جعفری نے "کھڑا ڈنر" میں ہمارے کس معاشرتی رویّے کا مضحکہ اڑایا ہے ؟

۵۔ اس نظم میں مندرجہ ذیل تراکیب استعمال ہوئی ہی انھیں اپنے جملوں میں استعمال کیجیے :
غریب الدّیار ، شترِ بے مہار ، اُسیرِ حلقۂ خوباں ، مرغ و ماہی ، گفتگو کا فوارہ ، نان کا پارہ ، شہیدِ ستم ہائے کم نگاہی۔

۶۔ نظم "کھڑا ڈنر" کا خلاصہ اپنے لفظوں میں تحریر کیجیے۔

○☆○☆○☆○☆○☆○

احسان دانش

(۱۹۱۴ء - ۱۹۸۲ء)

(۱)

دیہات کی شام

سرخ مے برسا رہا تھا شام کا رنگیں شباب
جھک رہا تھا دُور کھیتوں کے کنارے آفتاب

سرنگوں تھیں ٹہنیاں شرما رہے تھے سبزہ زار
آ رہی تھیں نیند کی پریاں ہواؤں پر سوار

دامنِ شب میں چھپی جاتی تھی فطرت کی امنگ
چھڑ رہی تھی آبشاروں میں سہانی جل ترنگ

آ چکی تھیں گاگریں بھر کر حسیں پنہاریاں
اٹھ رہا تھا گاؤں کے کچے مکانوں سے دھواں

بند کیں ذرّوں نے آنکھیں اور لہریں رُک گئیں
رفتہ رفتہ شام کی دیوی کی آنکھیں جُھک گئیں

راستوں میں ظلمتوں کے سانپ بل کھانے لگے
مست چرواہے چراگاہوں سے گھر آنے لگے

آسماں کے سرخ جلووں پر سیاہی آ گئی
جھٹپٹا سا ہو کے عالم پر اداسی چھا گئی

اوڑھ کر اک تیرگوں چادر بیاباں سو گیا
سبز کھیتوں پر خنک سایہ مسلط ہو گیا

خامشی پر رنگ آیا، شورشِ عالم گئی
آسماں پر انجمِ تاباں کی محفل جم گئی

شام کے اندھیر میں دن کا اجالا کھو گیا
آگ کے چوگرد دہقانوں کا جمگھٹ ہو گیا

ہالیوں کو مل گیا دن بھر کی محنت سے فراغ
ٹمٹمایا گاؤں کی چوپال میں دھندلا چراغ

مشورے ہونے لگے نشو و نما کے باب میں
سادہ خاطر بہ چلے تقریر کے سیلاب میں

یہ ہیں وہ جن پر تغافل کارگر ہوتا نہیں
جن کے دل میں کبر و نخوت کا گزر ہوتا نہیں

جن کی گردِ رہ گزر ہے غازۂ روئے بہار
جن کا شانہ روز سلجھاتا ہے زلفِ روزگار

جن کی فطرت سے ہوس ناکی ہے فرسنگوں پرے
شہرتوں سے جن کے کھوٹے بھی نکلتے ہیں کھرے

بازوؤں پر جن کے نازاں فطرتِ گلشن طراز
کاوشوں سے جن کی حسنِ انجمن مائل بہ ناز

واہ رے دیہات کے سادہ تمدّن کی بہار
سادگی میں بھی ہے کیا کیا تیرا دامن زرنگار

دل یہ کہتا ہے فراقِ انجمن سہنے لگوں
شہر کی رنگینیاں چھوڑوں یہیں رہنے لگوں

(۲)

عقیدہ

کم نظر آنے لگے جس سے مری چادر کا طُول
میرے ارمانوں نے اتنے پاؤں پھیلائے نہیں
میری نظروں میں امیدیں ہیں فقط پرچھائیاں
تیرا یہ ایماں کہ یہ اجسام ہیں سائے نہیں
میں سمجھتا ہوں کہ ہر ساعت ہے اک نیرنگِ نَو
حال میں ماضی کے منظر گھوم کر آئے نہیں
ہے نوشتے کا یقین ناسازیِ ذوقِ عَمَل
حوصلے میرے تُوکّل تک مجھے لائے نہیں
ہر نفس حکمِ خدا ہے ہر قدم جُہدِ حیات
اس سے آگے اور عُقدے میں نے سلجھائے نہیں

ایک جاگیردار سے

مجھ کو پروا نہیں گو صاحب جاگیر ہے تُو
میرے اللہ کے قبضے میں ہے ہاں، میری معاش
ہے مری روح کے مَعْبَد میں چراغانِ بہشت
ترے باطن پہ گراں ہے ترے ایمان کی لاش

مجھ کو احساس رملا ہے تجھے افیونِ طرب
میرا دل شعلۂ ذی روح ترا برف کی قاش
تیری فہرستِ دعا میں ہیں زر و جام و صنم
رازِ جام و صنم و زر مری تحقیق میں فاش
میرے آگے کوئی سلطانِ زمن ہو کہ فقیر
مجھ کو رہتی ہے فقط جوہرِ ذاتی کی تلاش

سوالات

۱۔ "دیہات کی شام" میں مندرجہ ذیل تراکیب آئی ہیں، انھیں اپنے جملوں میں استعمال کیجیے:

شورشِ عالم، انجمِ تاباں، سادہ خاطر، حسنِ انجمن، فراقِ انجمن۔

۲۔ اس نظم میں شاعر نے دہقانوں کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے، انھیں اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

۳۔ درجِ ذیل اشعار کی تشریح کیجیے:

یہ ہیں وہ جن پر تغافُل کارگر ہوتا نہیں
جن کے دل میں کبر و نخوت کا گزر ہوتا نہیں
جن کی گردِ رہ گزر ہے غازۂ روئے بہار
جن کا شانہ روز سلجھاتا ہے زلفِ روزگار
جن کی فطرت سے ہوس ناکی ہے فرسنگوں پرے
شہرتوں سے جن کے کھوٹے بھی نکلتے ہیں کھرے

۴۔ شاعر کا دل کیوں چاہتا ہے کہ وہ شہر کی رنگینیاں چھوڑ کر دیہات میں رہنے لگے؟

۵۔ نظم "دیہات کی شام" کا خلاصہ تحریر کیجیے۔

۶۔ نظم "عقیدہ" کے آخری تین اشعار کی تشریح کیجیے۔

۷۔ نظم "عقیدہ" کا مرکزی خیال لکھیے۔

۸۔ احسان دانش نے نظم "ایک جاگیردار سے" میں ایک محنت کش کے جن خیالات کی عکاسی کی ہے انھیں اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

○☆○☆○☆○☆○☆○

مجید امجد
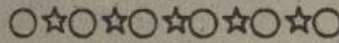
(۱۹۱۴ء - ۱۹۷۴ء)

ہری بھری فصلو

ہری بھری فصلو

جُگ جُگ جیو، پھلو

ہم تو ہیں بس دو گھڑیوں کو اس جگ میں مہمان
تم سے ہے اس دیس کی شوبھا، اس دھرتی کا مان
دیس بھی ایسا دیس کہ جس کے سینے کے اُرمان
آنے والی مست رُتوں کے ہونٹوں پر مسکان
جھکتے ڈنٹھل، پکتے بالے، دھوپ رچے کھلیان
ایک ایک گھروندا خوشیوں سے بھرپور جہان

شہر شہر اور بستی بستی جیون سنگ بسو !
دامن دامن، پلو پلو، جھولی جھولی ہنسو

چندن روپ سجو !
ہری بھری فصلو !
جگ جگ جیو، پھلو !

قرنوں کے بجھتے انگار، اک موجِ ہوا کا دم
صدیوں کے ماتھے کا پسینا، پتیوں پر شبنم
زور زماں کے لاکھوں موڑ، اک شاخِ جبیں کا خم
زندگیوں کے تپتے جزیرے پر رکھ رکھ کے قدم

ہم تک پہنچی عظمتِ فطرت ، طنطنۂ آدم
جھومتے کھیتو ، ہستی کی تقدیرو ، رقص کرو
دامن دامن ، پلّو پلّو ، جھولی جھولی ہنسو !

چندن روپ سجو !
ہری بھری فصلو
جُگ جُگ جیو ، پھلو

سوالات

۱۔ "ہری بھری فصلو" کا مرکزی خیال لکھیے۔

۲۔ اس نظم کے دوسرے بند کے پہلے تین اشعار کی تشریح کیجیے۔

۳۔ اس نظم میں مستعمل مندرجہ ذیل تراکیب کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

دیس کی شوبھا ، دھرتی کا مان ، مست رُت ، دھوپ رچے کھلیان ، جیون سنگ ، چندن رُوپ ، دَورِ زماں ، موجِ ہوا ، عظمتِ فطرت ۔

○☆○☆○☆○☆○☆○

سید ضمیر جعفری

(ولادت: یکم جنوری ۱۹۱۸ء)
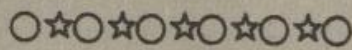
پرانی موٹر

یہ چلتی ہے تو دو طرفہ ندامت ' ساتھ چلتی ہے
بھرے بازار کی پوری ملامت ' ساتھ چلتی ہے

بہن کی التجا ' ماں کی محبت ' ساتھ چلتی ہے
وفائے دوستاں بہرِ مشقت ' ساتھ چلتی ہے

بہت کم اس " خرابے "[1] کو خراب انجن چلاتا ہے
عموماً زورِ دستِ دوستاں ہی کام آتا ہے

کبھی بیلوں کے پیچھے جوت کر چلوائی جاتی ہے
کبھی خالی خدا کے نام پر کھچوائی جاتی ہے

پکڑ کے بھیجی جاتی ہے ' جکڑ کے لائی جاتی ہے
وہ کہتے ہیں کہ اس میں پھر بھی موٹر پائی جاتی ہے

اذیت کو بھی اک نعمت سمجھ کر شادماں ہونا
تعالی اللہ یوں انساں کا مغلوبِ گماں ہونا

بہ طرزِ عاشقانہ دوڑ کر ' بے ہوش ہو جانا
بہ رنگِ دلبرانہ جھانک کر ' رُوپوش ہو جانا

---

[1] اس سے مراد پرانی موٹر ہے۔

بزرگوں کی طرح کچھ کھانس کر، خاموش ہو جانا
مسلمانوں کی صورت دفعتاً" پُر جوش ہو جانا

قدم رکھنے سے پہلے لغزشِ مستانہ رکھتی ہے
کہ ہر فرلانگ پر اپنا مسافر خانہ رکھتی ہے

دمِ رفتار دنیا کا عجب نقشا دکھائی دے
سڑک بیٹھی ہوئی اور آدمی اُڑتا دکھائی دے

نظامِ زندگی یکسر تہ و بالا دکھائی دے
یہ عالَم ہو تو اس عالَم میں آخر کیا دکھائی دے

روانی اس کی اک طوفانِ وجد و حال ہے گویا !
کہ جو پرزہ ہے اک بپھرا ہوا قوال ہے گویا

شکستہ ساز میں بھی، محشرِ نغمات رکھتی ہے
توانائی نہیں رکھتی مگر جذبات رکھتی ہے

پرانے ماڈلوں میں کوئی اونچی ذات رکھتی ہے
ابھی پچھلی صدی کے بعض پرزہ جات رکھتی ہے

غمِ دوراں سے اب تو یہ بھی نوبت آ گئی، اکثر
کسی مرغی سے ٹکرائی تو خود چکرا گئی، اکثر

ہزاروں حادثے دیکھے ، زمانی بھی ، مکانی بھی
بہت سے روگ پالے ہیں زراہِ قدردانی بھی

تجل اس سخت جانی پر ہے مرگِ ناگہانی بھی
خداوندا نہ کوئی چیز ہو اتنی پرانی بھی

کبھی وقتِ خرام آیا تو ٹائر کا سلام آیا
"تھم اے رہرو کہ شاید پھر کوئی مشکل مقام آیا"

مشقی سوالات

"پرانی موٹر" کے پہلے اور آخری بند کی تشریح کیجیے۔

مندرجہ ذیل تراکیب کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے :

وفائے دوستاں ، بہرِ مشقت ، زورِ دستِ دوستاں ، مغلوبِ گماں ، لغزشِ مستانہ ، دمِ رفتار ، طوفانِ وجد و حال ، غمِ دوراں ، زراہِ قدردانی ، مرگِ ناگہانی۔

بزرگوں کی طرح کچھ کھانس کر خاموش ہو جانا
مسلمانوں کی صورت دفعتاً پُرجوش ہو جانا

اس شعر میں شاعر نے پرانی موٹر کو بزرگوں کی طرح کھانس کر خاموش ہو جانے اور مسلمانوں کی صورت دفعتاً پُرجوش ہو جانے کی مانند قرار دیا ہے۔ ان تشبیہات میں ارکانِ تشبیہ کی نشاندہی کیجیے۔

○☆○☆○☆○☆○☆○

خوشحال خاں خٹک

(۱۶۱۷ء-۱۶۸۹ء)

میں نے پوچھا

آج میں نے استاد سے چند سوال پوچھے
ہر سوال کے جواب سے سرفراز کیا
میں نے پوچھا کہ جوان جوانی میں کیا کام کرے ؟
جواب دیا کہ ہر وقت علم حاصل کرنے کا شغل
میں نے پوچھا کہ بوڑھا بڑھاپے میں کیا کام کرے ؟
اس نے کہا کہ عمل سے اپنے اعمال درست کرے
میں نے پوچھا کہ کون ہمیشہ حرمت میں رہے گا ؟
اس نے کہا کہ جو کسی سے کوئی سوال نہ کرے
میں نے پوچھا کہ دنیا کے یہ اچھے کام کیا چیز ہیں ؟
جواب دیا کہ یہ سب افسانے اور خواب و خیال ہیں
میں نے پوچھا کہ کونسی بحث و جدل ہے جو ہمیشہ اچھی ہے ؟
اس نے کہا کہ علم کی بحث و جدل ہمیشہ اچھی ہوتی ہے
میں نے پوچھا کہ کونسا سچ بول کر انسان ذلیل ہو جاتا ہے ؟
جواب دیا کہ جو ہمیشہ اپنا ہنر بیان کرتا رہے
میں نے پوچھا کہ کس شخص سے ڈرنا اور بچنا چاہیے ؟
جواب دیا کہ جس کے سامنے حلال اور حرام ایک برابر ہوں
میں نے پوچھا کہ آسمان تک کیسے اڑ سکوں گا ؟
جواب دیا کہ یہ کام ہمت کے پر و بال سے ہو سکتا ہے

میں نے پوچھا کہ خوشحال خٹک کی باتیں کیسی ہیں ؟
جواب دیا کہ سب کے سب دُر، گوہر، عقیق اور لعل ہیں

(ترجمہ: پروفیسر پریشان خٹک)

سوالات

۱۔ شاعر کے استاد کے فرمان کے مطابق نوجوانوں کو جوانی میں کیا کام کرنا چاہیے؟

۲۔ استاد نے کون سی بحث کو اچھی بحث قرار دیا ہے ؟

۳۔ شاعر نے استاد سے جو سوال پوچھے ان میں سے تین سوال اور ان کے جواب اپنے لفظوں میں تحریر کیجیے۔

۴۔ اس نظم کا خلاصہ اپنے لفظوں میں بیان کیجیے۔

○☆○☆○☆○☆○☆○

شاہ عبداللطیف بھٹائی

(۱۶۸۹ء - ۱۷۵۲ء)

چارہ گری

جب درد نہ دل میں سر اٹھائے — کیا کرنے کو چارہ ساز آئے

دل تو غمِ عشق سے تہی ہے — پھر بھی تجھے آرزو لگی ہے

آ کر کوئی سحر آزمائے — درماں گرے درد آشنائے

لینا اسے جان پر مری جاں — جو کچھ بھی ہو چارہ گر کا فرماں

ہمت کبھی ہاتھ سے نہ جائے — شکوہ نہ یہ تیرے لب پہ آئے

ان لوگوں نے جانے کیا کیا ہے — یاروں کو بہم جدا کیا ہے

کہنا کہ بھلا کیا انھوں نے — یاروں کو رلا دیا انھوں نے

میرے کہے ، صبر آزما کے — فرصت ہو تو سوچ سر جھکا کے

یہ غیظ و غضب بُری بلا ہے — ہاں صبر و رضا میں اک مزا ہے

جن لوگوں کا کیش ہے صبوری — ہوتی ہے انھیں کی بات پوری

نخوت کو ہمیشہ خوار دیکھا — سرکش کو بحالِ زار دیکھا

جو لوگ ہیں عاجز و رمیدہ ہیں بارِ شکیب ناچشیدہ

اپنے پہ نہ پا سکا جو قابو اس کا یہ مآل جان لے تو

ہوتا ہے وہ ایک دن پشیماں پاتا ہے سزائے ناسزایاں

رکھے، وہ دماغ کتنا عالی
جھولی رہے کینہ وَر کی خالی

(ترجمہ: ابنِ انشا)

سوالات

۱۔ اس نظم کے دوسرے بند کے دوسرے اور تیسرے شعر میں شاہ عبداللطیف بھٹائی نے کیا کیا نصیحت کی ہے؟

۲۔ دوسرے بند کے آخری شعر کے حوالے سے واضح کیجیے کہ سرکشی کا انجام کیا ہوتا ہے؟

۳۔ اس نظم کے آخری بند کے مفہوم کے حوالے سے واضح کیجیے کہ اپنے اوپر قابو نہ پا سکنے کا کیا نتیجہ ہوتا ہے؟

۴۔ دوسرے بند کے آخری تین شعروں کی تشریح کیجیے۔

○☆○☆○☆○☆○☆○

خواجہ میر درد

(۱۷۱۹ء – ۱۷۸۵ء)

(۱)

مدرسہ یا دَیر تھا یا کعبہ یا بت خانہ تھا
ہم سبھی مہماں تھے واں تو ہی صاحب خانہ تھا

وائے نادانی کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

حَیف، کہتے ہیں، ہُوا گلزار تاراجِ خزاں
آشنا اپنا بھی واں اک سبزۂ بیگانہ تھا

ہو گیا مہماں سرائے کثرتِ مَوہُوم آہ
وہ دلِ خالی کہ تیرا خاص خَلوَت خانہ تھا

بھول جا، خوش رَہ، عَبَث وَے اسابقے مت یاد کر
درد یہ مذکور کیا ہے، آشنا تھا یا نہ تھا!

(۲)

ہم تجھ سے کس ہوس کی فلک جستجو کریں
دل ہی نہیں رہا جو کچھ آرزو کریں

مٹ جائیں ایک آن میں کثرت نمائیاں
ہم آئینہ کے سامنے جب آکے ہُو کریں

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جا ابھی
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

لہ وے: وہ کا جمع۔ اس قدر اتنا۔ پوشیدہ بات کی طرف اشارہ۔ لوگوں کو متوجہ کرنے کے لیے

سر تا قدم زبان ہیں جُوں شمع گو، کہ ہم
پَر یہ کہاں مجال جو کچھ گفتگو کریں
ہر چند آئینہ ہوں پَر اِتنا ہوں ناقبول
منہ پھیر لے وہ جس کے مجھے رُوبرو کریں
نَے گُل کو ہے ثبات نہ ہم کو ہے اِعتبار
کس بات پر چمن، ہوسِ رنگ و بُو کریں

ہے اپنی یہ صلاح، کہ سب زاہدانِ شہر
اے درد آ کے بیعتِ دستِ سبُو کریں

(۳)

تہمتِ چند اپنے ذمے دھر چلے
جس لیے آئے تھے سو ہم کر چلے
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے
کیا ہمیں کام ان گُلوں سے اے صبا
ایک دم آئے اِدھر، اُودھر چلے
دوستو دیکھا تماشا یاں کا بس
تم رہو اب ہم تو اپنے گھر چلے
آہ، بس جی مت جلا، تب جانیے
جب کوئی افسوں ترا اُس پر چلے

ایک میں دل ریش ہوں ویسا ہی دوست
زخم کتنوں کے سنا ہے بھر چلے

شمع کے مانند ہم اس بزم میں
چشم تر آئے تھے دامن تر چلے

ڈھونڈتے ہیں آپ سے اس کو پرے
شیخ صاحب چھوڑ گھر، باہر چلے

ہم جہاں میں آئے تھے تنہا، وُلے
ساتھ اپنے اب اسے لے کر چلے

جوں 'شرر' اے ہستیِ بے بُود، یاں
بارے ہم بھی اپنی باری بھر چلے

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

دردؔ کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب
کس طرف سے آئے تھے، کِدھر چلے!

سوالات

ا۔ غزل اہم ترین صنفِ شاعری ہے۔ یہ وہ صنف ہے جس میں شاعر اپنے فکر و خیال کا اظہار علائم اور رموز کے ذریعے نہایت لطیف پیرائے میں کرتا ہے۔ غزل کے اشعار کم سے کم پانچ اور کثرت میں لا انتہا ہو سکتے ہیں مگر اشعار کی تعداد کا طاق ہونا شرط ہے۔ غزل کا ہر شعر جداگانہ مضمون کا حامل ہوتا ہے۔

حسن و عشق اور اخلاق و تصوف کے علاوہ زندگی کے مسائل و حقائق بھی غزل کے موضوعات میں شامل ہیں۔ بتائیے خواجہ میر درد کی پہلی غزل کے پہلے اور دوسرے شعر میں کس حقیقت کی طرف اشارہ ہے ؟

۲۔ غزل کے پہلے شعر کو، جس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں (ردیف کا ہونا ضروری نہیں) مَطلَع کہتے ہیں اور آخری شعر کو جس میں شاعر بالعموم اپنا تخلص بھی لاتا ہے۔ مُقطَع کہتے ہیں۔ خواجہ میر درد کی شامل نصاب ہر غزل کے مطلع اور مُقطع کی نشاندہی کیجیے۔

۳۔ دوسری غزل کے پہلے تین اشعار کی تشریح کیجیے۔

۴۔ تیسری غزل کے دوسرے شعر میں 'زندگی' کو طوفان سے ' ساتویں شعر میں ہم ' انسان' کو شمع سے اور دسویں شعر میں 'ہستیِ بے بود' کو شرر سے تشبیہ دی گئی ہے۔ ان تشبیہات میں ارکانِ تشبیہ کی نشاندہی کیجیے۔

۵۔ تیسری غزل کے مُقطَع کا مفہوم اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

۶۔ مندرجہ ذیل تراکیب کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے :

وقتِ مرگ ' تاراجِ خزاں ' سبزۂ بیگانہ ' کثرتِ مَوہُوم ' ہَوَسِ رنگ و بُو ' زاہدانِ شہر ' ہستیٔ بے بُود۔

○☆○☆○☆○☆○☆○

میر تقی میر

(۱۷۲۳ء۔ ۱۸۱۰ء)

(۱)

اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا — لوہو[1] آتا ہے جب نہیں آتا

ہوش جاتا نہیں رہا لیکن — جب وہ آتا ہے تب نہیں آتا

صبر تھا ایک مونسِ ہجراں — سو وہ مدت سے اب نہیں آتا

دل سے رخصت ہوئی کوئی خواہش — گریہ کچھ بے سبب نہیں آتا

حوصلہ شرطِ عشق ہے ورنہ — بات کا کس کو ڈھب نہیں آتا

جی میں کیا کیا ہے اپنے اے ہمدم! — پر سخن تا بلب نہیں آتا

دُور بیٹھا غبارِ میرؔ اس سے
عشق بن یہ اَدب نہیں آتا

(۲)

تا بہ مقدور انتظار کیا — دل نے اب زور بے قرار کیا

دشمنی ہم سے کی زمانے نے — کہ جفاکار تجھ سا یار کیا

یہ توہّم کا کارخانہ ہے — یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

ایک ناوک نے اس کی مژگاں کے — طائرِ سدرہ تک شکار کیا

صد رگِ جاں کو تاب دے باہم — تیری زلفوں کا ایک تار کیا

ہم فقیروں سے بے ادائی کیا — آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا

سخت کافر تھا جس نے پہلے میرؔ
مذہبِ عشق اختیار کیا

---

[1] رعایت شعری کے تحت لفظ "لہو" کی جگہ "لوہو" استعمال کیا گیا ہے۔

(۳)

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

قافلے میں صبح کے اک شور ہے
یعنی غافل ہم چلے، سوتا ہے کیا

سبز ہوتی ہی نہیں یہ سرزمیں
تخمِ خواہش دل میں تو بوتا ہے کیا

یہ نشانِ عشق ہیں، جاتے نہیں
داغ چھاتی کے عَبَث دھوتا ہے کیا

غیرتِ یوسفؑ ہے یہ وقتِ عزیز
میرؔ اس کو رایگاں کھوتا ہے کیا

(۴)

گُل کو ہوتا صبا قرار اے کاش!
رہتی ایک آدھ دن بہار اے کاش!

یہ جو دو آنکھ مُند گئیں میری
اُس پہ وا ہوتیں ایک بار اے کاش!

کس نے اپنی مصیبتیں نہ گنیں
رکھتے میرے بھی غم شمار اے کاش!

جان آخر تو جانے والی تھی
اُس پہ کی ہوتی میں نثار اے کاش!

اس میں راہِ سخن نکلتی تھی
شعر ہوتا ترا شعار اے کاش!

شش جہت اب تو تنگ ہے ہم پر
اس سے ہوتے نہ ہم دو چار اے کاش!

بے اَجل میرؔ اب پڑا مرنا
عشق کرتے نہ اختیار اے کاش!

سوالات

۱۔ خدائے سخن میر تقی میر کی پہلی غزل کے پہلے چار اشعار کی تشریح کیجیے۔

۲۔ میر کی دوسری غزل کے تیسرے، چوتھے اور پانچویں شعر میں مستعمل استعاروں کی نشاندہی کر کے ان کا تجزیہ کیجیے۔

۳۔ میر کی تیسری غزل کے مقطع میں تلمیح کی نشاندہی کرتے ہوئے مقطع کا مفہوم واضح کیجیے۔

۴۔ تیسری غزل کے پہلے چار اشعار کی تشریح کیجیے۔

۵۔ شش جہت اب تو تنگ ہے ہم پر
اس سے ہوتے نہ ہم دو چار اے کاش!

شش جہت کے تنگ ہونے سے کیا مراد ہے؟

۶۔ شاملِ نصاب میر کی چوتھی غزل لیجیے اور وضاحت کیجیے کہ میر نے ان اشعار میں کس کس بات کی تمنا کا اظہار کیا ہے؟

۷۔ مندرجہ ذیل تراکیب کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے:
مونسِ ہجراں، تابہ مقدور، مذہبِ عشق، تخمِ خواہش، نشانِ عشق، غیرتِ یوسفؑ، وقتِ عزیز۔

○☆○☆○☆○☆○☆○

خواجہ حیدر علی آتش
(۱۷۶۴ء-۱۸۴۶ء)
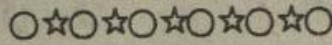
(۱)

سُن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا

زیرِ زمیں سے آتا ہے جو گُل سو زر بکف
قاروں نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا

اُڑتا ہے شوقِ راحتِ منزل سے اسپِ عمر
مہمیز کہتے ہیں گے کسے، تازیانہ کیا

چاروں طرف سے صورتِ جاناں ہو جلوہ گر
دل صاف ہو ترا تو ہے آئینہ خانہ کیا

طبل و عَلَم نہ پاس ہے اپنے نہ مُلک و مال
ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا

بے تاب ہے کمال ہمارا دلِ حزیں
مہماں سرائے جسم کا ہو گا روانہ کیا

یوں مدعی حَسَد سے نہ دے داد تو نہ دے
آتشؔ غزل یہ تُو نے کہی عاشقانہ کیا

(۲)

ظہورِ آدمِ خاکی سے یہ ہم کو یقیں آیا
تماشا انجمن کا دیکھنے خلوت نشیں آیا

نہ گھبرا چار دن کے واسطے اے روح، قالب میں
گیا جب اس مکاں سے پھر نہیں اس کا مکیں آیا

یہ جنسِ دل مکرّر اک نظر اس کو دکھا دیں گے
جو کوئی مشتری[1] بازارِ عالم میں حسیں آیا

نہ چھوڑے گا کسی کو آسماں بے گور میں بھیجے
سمجھ زیرِ زمیں اس کو جو بالائے زمیں آیا

نہ دیکھیں گی کبھی جس کو پھر آنکھیں، وہ تماشا ہے
غنیمت جان جو پیشِ نگاہِ واپسیں آیا

(۳)

آئے بہار جائے خزاں، ہو چمن درست
بیمار سال بھر کے نظر آئیں تندرست

حالِ شکستہ کا جو کبھی کچھ بیاں کیا
نکلا نہ ایک اپنی زباں سے سخن درست

آرائشِ جمال کو مشّاطہ چاہیے
بے باغباں کے رہ نہیں سکتا چمن درست

عُشّاق و بوالہوس کو وہ پہچان جائیں گے
چھپتی نہیں ہے صورتِ بیمار و تندرست

---

[1] گاہک، خریدار

کم شاعری بھی نسخۂ اکسیر سے نہیں
مستغنی ہو گیا جسے آیا یہ فن درست

غربت زدوں کے حال کا افسانہ چھیڑتے
ہوتی اگر طبیعتِ اہلِ وطن درست

آتش وہی بہار کا عالم ہے باغ میں
تاحال ہے دماغِ ہوائے چمن درست

سوالات

۱۔ خواجہ حیدر علی آتش کی پہلی غزل کے دوسرے شعر میں ایک تلمیح آئی ہے۔ اس کی وضاحت کیجیے۔

۲۔ پہلی غزل کے چوتھے شعر کے حوالے سے واضح کیجیے کہ دل کو آئینہ سے کیا مشابہت ہے ؟

۳۔ دوسری غزل کے پہلے چار اشعار کی تشریح کیجیے۔

۴۔ تیسری غزل کے چوتھے پانچویں اور چھٹے شعر کی تشریح کیجیے۔

۵۔ مندرجہ ذیل تراکیب کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے :
خلقِ خدا ، زیرِ زمیں ، زر بکف ، اسپِ عمر ، طبل و علم ، ملک و مال ، دلِ حزیں ، خلوت نشیں ، جنسِ دل ، بازارِ عالم ، حالِ شکستہ ، آرائشِ جمال ۔

۶۔ مندرجہ ذیل مرکبات کا مفہوم واضح کیجیے :
شوقِ راحتِ منزل ، ظہورِ آدمِ خاکی ، پیشِ نگاہِ واپسیں ، عشاق و بوالہوس ، صورتِ بیمار و تندرست ، طبیعتِ اہلِ وطن ، دماغِ ہوائے چمن ۔

۷۔ خواجہ حیدر علی آتش کی شاملِ نصاب تینوں غزلوں میں قافیہ اور ردیف کی نشاندہی کیجیے۔

○☆○☆○☆○☆○☆○

مرزا اسد اللہ خاں غالب

(۱۷۹۷ء-۱۸۶۹ء)

(۱)

وہ فراق اور وہ وصال کہاں ؟
وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں ؟

فرصتِ کاروبارِ شوق ' کسے !
ذوقِ نظارہ جمال کہاں؟

تھی وہ اک شخص کے تصوّر سے
اب وہ رعنائی خیال کہاں ؟

ایسا آساں نہیں لہو رونا
دل میں طاقت ' جگر میں حال کہاں ؟

فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں
میں کہاں اور یہ وبال کہاں ؟

مضحل ہو گئے قویٰ غالبؔ
وہ عناصر میں اعتدال کہاں ؟

(۲)

دل ہی تو ہے' نہ سنگ و خشت' درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں
دَیر نہیں ' حَرَم نہیں ' دَر نہیں ' آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہگزر پہ ہم ' غیر ہمیں اٹھائے کیوں

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

واں وہ غرورِ عزّ و ناز ' یاں یہ حجابِ پاسِ وضع
راہ میں ہم مِلیں کہاں ' بزم میں وہ بُلائے کیوں

ہاں وہ نہیں خدا پرست ' جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

غالبِؔ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا ' کیجیے ہائے ہائے کیوں

(۴)

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں میرے نزدیک
اِک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے

ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا، مرے ہوتے
گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا، مرے آگے

مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے
تُو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے ' کلیسا مرے آگے

ہم پیشہ و ہم مشرب و ہم راز ہے میرا
غالبؔ کو بُرا کیوں کہو، اچھا! مرے آگے

(۴)

مزے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں
سوائے خونِ جگر، سو جگر میں خاک نہیں

مگر غبار ہوئے پر، ہوا اڑا لے جائے
وگرنہ تاب و تواں بال و پَر میں خاک نہیں

یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے
کہ غیرِ جلوۂ گُل رہگزر میں خاک نہیں

ہُوا ہوں عشق کی غارتگری سے شرمندہ
سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسدؔ
کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

سوالات

۱۔ مرزا غالب کی، جو اُسد بھی تخلص کرتے تھے، چار غزلیں نصاب میں شامل ہیں۔ ہر غزل کا مَطلَع اور مقطع علٰحدہ علٰحدہ کیجیے۔

۲۔ پہلی غزل کے مُقطَع کا مفہوم واضح کیجیے۔

۳۔ دوسری غزل کے پہلے چار اشعار کی تشریح کیجیے۔

۴۔ تیسری غزل کے دوسرے شعر میں جو تلمیحات آئی ہیں ان کی نشاندہی کر کے

ان کی وضاحت کیجیے۔

5 تیسری غزل کے تیسرے، چوتھے اور پانچویں شعر کی تشریح کیجیے۔

۶۔ چوتھی غزل کے پہلے چار اشعار کی تشریح کیجیے۔

۷۔ مندرجہ ذیل تراکیب کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے:

رُعنائیِ خیال، فکرِ دنیا، سنگ و خشت، خدا پرست، دین و دل، بازیچۂ اطفال، شب و روز، اورنگِ سلیماں، اعجازِ مسیحا، خونِ جگر، بہشت شمائل، حسرت تعمیر، عرضِ ہنر۔

۸۔ مندرجہ ذیل مرکبات کی وضاحت کیجیے:

شب و روز و ماہ و سال، فرصتِ کاروبارِ عشق، ذوقِ نظارۂ جمال، قیدِ حیات و بندِ غم، غرورِ عز و ناز، حجابِ پاسِ وضع، ہم پیشہ و ہم مشرب و ہم راز۔

○☆○☆○☆○☆○☆○

مومن خاں مومن

(۱۸۰۰ء - ۱۸۵۲ء)
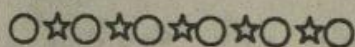
(۱)

اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا
رنج راحت فزا نہیں ہوتا

ذکرِ اغیار سے ہُوا معلوم
حرفِ ناصح . بُرا نہیں ہوتا

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دُوسرا نہیں ہوتا

حالِ دل یار کو لکھوں کیوں کر
ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا

چارۂ دل سوائے صبر نہیں
سو تمھارے سوا نہیں ہوتا

کیوں سنے عرض مضطرب مومنؔ
صنم آخر خدا نہیں ہوتا

(۲)

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم[۱]
پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم

ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے ہم
منہ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بے کسی سے ہم

ہم سے نہ بولو تم، اسے کیا کہتے ہیں بھلا
انصاف کیجیے پوچھتے ہیں، آپ ہی سے ہم

بیزار جان سے جو نہ ہوتے تو مانگتے
شاہد شکایتوں پہ تری مدعی سے ہم

بے روئے مثلِ ابر نہ نکلا غبارِ دل
کہتے تھے ان کو برق تبسم ہنسی سے ہم

کیا گُل کھلے گا دیکھیے ہے فصلِ گُل تو دُور
اور سوئے دشت بھاگتے ہیں کچھ ابھی سے ہم

لے نام آرزو کا تو دل کو نکال لیں
مومنؔ نہ ہوں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

۱۔ مولانا فضل حق خیر آبادی سے جو آرزو تخلص کرتے تھے مومن کو بڑی والہانہ عقیدت اور محبت تھی۔ ان سے ایک مرتبہ ناچاقی ہو گئی اور دوستی منقطع ہو گئی۔ بعد میں جب صلح ہو گئی تو مومن نے یہ مسلسل غزل لکھ کر پیش کی۔

(۳)

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ جو لطف مجھ پہ تھے پیش تر وہ کرم کہ تھا مرے حال پر
مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی بیٹھے سب میں جو رُوبرو تو اشارتوں ہی سے گفتگو
وہ بیان شوق کا برملا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

ہوئے اتّفاق سے گر بہم تو وفا جتانے کو دَم بدم
گلۂ ملامتِ اقربا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کوئی ایسی بات اگر ہوئی کہ تمھارے جی کو بری لگی
تو بیاں سے پہلے ہی بھولنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جسے آپ گنتے تھے آشنا جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومنِ مبتلا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

سوالات

۱۔ مومن کی پہلی غزل کے تیسرے، چوتھے اور چھٹے شعر کی تشریح کیجیے۔

۲۔ دوسری غزل کے چوتھے، پانچویں اور چھٹے شعر کی تشریح کیجیے۔

۳۔ دوسری غزل کے پانچویں شعر میں مستعمل تشبیہ کی نشاندہی کر کے اس کا تجزیہ کیجیے۔

۴۔ دوسری غزل میں درج ذیل محاورات آئے ہیں ان کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے:

جی سے ناچار ہو جانا، منہ دیکھ دیکھ رونا، جان سے بیزار ہونا، دلِ کا غبار نکلنا، گل کِھلنا، سوئے دشت بھاگنا۔

۵۔ تیسری غزل کے پہلے چار اشعار کی تشریح کیجیے۔

۶۔ مومن کی شاملِ نصاب تینوں غزلوں میں قافیہ اور ردیف کی نشاندہی کیجیے۔

۷۔ مندرجہ ذیل تراکیب کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے:

راحت فزا، ذکرِ اغیار، حرفِ ناصح، چارۂ دل، عرضِ مضطرب، غبارِ دل، برق تبسم، فصلِ گل، سوئے دشت، گلۂ ملامتِ اقربا، مومنِ مبتلا۔

○☆○☆○☆○☆○☆○

خواجہ الطاف حسین حالی

(۱۸۳۷ء - ۱۹۱۴ء)
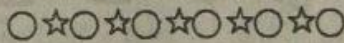
(۱)

گو جوانی میں تھی کج رائی بہت | پر جوانی ہم کو یاد آئی بہت
سرو یا گل، آنکھ میں جچتے نہیں | دل پہ ہے نقش اس کی رعنائی بہت
آ رہی ہے چاہِ یوسفؑ سے صدا | دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت
ہم نے ہر ادنیٰ کو اعلیٰ کر دیا | خاکساری اپنی کام آئی بہت
کر دیا چپ واقعاتِ دہر نے | تھی کبھی ہم میں بھی گویائی بہت
گھٹ گئیں خود تلخیاں ایّام کی | یا گئی کچھ بڑھ شکیبائی بہت

ہم نہ کہتے تھے کہ حالیؔ چپ رہو
راست گوئی میں ہے رسوائی بہت

(۲)

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں | اب ٹھہرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں
یا رب اس اختلاط کا انجام ہو بخیر | تھا اس کو ہم سے ربط مگر اس قدر کہاں
اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق | رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں
بس ہو چکا بیاں کسل و رنجِ راہ کا | خط کا مرے جواب ہے اے نامہ بر کہاں

کون و مکاں سے ہے دلِ وحشی کنارہ گیر — اس خانماں خراب نے ڈھونڈا ہے گھر کہاں

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور — عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تُو مگر کہاں

ہوتی نہیں قبول دعا ترکِ عشق کی — دل چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں

حالیؔ نشاطِ نغمہ و مے ڈھونڈتے ہو اب
آئے ہو وقتِ صبح، رہے رات بھر کہاں!

سوالات

۱۔ پہلی غزل کے تیسرے شعر میں "چاہِ یوسف" تلمیح آئی ہے۔ اس کی وضاحت اپنے لفظوں میں کیجیے۔

۲۔ پہلی غزل کے چوتھے، پانچویں اور چھٹے شعر کی تشریح کیجیے۔

۳۔ دوسری غزل کے تیسرے تا آٹھویں شعر کی تشریح کیجیے۔

۴۔ مندرجہ ذیل تراکیب کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے:

کج رائی، واقعاتِ دہر، راست گوئی، نیشِ عشق، کون و مکاں، دلِ وحشی، کنارہ گیر، خانماں خراب، وقتِ صبح۔

۵۔ مندرجہ ذیل مرکبات کا مفہوم واضح کیجیے:

دورِ جامِ اولِ شب، لذتِ زخمِ جگر، کسل و رنجِ راہ، نشاطِ نغمہ و مے۔

○☆○☆○☆○☆○☆○

علامہ محمد اقبالؒ
(۱۸۷۷ء-۱۹۳۸ء)

(۱)

پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن
مجھ کو پھر نغموں پہ اُکسانے لگا مرغِ چمن

پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اُودے اُودے ، نیلے نیلے ، پیلے پیلے پیرہن

برگِ گُل پر رکھ گئی شبنم کا موتی بادِ صبح
اور چمکاتی ہے اس موتی کو سورج کی کرن

حُسنِ بے پروا کو اپنی بے نقابی کے لیے
ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تُو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن ، اپنا تو بن

مَن کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں
تن کی دولت چھاؤں ہے! آتا ہے دَھن ، جاتا ہے دَھن!

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تُو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا ، نہ تن

(۲)

کبھی اے حقیقتِ منتظر ، نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

طرب آشنائے خروش ہو، تو نوائے محرمِ گوش ہو
وہ سرود کیا کہ چھپا ہوا ہو سکوتِ پردۂ ساز میں

تُو بچا بچا کے نہ رکھ اسے، ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

دمِ طوف، کرمکِ شمع نے یہ کہا کہ وہ اثرِ کہن
نہ تری حکایتِ سوز میں، نہ مری حدیثِ گداز میں

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جُرمِ خانہ خراب کو ترے عفوِ بندہ نواز میں

جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا، تجھے کیا ملے گا نماز میں

(۳)

عَقل گو آستاں سے دُور نہیں
اس کی تقدیر میں حضور نہیں

دلِ بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور، دل کا نور نہیں

علم میں بھی سرور ہے لیکن
یہ وہ جنت ہے، جس میں حوُر نہیں

کیا غضب ہے کہ اس زمانے میں
ایک بھی صاحبِ سرور نہیں

اک جنوں ہے کہ باشعور بھی ہے
اک جنوں ہے کہ باشعور نہیں

ناصبوری ہے زندگی دل کی
آہ ! وہ دل کہ ناصبور نہیں

بے حضوری ہے تیری موت کا راز
زندہ ہو تُو تو بے حضور نہیں

(۴)

نہ تُو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے
جہاں ہے تیرے لیے تُو نہیں جہاں کے لیے

مقامِ پرورشِ آہ و نالہ ہے یہ چمن
نہ سیرِ گل کے لیے ہے نہ آشیاں کے لیے

رہے گا راوی و نیل و فرات میں کب تک !
ترا سفینہ کہ ہے بحرِ بیکراں کے لیے

نگہ بلند ، سخن دلنواز ، جاں پُر سوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے

ذرا سی بات تھی اندیشۂ عجم نے اسے
بڑھا دیا ہے فقط زیبِ داستاں کے لیے

سوالات

۱۔ پہلی غزل کے پہلے شعر میں لالہ کو 'چراغ' سے، دوسرے شعر میں صحرا کے پھولوں کو "قطار اندر قطار پریوں" سے اور تیسرے شعر میں شبنم کو 'موتی' سے تشبیہ دی گئی ہے۔ ان تشبیہات میں وجہِ شبہ کی نشاندہی کیجیے۔

۲۔ مَن کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں
تن کی دولت چھاؤں ہے، آتا ہے دھن، جاتا ہے دھن

اس شعر میں 'مَن کی دولت' اور 'تن کی دولت' کا مفہوم واضح کیجیے۔

۳۔ پہلی غزل کے آخری شعر میں علّامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے کس حکمت کو بیان کیا ہے؟

۴۔ دوسری غزل کے تمام اشعار کی تشریح بیان کیجیے۔

۵۔ دلِ بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور، دل کا نور نہیں

اس شعر کی روشنی میں 'آنکھ کے نور' اور 'دل کے نور' کے فرق کو واضح کیجیے۔

۶۔ مقامِ پرورشِ آہ و نالہ ہے یہ چمن
نہ سیرِ گُل کے لیے ہے نہ آشیاں کے لیے

اس شعر میں "چمن" کس کے لیے استعارہ ہے۔ ارکانِ استعارہ کی وضاحت کرتے ہوئے اس شعر کی تشریح کیجیے۔

۷۔ نگہ بلند ، سخن دلنواز ، جاں پُر سوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے میرِ کارواں کے لیے کن صفات کو لازم قرار دیا ہے ؟ وضاحت سے بیان کیجیے

۸۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی غزلیات میں آنے والی مندرجہ ذیل تراکیب کی تشریح کیجیے:

چراغِ لالہ ، حسنِ بے پروا ، سراغِ زندگی ، حقیقتِ منتظر ، لباسِ مجاز ، جبینِ نیاز ، طرب آشنائے خروش ، محرم گوش ، سکوتِ پردۂ ساز ، نگاہِ آئینہ ساز ، حکایتِ سوز ، حدیثِ گداز ، جرمِ خانہ خراب ، عفوِ بندہ نواز ، دلِ بینا ، صاحب سرور ، راوی و نیل و فرات ، بحرِ بیکراں ، اندیشۂ عجم ، زیبِ داستاں۔

○☆○☆○☆○☆○☆○

حسرت موہانی

(۱۸۷۵ء - ۱۹۵۱ء)
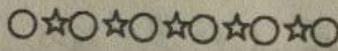
(۱)

تجھ کو پاسِ وفا ذرا نہ ہوا
ہم سے پھر بھی ترا گلہ نہ ہُوا

ایسے بگڑے کہ پھر جفا بھی نہ کی
دشمنی کا بھی حق ادا نہ ہُوا

جانِ عاشق نثارِ دوست ہوئی
شادیٔ مرگ کا بہانہ ہُوا

کچھ عجب چیز ہے وہ چشمِ سیاہ
تیر جس کا کبھی خطا نہ ہُوا

حیف ہے اس کی بادشاہی پر
تیرے کوچے کا جو گدا نہ ہُوا

قانعِ رنجِ عشق تھا حسرتؔ
عیشِ دنیا سے آشنا نہ ہُوا

(۲)

روشن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام
دہکا ہُوا ہے آتشِ گُل سے چمن تمام

حیرت غرورِ حُسن سے، شوخی سے اِضطراب
دل نے بھی تیرے سیکھ لیے ہیں چلَن تمام

دیکھو تو چشمِ یار کی جادو نگاہیاں
بے ہوش اِک نظر میں ہوئی انجمن تمام

اچھا ہے اہلِ جوَر کیے جائیں سختیاں
پھیلے گی یوں ہی شورشِ حُبِّ وطن تمام

شیرینیِ نسیمؔ ہے سوز و گدازِ میرؔ
حسرتؔ ترے سخن پہ ہے لطفِ سخن تمام

(۳)

نگاہِ یار جسے آشنائے راز کرے
وہ اپنی خوبیٔ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

دلوں کو فکرِ دو عالم سے کر دیا آزاد
ترے فسوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

خرد کا نام جنوں پڑ گیا، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

غمِ جہاں سے جسے ہو فراغ کی خواہش
وہ اُن کے دردِ محبت سے ساز باز کرے

ترے کرم کا سزا وار تو نہیں حسرتؔ
اب آگے تیری خوشی ہے جو سرفراز کرے

سوالات

۱۔ کیف ہے اس کی بادشاہی پر
تیرے کوچے کا جو گدا نہ ہوا

اس شعر میں کس ہستی کی طرف اشارہ ہے ؟

۲۔ اچھا ہے اہلِ جور کیے جائیں سختیاں
پھیلے گی یوں ہی شورشِ حُبِّ وطن تمام

تحریکِ آزادی کے حوالے سے اس شعر کی تشریح کیجیے۔

۳۔ تیسری غزل کے پہلے تین اشعار کی تشریح کیجیے۔

۴۔ شیرینیِ نسیم ہے ' سوز و گدازِ میرؔ
حسرتؔ ترے سخن پہ ہے لطفِ سخن تمام

اس مقطع میں حسرت نے کن دو بزرگ شعرا سے اپنی ارادت کا اظہار کیا ہے اور ان سے کیا کیا فیض حاصل کیا ہے ؟

۵۔ مندرجہ ذیل تراکیب کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے :

پاسِ وفا ' نثارِ دوست ' شادیٔ مرگ ' آتشِ گل ' اہلِ جور ' لطفِ سخن ' آشنائے راز ' خوبیٔ قسمت ' فکرِ دو عالم ' حسنِ کرشمہ ساز ' غمِ جہاں۔

○☆○☆○☆○☆○☆○

حفیظ جالندھری

(۱۹۰۰ء۔ ۱۹۸۲ء)
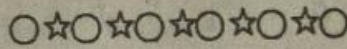
(۱)

حقیقتیں آشکار کر دے صداقتیں بے حجاب کر دے
ہر ایک ذرّہ یہ کہہ رہا ہے کہ آ مجھے آفتاب کر دے

یہ خوب کیا ہے، یہ زِشت کیا ہے! جہاں کی اصلی سرشت کیا ہے!
بڑا مزہ ہو تمام چہرے اگر کوئی بے نقاب کر دے

کہو تو رازِ حیات کہہ دوں، حقیقتِ کائنات کہہ دوں
وہ بات کہہ دوں کہ پتھروں کے جگر کو بھی آب آب کر دے

خلافِ تقدیر کر رہا ہوں، پھر ایک تقصیر کر رہا ہوں
پھر ایک تدبیر کر رہا ہوں، خدا اگر کامیاب کر دے

ترے کرم کے معاملے کو ترے کرم ہی پہ چھوڑتا ہوں
مری خطائیں شمار کر لے مری سزا کا حساب کر دے

(۲)

جس کو مجھ میں بھی کوئی بات نظر آتی ہے
اے خدا ایک تری ذات نظر آتی ہے

نظر آتی ہی نہیں صورتِ حالات کوئی
اب یہی صورتِ حالات نظر آتی ہے

یہ عجب مرحلۂ عمر ہے یارب رکہ مجھے
ہر بُری بات بُری بات نظر آتی ہے

چلتے پھرتے ہوئے مُردوں سے ملاقاتیں ہیں
زندگی کشف و کرامات نظر آتی ہے

جلوۂ صبح کا اندھوں میں تو ہے جوش و خروش
آنکھ والوں کو وہی رات نظر آتی ہے

زندگی میں تو کوئی چیز انوکھی نہ رہی
موت ہی اب تو نئی بات نظر آتی ہے

تیرے اترے ہوئے چہرے پہ بھی یاروں کو حفیظؔ
سرخیٔ حرف و حکایات نظر آتی ہے

(۳)

اب تو کچھ اور بھی اندھیرا ہے
یہ مری رات کا سویرا ہے

راہزنوں سے تو بھاگ نکلا تھا
اب مجھے رہبروں نے گھیرا ہے

قافلہ کس کی پیروی میں چلے
کون سب سے بڑا لٹیرا ہے

سر پہ راہی کے سربراہی نے
کیا صفائی کا ہاتھ پھیرا ہے

اے مری جان اپنے جی کے سوا
کون تیرا ہے، کون میرا ہے!

سوالات

۱۔ پہلی غزل کے دوسرے، تیسرے اور پانچویں شعر کی تشریح کیجیے۔

۲۔ دوسری غزل کے پہلے تین اشعار کی تشریح کیجیے۔

۳۔ مندرجہ ذیل الفاظ و تراکیب کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

آشکار، زشت، سرشت، بے نقاب، رازِ حیات، حقیقتِ کائنات، خلافِ تقدیر، تقصیر، صورتِ حالات، مرحلۂ عمر، کشف و کرامات، حرف و حکایات۔

○☆○☆○☆○☆○☆○

فیض احمد فیض

(۱۹۱۰ء - ۱۹۸۱ء)
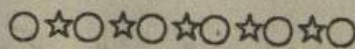
(۱)

وہ بتوں نے ڈالے ہیں وسوسے کہ دلوں سے خوفِ خدا گیا
وہ پڑی ہیں روز قیامتیں کہ خیالِ روزِ جزا گیا

جو نفس تھا خارِ گلو بنا، جو اٹھے تو ہاتھ لہو ہوئے
وہ نشاطِ آہِ سحر گئی، وہ وقارِ دستِ دعا گیا

نہ وہ رنگ فصلِ بہار کا، نہ روش وہ ابرِ بہار کی
جس ادا سے یار تھا آشنا، وہ مزاجِ بادِ صبا گیا

جو طلب پہ عہدِ وفا کیا، تو وہ آبروئے وفا گئی
سرِ عام جب ہوئے مدعی تو ثوابِ صدق و صفا گیا

ابھی بادبان کو تہ رکھو ابھی مضطرب ہے رُخِ ہوا
کسی راستے میں ہے منتظر وہ سکوں جو آ کے چلا گیا

(۲)

مشکل ہیں اگر حالات وہاں، دل بیچ آئیں جاں دے آئیں
دل والو کوچۂ جاناں میں کیا ایسے بھی حالات نہیں

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا، وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے، اس جاں کی تو کوئی بات نہیں

میدانِ وفا دربار نہیں، یاں نام و نَسَبْ کی پوچھ کہاں
عاشق تو کسی کا نام نہیں، کچھ عشق کسی کی ذات نہیں

گر بازی عشق کی بازی ہے جو چاہو لگا دو ڈر کیسا
گر جیت گئے تو کیا کہنا، ہارے بھی تو بازی مات نہیں

سوالات

۱۔ پہلی غزل کے تیسرے، چوتھے اور پانچویں شعر کی تشریح کیجیے۔
۲۔ فیضؔ کی دوسری غزل کے صرف چار شعر شاملِ نصاب ہیں، ان میں سے پہلے تین اشعار کی تشریح کیجیے۔
۳۔ مندرجہ ذیل تراکیب کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے:
خوفِ خدا، خارِ گلو، فصلِ بہار، ابرِ بہار، عہدِ وفا، آبروئے وفا، رُخِ ہوا، کوچۂ جاناں، میدانِ وفا، نام و نسب۔
۴۔ مندرجہ ذیل مرکبات کا مفہوم واضح کیجیے:
خیالِ روزِ جزا، نشاطِ آہِ سحر، وقارِ دستِ دعا، مزاجِ بادِ صبا، ثوابِ صدق و صفا۔

○☆○☆○☆○☆○☆○

ناصر کاظمی

(۱۹۲۵ء - ۱۹۷۲ء)

(۱)

کسی کلی نے بھی دیکھا نہ آنکھ بھر کے مجھے
گذر گئی جرسِ گُل اداس کر کے مجھے

میں سو رہا تھا کسی یاد کے شبستاں میں
جگا کے چھوڑ گئے قافلے سحر کے مجھے

میں رو رہا تھا مقدّر کی سخت راہوں میں
اڑا کے لے گئے جادو تیری نظر کے مجھے

میں تیرے درد کی طغیانیوں میں ڈوب گیا
پکارتے رہے تارے ابھر ابھر کے مجھے

ترے فراق کی راتیں کبھی نہ بھولیں گی
مزے ملے انہیں راتوں میں عمر بھر کے مجھے

ذرا سی دیر ٹھہرنے دے اے غمِ دنیا
بُلا رہا ہے کوئی بام سے اتر کے مجھے

پھر آج آئی تھی اک موجۂ ہوائے طرَب
سنا گئی ہے فسانے اِدھر اُدھر کے مجھے

(۲)

یہ شب یہ خیال و خواب تیرے
کیا پھول کھلے ہیں منہ اندھیرے

شعلے میں ہے ایک رنگ تیرا
باقی ہیں تمام رنگ میرے

آنکھوں میں چھپائے پھر رہا ہوں
یادوں کے بجھے ہوئے سویرے

دیتے ہیں سراغ فصلِ گُل کا
شاخوں پہ جلے ہوئے بسیرے

منزل نہ ملی تو قافلوں نے
رستے میں جما لیے ہیں ڈیرے

جنگل میں ہوئی ہے شام ہم کو
بستی سے چلے تھے منہ اندھیرے

رُوداد سفر نہ چھیڑ ناصرؔ
پھر اشک نہ تھم سکیں گے میرے

(۳)

وہ ساحلوں پہ گانے والے کیا ہوئے
وہ کشتیاں چلانے والے کیا ہوئے

وہ صبح آتے آتے رہ گئی کہاں

جو قافلے تھے آنے والے، کیا ہوئے

میں ان کی راہ دیکھتا ہوں رات بھر

وہ روشنی دکھانے والے کیا ہوئے

یہ کون لوگ ہیں مرے اِدھر اُدھر

وہ دوستی نبھانے والے کیا ہوئے

عمارتیں تو جل کے راکھ ہو گئیں

عمارتیں بنانے والے کیا ہوئے

یہ آپ ہم تو بوجھ ہیں زمین کا

زمیں کا بوجھ اٹھانے والے کیا ہوئے

سوالات

۱۔ پہلی غزل کے چوتھے، چھٹے اور ساتویں شعر کی تشریح کیجیے۔

۲۔ دوسری غزل کے پہلے تین اشعار کی تشریح کیجیے۔

۳۔ ناصر کاظمی کی تیسری غزل کو مشرقی پاکستان کے المیے کے پس منظر میں دیکھیے اور پہلے، چوتھے، پانچویں اور چھٹے شعر کی تشریح کیجیے۔

۴۔ مندرجہ ذیل تراکیب کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے:
جرسِ گُل، یاد کا شبستاں، قافلے سحر کے، غم دنیا، موجۂ ہوائے طرب، خیال و خواب، منہ اندھیرے، فصلِ گُل، رُودادِ سفر۔

○☆○☆○☆○☆○☆○

لوازمہ نصاب اور نمبروں کی تقسیم کے پیمانے کے مطابق پرچہ (الف) کا خاکہ حسب ذیل ہو گا

پرچہ "الف"

(۱) نثر

الف)	تشریح مطالب	۳۰ نمبر	
ب)	سبق کی تلخیص	۲۰ نمبر	۶۵
ج)	مطالب اسباق پر سوالات	۱۵ نمبر	

(۲) نظم

الف)	نظم کا مرکزی خیال / تلخیص	۱۰ نمبر	
ب)	تشریح مطالب، نظم	۱۵ نمبر	۳۵
ج)	تشریح مطالب، غزل	۱۰ نمبر	
		کل ۱۰۰ نمبر	

لوازمہ نصاب اور نمبروں کی تقسیم کے پیمانے کے مطابق پرچہ (ب) کا خاکہ حسب ذیل ہو گا:

پرچہ "ب"

(۱)	مضمون	۲۰ نمبر
(۲)	خط / آپ بیتی	۱۰ نمبر
(۳)	تلخیص	۱۵ نمبر
(۴)	روداد نویسی / مکالمہ نویسی	۱۰ نمبر
(۵)	درخواست / رسید	۱۰ نمبر
(۶)	قواعد	۳۵ نمبر
		۱۰۰ نمبر

جملہ حقوق بحق بلوچستان ٹیکسٹ بک بورڈ کوئٹہ محفوظ ہیں تیار کردہ پنجاب
ٹیکسٹ بک بورڈ لاہور منظور کردہ بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن
کوئٹہ بلوچستان بطور واحد نصابی کتاب برائے کالجز صوبہ بلوچستان
بمطابق نوٹیفیکیشن نمبر 2-7 / 95-E-A[illegible] مورخہ 24th July, 1996
قومی کمیٹی برائے جائزہ کتب وفاقی وزارت تعلیم حکومت پاکستان کی منظور کردہ۔

قومی ترانہ

پاک سرزمین شاد باد کشورِ حسین شاد باد
تو نشانِ عزمِ عالی شان ارضِ پاکستان
مرکزِ یقین شاد باد

پاک سرزمین کا نظام قوّتِ اخوّتِ عوام
قوم، ملک، سلطنت پائندہ تابندہ باد
شاد باد منزلِ مراد

پرچمِ ستارہ و ہلال رہبرِ ترقّی و کمال
ترجمانِ ماضی شانِ حال جانِ استقبال
سایۂ خدائے ذوالجلال

302

کوڈ نمبر U-XI-XII / 226 سیریل نمبر

قیمت	تعداد	ایڈیشن	سال اشاعت
34.00	7000	I	2005